سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۵۴

تذکرہ ہندی

تالیف

غلام ہمدانی مصحفی

مرتبہ

مولوی عبدالحق صاحب بی، اے (علیگ) معتمد اعزازی
انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

جامع برقی پریس دہلی

طبع اول

عنوان

قواعد وضوابط انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

۱۔ سرپرست وہ ہوں گے جو پانچہزار روپے یکمشت یا پانچ سو روپے سالانہ انجمن کو عطا فرمائیں۔ (ان کو تمام مطبوعات انجمن بلاقیمت اعلیٰ قسم کی جلد کے ساتھ پیش کیجائیں گی۔)

۲۔ معاون وہ ہوں گے جو ایکہزار روپے یکمشت یا سالانہ سو روپے عطا فرمائیں گے۔ (انجمن کی تمام مطبوعات ان کو بلاقیمت دیجائیں گی۔)

۳۔ رکن مدامی وہ ہوں گے جو اڑھائی سو روپے یکمشت عطا فرمائیں گے (ان کو تمام مطبوعات انجمن مجلد نصف قیمت پر دیجائیں گی۔)

۴۔ رکن معمولی انجمن کی مطبوعات کے مستقل خریدار ہوں گے جو اس بات کی اجازت دیں گے کہ انجمن کی مطبوعات طبع ہوتے ہی بغیر دریافت کئے بذریعہ قیمت طلب پارسل ان کی خدمت میں بھیجدی جائیں (ان صاحبوں کو تمام مطبوعات پچیس فی صدی قیمت کم کرکے دیجائیں گی) مطبوعات میں انجمن کے رسالے بھی شامل ہیں۔

۵۔ انجمن کی شاخیں (کتب خانے) وہ ہیں جو انجمن کو یکمشت سوا سو روپے یا بارہ روپے سالانہ دیں۔ (انجمن ان کو اپنی مطبوعات نصف قیمت پر دے گی)

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے ان مہربان معاونین کی ایک فہرست مرتب کررہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو وہ بغیر ان سے دریافت کئے تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی۔ پی روانہ کردیجایا کرے۔ یہ اصحاب انجمن کے رکن ہوں گے ان کے اسمائے گرامی فہرست میں درج کئے جائیں گے اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہوگی فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کردیجایا کرے گی۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں اس اعانت کے دینے سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کرکے روانہ ہوں گی۔

المشتہر۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

فہرست

مقدمہ

اُردو شاعری کا ستارہ اُس وقت چمکا جب کہ سلطنت مغلیہ کا آفتابِ اقبال گہنا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعری ایک پیشہ ہوگئی اور اُس عہد کے باکمال سخنور اپنے متاعِ ہنر کو در بدر لئے پھرتے تھے کہ شاید کوئی قدردان مل جائے۔ مصحفی ان سب میں زیادہ بدنصیب تھا۔

نام غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابن درویش محمد، مصحفی تخلص[1]، وطن امروہہ اور مولد اکبرپور[2]۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے تذکرے میں سنہ پیدائش ۱۱۶۴ھ لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مصحفی اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں اپنے حالات کے آخر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر ۸۰ برس کی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۳۶ھ میں اختتام کو پہنچا۔ اس حساب سے اُن کی پیدائش ۱۱۴۱ھ اور ۱۱۵۶ھ کے درمیان واقع ہوتی ہے۔

ابتدائی تعلیم مکتب میں امروہہ ہی میں ہوئی اس کا اشارہ انھوں نے سید محمد زمان زمان تخلص ساکن امروہہ کے حال میں کیا ہے[3]۔ اسی ضمن میں اپنے استاد کا بھی ذکر کر گئے ہیں لیکن نام نہیں لکھا۔ اصل تعلیم دلی میں ہوئی۔ چنانچہ ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں کہ فارسی اور اُس کی نظم و نثر کی تکمیل تیس سال کی عمر میں شاہجہاں آباد میں ہوئی۔ جن دنوں میں جلاوطن ہو کر اس دیار میں تازہ تازہ پہنچا تو علمِ عربی یعنی طبیعیات، الٰہیات اور ریاضی مولوی مستقیم ساکن گوپامئو شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلماء سے حاصل کی اور رشیدیہ اور صدرا پڑھا۔ قانونچہ کا درس مولوی منظہر علی سے لیا جو صرف و نحو میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آخر عمر میں عربی ادب اور تفاسیر

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۷۔

(۲) تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۹۰۔

(۳) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۱۰۔ نیز دیکھو صفحہ ۲۲۷ حال محزوں و صفحہ ۱۳۸۔ حال شہید۔ (تذکرہ ہندی گویان)

قرآن مجید کا مطالعہ کیا۔ لکھتے ہیں کہ عربی سے نابلد ہونے کا جو نقص تھا وہ میں نے اس شہر میں پہنچ کر رفع کر دیا۔ دوسرا نقص علمِ عروض و قافیہ کی ناواقفیت تھی۔ اس کی تلافی بھی میں نے چند روز میں اساتذہ کی تصانیف کا مطالعہ کرکے کرلی اور خود اس فن میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "خلاصۃ العروض" تھا۔

مصحفی نے اپنے استاد کا کہیں نام نہیں بتایا اور نہ کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ کسی اور تذکرے میں بھی اُس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ البتہ صاحب "سراپا سخن" نے اُن کے اُستاد کا نام امانی لکھا ہے[1]۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ کون تھے، کہاں کے رہنے والے تھے اور کس قماش کے شخص تھے۔

اس پر سب تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ ابتدائے شباب ہی میں وہ دلی چلے آئے تھے اور وہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی اور وہیں اُن کی شعر و شاعری چمکی۔ دلی سے انھیں خاص محبت تھی، اس کا ذکر اپنے تذکرہ میں جگہ جگہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ وہاں کے شاعروں، ملاقاتیوں اور یارانِ عزیز کا ذکرِ خیر آپ اس تذکرے میں جابجا پائیں گے۔

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفیؔ میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

یہ وہ زمانہ تھا کہ گئی گذری حالت پر بھی دلی کا ہونا یا دلی سے منسوب ہونا یا وہاں کی بود و باش، تہذیب و شائستگی اور زباندانی کا تمغہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی بنا پر تو انھوں نے اپنے بعض حریفوں پر چوٹ کی ہے۔

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں دلی نہیں دیکھی ہے زباندان یہ کہاں ہیں

مصحفی نے اپنے بزرگوں کا پیشہ "نوکریِ خانۂ بادشاہ" لکھا ہے۔ لیکن جب سلطنت کے کاروبار میں خلل واقع ہوا تو ان کا روزگار بھی درہم برہم ہو گیا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ان کی بسر اوقات تجارت[2] پر تھی۔ مصحفی نے اپنے حال میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لیکن

---

(۱) ص ۵۴۔
(۲) تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۹۰۔ سپرنگر نے بھی بحوالہ عشقی اس کی تائید کی ہے۔

دلی کے قیام کے ذکر میں جو چند جملے ضمناً اُن کی قلم سے نکل گئے ہیں اس سے یہ قیاس ہوتا ہو کہ میر حسن کا یہ خیال صحیح ہے کہ اُس زمانے میں اُن کی گزران تجارت ہی پر تھی۔ لکھتے ہیں :-

"میں شاہجہاں آباد میں بارہ سال تک دورِ نواب نجف خاں مرحوم میں گوشۂ عزلت میں رہا . . . . اور اس افراتفری کے زمانے میں تلاشِ معاش کے لئے کسی کے دروازے پر نہیں گیا"[1]

اس سے قیاس ہوتا ہو کہ دلی میں وہ اپنی معاش اپنے دست و بازو سے کماتے تھے اور کسی کے دست نگر نہ تھے۔

اگرچہ بقول خود وہ دہلی میں بارہ سال تک عزلت گزیں رہے لیکن اس پر بھی مشاعروں کی شرکت، شعر و شاعری کا چرچا برابر جاری رہا اور خود بھی اپنے ہاں مشاعرے ترتیب دیتے رہے[2] اور اُس وقت بھی اُن کی شاعری اس درجے کی سمجھی جاتی تھی کہ لوگ اُن کے شعر سننے کے لئے اُن کے مکان پر حاضر ہوتے تھے[3]۔

دلی کا رنگ بدلا ہوا تھا، حالات ناساعد تھے، بسراوقات کے ذرائع تنگ ہو رہے تھے، ناچار اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح دل پر پتھر رکھ کر دلی کو خیرباد کہا اور وادیٔ غربت میں قدم رکھا۔ دلی کی حالت اُس وقت کیسی ہی ہو، اُس کا چھوڑنا کچھ آسان نہ تھا۔ وطن تو خیر سب ہی کو عزیز ہوتا ہے مگر اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ باہر سے بھی جو لوگ وہاں آگئے تھے انھیں وہ وطن سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ پیٹ بڑا ظالم ہو اُس کی خاطر یہ مفارقت بھی گوارا کرنی پڑی۔ لیکن مرتے دم تک اس کا داغ دل سے نہ مٹا اور جب تک رہے اور جہاں رہے اُس کی صحبتوں اور خوبیوں پر مٹے رہے۔ اس

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۷

(۲) تذکرہ ہندی گویان، حال اسد صفحہ ۱۶، امین صفحہ ۲۰، فراق صفحہ ۱۵۷، مشتاق صفحہ ۲۱۰، محشر صفحہ ۲۴۴، نالاں صفحہ ۲۶۱، نصیر صفحہ ۲۶۱، ہاتف صفحہ ۲۷۰، نیز دیکھو عمدہ منتخبہ و مجموعہ نغز۔

(۳) دیکھو تذکرہ ہندی گویان ذکر عاقل صفحہ ۱۵۱

مقام پر ایک بات غور و تامل کے قابل ہے۔ یہ لوگ جہاں جہاں گئے (مثلاً فرخ آباد، عظیم آباد اور خاص کر لکھنؤ) وہاں والوں نے انھیں سرآنکھوں پر بٹھایا، عزت و حرمت سے پیش آئے، آسائش پہنچائی، مسافر نہیں مہمانِ عزیز سمجھا اور وہ خدمت کی کہ غربت کی کلفت دلوں سے محو ہوگئی۔ آج کل سا حال نہ تھا کہ کوئی بھولا بھٹکا باکمال آگیا تو سمجھے کہ غنیم چڑھ آیا۔

مصحفی دلی سے آنولہ اور ٹانڈہ پہنچے۔

جب میکدہ چھٹا تو رہی کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں امیر خلف نواب علی محمد خاں، صاحبِ ذوق اور قدر شناس امیر تھے، شاعروں کا اُن کے ہاں اچھا خاصا جمگھٹا تھا۔ قدوی لاہوری، میر محمد نعیم نعیم، پروانہ علی شاہ، پروانہ، میاں عشرت، حکیم کبیر، محمد قائم وغیرہ مجلس شعر و سخن کے رونق افروز تھے۔ میاں مصحفی بھی شریکِ صحبت ہوگئے۔ نواب نے میر سوز اور مرزا محمد رفیع سودا کو بھی خط لکھ کر بھیجا اور اپنے ہاں بلایا، وہ اُس زمانے میں مہربان خاں رند کی سرکار میں ملازم تھے، فرخ آباد کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ لیکن یہ مجلس زیادہ مدت جمنے نہ پائی۔ سکرتال کی لڑائی (۱۱۸۵ھ) میں نواب ضابطہ خاں کو شاہ عالم نے مرہٹوں کی امداد سے ایسی شکست دی کہ ٹانڈے کی امارت درہم برہم ہوگئی۔ بیچارے فلک زدہ شاعروں کا وہاں کوئی ٹھکانا نہ رہا اور منتشر ہوگئے۔

مصحفی ٹانڈے سے ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ لکھنؤ پہنچے۔ یہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ سودا وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اُن سے اور بعض مشہور شعرا سے ملاقات ہوئی۔ ابھی سال بھر ہی رہنے پائے تھے کہ طبیعت اچاٹ ہوئی اور پھر دلی کا رُخ کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی سرپرست اور قدر دان نہ ملا اور روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی لیکن دلی میں کیا رکھا تھا، حالت پہلے سے بھی بدتر تھی۔ آخر تھوڑے دنوں کے بعد ہی دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ پہنچ کر چند روز صبا (لالہ کانجی مل، کایستھ سکینہ) کے ہاں قیام[1] رہا۔ اس کے بعد

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۴۱۔

چندے میر محمد نعیم خاں کی رفاقت میں رہے[1]۔ پھر مرزا زین العابدین عرف مرزا مینڈو سر سبز تخلص (ذو الفقار نواب سالار جنگ) نے جو اردو شاعری کے بڑے دلدادہ تھے بہ سلسلۂ شاعری اپنی رفاقت و مصاحبت میں لے لیا۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ بڑی عزت سے پیش آتے تھے اور شعر و سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ چار سال تک یعنی ۱۲۰۵ھ تک انھیں کے پاس رہے[2]۔

دلی کے شاہزادے، شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ اُس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی اور سارا ٹھاٹ وہی قائم کر رکھا تھا۔ دلی سے جو جاتا پہلے اُن کی سرکار میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈھتا۔ شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور شعرا اور اہل کمال کے قدردان تھے۔ انشا، جرأت، سوز، مصحفی وغیرہ انھیں کے دربار میں ملازم تھے یا انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ بارہ سو سات آٹھ ہجری میں مصحفی بھی میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار میں داخل ہوئے[3]۔

ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور ساز و باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے۔ ہر منہ چڑھا مصاحب دوسرے کے اکھاڑنے اور اپنے جمانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس میں وہ عیاریاں اور افترا پردازیاں، حرفتیں اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشا، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے۔ اول اول شاعرانہ چشمک رہی، بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشا نے وہ وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ سید انشا، بذلہ ظریف، ٹھٹھول اور بےچین طبیعت کے تھے اور اس پر ذہانت اور غضب تھی۔ مصحفی پختہ اور پرانے استاد تھے، ساتھ شاگردوں کا لشکر تھا۔ انشا کی زیادتیاں گوارا نہ ہوئیں، ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک دل لگی

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۵۔ (۲) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۱۸

(۳) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۲۱۔ آزاد نے جو یہ لکھا ہے کہ مصحفی پہلے سے دربار میں تھے اور انشا بعد میں آئے صحیح نہیں۔

ہاتھ آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے۔ اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی۔ صاحب عالم کی نظریں ان کی طرف سے پھر گئیں، تنخواہ میں بھی تخفیف ہوئی اور آخر میں قطع تعلق کر کے خانہ نشین ہوگئے۔ اپنی تنخواہ کا ذکر کس حسرت سے کیا ہے:۔

تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق — چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق
ہم بھی کبھی روزوں میں تھے پچیس کے لائق — لے وائے کہ پچیس سو اب پانچ ہیں اپنے
ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق — استاد کا کرتے ہیں امیر اب سے مقرر

مصحفی طبیعت کے بہت نیک اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ اُن کے ہمعصر تذکرہ نویسوں نے اُن کے مزاج اور اخلاق کی بہت تعریف کی ہے اور انھیں خلیق، متواضع، مسکین وضع، مسکین نہاد اور نیک سیرت لکھا ہے(۱)۔ وہ کبھی درباری شاعروں سے نہ الجھتے۔ لیکن جب دوسری طرف سے چھیڑ شروع ہوئی تو اُس کے جواب میں خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ کچھ تو شاعری کا گھمنڈ کچھ درباری حالات اور اس پر شاگردوں کی شہ نے معاملہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

یہ حالات اُس زمانے کی معاشرت پر دھندلی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

مصحفی کی زندگی پریشان حالی، تنگدستی اور عُسرت میں گزری۔ اگرچہ کئی امیروں کی رفاقت اور صحبت رہی اور شاگرد بھی اُن کے کثرت سے ہوئے جن میں بڑے بڑے لوگ بھی تھے مگر کبھی فراغ بالی اور معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہ ہوا۔ علی لطف صاحبِ گلشن ہند نے اُن کے احوال میں صحیح لکھا ہے "...... برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے۔ ضیق معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیب اہل کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اس غریب کا بھی احوال ہے۔" آخر میں یہ حال ہوگیا تھا کہ یا تو سعادتمند شاگرد اُن کی مدد کرتے تھے یا غزلیں بیچ بیچ کے اپنی بسر اوقات کرتے تھے۔ اس طرح کلام کا بہت سا حصہ دوسروں کی قسمت میں آگیا۔

---

(۱) دیکھو ذکر مصحفی تذکرہ قدرت اللہ شوق، تذکرہ قدرت اللہ قاسم اور عمدۂ منتخبہ میں۔

مصحفی نے عمر بھی بہت پائی، پُرانے اُستاد جنھوں نے اردو کی نبیادوں کو مضبوط کیا اور نئی پود جس نے آگے چل کر بڑا نام پایا، سب کو دیکھا، پرکھا اور اکثر اُن کے سامنے چل بسے۔ وفات کا صحیح سنہ معلوم نہ ہو سکا۔ تذکرہ ریاض الفصحا میں جس کا سنہ اختتام ۱۲۳۶ھ ہے لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر اسّی سال کی ہے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ آج کے دن مصحفی کو مرے دس سال ہوتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۲۵۰ھ میں لکھا گیا، اس حساب سے اُن کا سنہ وفات ۱۲۴۰ھ ہوا اور عمر چوراسّی سال کی۔

مصحفی کے استاد ہونے میں شبہ نہیں۔ بڑے مشاق اور ریختہ گو شاعر تھے۔ آٹھ دیوان، متعدد قصائد اور مثنویاں اُن کی تصنیف سے اب تک باقی ہیں۔ علاوہ اس ضخیم کلام کے شعرا کے تین تذکرے بھی اُن کی بڑی یادگار ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔

سب سے پہلا تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے جس کا نام عقد ثریا ہے۔ اس میں تین قسم کے شعرا کا ذکر ہے۔ اول شعرائے ایران جو ہندوستان میں کبھی نہیں آئے۔ دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے۔ تیسرے ہندوستانی فارسی گو شاعر۔ دوسرا تذکرہ اردو کہنے والے شاعروں کا ہے تیسرے تذکرے کا نام ریاض الفصحا ہے۔ اس تذکرے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں لکھنے سے رہ گئے تھے اُن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔

ان تینوں میں تذکرہ نمبر ۲ یعنی تذکرہ ہندی اصل ہے، باقی دو کو اُس کا تکملہ سمجھنا چاہیے یہ تذکرہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے۔ میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی فرمائش سے تحریر میں آیا اور عہد فردوس آرامگاہ (محمد شاہ بادشاہ) سے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے تک کے شعرا کا حال درج ہے۔ بعض متقدم شعرا کے حالات تیمناً لکھ دیئے گئے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں معاصرین ہی کا ذکر ہے[1]۔

مصحفی کا زمانہ معمولی نہیں تھا۔ یہ اردو زبان کی ترقی و فروغ کا نہایت ممتاز دور ہے۔

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۳، ۴

اگرچہ فارسی کا رواج عام تھا، مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی کی تعلیم برابر جاری تھی، فارسی کا پڑھنا علم وفضل ہی کے لئے نہیں بلکہ تہذیب وشائستگی کے لئے لازم خیال کیا جاتا تھا، لوگ فارسی شعروسخن کے ایسے ہی دلدادہ تھے جیسے اکبر وجہانگیر کے زمانے میں۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ یہی تذکرے جو اردو شعرا کے ہیں فارسی میں لکھے گئے۔ اس سے پہلے اور بعد بھی بہت سے تذکرے جو اردو شاعروں کے لکھے گئے فارسی میں ہیں۔ لیکن اردو زبان رفتہ رفتہ زور پکڑتی جاتی تھی اور مصحفی کے زمانے میں تو اُس نے یہ قوت حاصل کر لی تھی کہ ہمارے مستند شاعر فارسی کو چھوڑ کر اُردو کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ خود مصحفی جو فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی کے دو دیوان مرتب کر چکے تھے جن میں سے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں ہے، اپنے حال میں لکھتے ہیں "بمقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے آنکہ رواجِ شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا بہ پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ (بلکہ از و بہتر گردیدہ)[1]"۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور مستند شہادت نہیں ہوسکتی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس دور میں اُردو کے ایسے بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں جن کی بدولت اُردو نے وہ فروغ حاصل کیا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اُردو میں لطافت وشیرینی، قوت اور وسعت پیدا کی اور اُس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ اُن کی زبان اور کلام کا اثر اب تک باقی ہے اور باقی رہے گا۔

مصحفی کی حاتم سے لے کر نصیر دہلوی تک ذاتی ملاقات تھی۔ بعض اُن میں سے بزرگ تھے جیسے حاتم، خواجہ میر درد، میر، سودا، فغاں وغیرہ، بعض ہم عمر اور ہمعصر تھے مثلاً قائم، جراٰت، سوز، بقا، انشا، حسن، حسرت وغیرہ، بعض نومشق تھے اور نام پیدا کر رہے تھے جیسے آتش، ناسخ، نصیر، رنگین، ممنون، طپش، خلیق، افسوس وغیرہ وغیرہ۔ شاگرد بھی مصحفی کے اس کثرت

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۰۔ توسین کے الفاظ ایک نسخہ میں ہیں دوسرے میں نہیں۔

سے تھے کہ پرانے اساتذہ میں شاذ ہی کسی کے ہوں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

شاگردِ تازہ از پسِ شاگرد می رسد یعنی رجوعِ خلق بسویت ہماں کہ بُود

ان میں سے بعضوں نے بہت نام پایا مثلاً ضمیر، خلیق، رنگین، پروانہ، تنہا اور منتظر اور گرم دونوں اُن کے خاص اور عزیز شاگرد تھے۔ اکثر کا حال ان تذکروں میں موجود ہے۔ ان تذکروں میں اکثر شعرا ایسے ہیں جن سے مصحفی ذاتی طور پر واقف تھے یا اُن سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جن کو نہیں جانتے تھے اُن کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ میں نہیں جانتا۔

مصحفی نے اپنے تذکرے صاف اور سیدھی زبان میں لکھے ہیں تکلف اور تصنع اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیا۔ کہیں بے جا طول نہیں دیا، جو حالات جس کسی کے معلوم تھے مختصر طور پر صاف صاف لکھ دئے ہیں۔ انھیں حالات کے ضمن میں کہیں کہیں اُس زمانے کی شعر و شاعری اور اردو ادب کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً حاتم کے ذکر میں اُن کی زبانی ولی کے دیوان کا شاہجہاں آباد میں آنا، لوگوں میں اُس کا چرچا ہونا، بعض صاحبوں کا ایہام گوئی پر اردو شاعری کی بنیاد رکھنا چند سطروں میں خوبی سے بیان کیا ہے۔ اُسی کے ساتھ حاتم کی بزرگی، اُن کے دیوان زادے اور حکمت استادی کا تذکرہ بھی اچھے انداز میں خوب لکھا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں مشاعروں کی حالت، اپنے مشاعرے کا ذکر بعض نامور اور معاصر شعرا کی ملاقات کا حال جگہ جگہ لکھتے گئے ہیں۔ ایک جگہ مشاعروں کے متعلق لکھا ہے کہ تجربے میں آیا ہے کہ ایسی مجلسیں ایک سال سے زیادہ نہیں رہنے پاتیں، ضرور کوئی نہ کوئی تفرقہ اور خلل پیدا ہو جاتا ہے[1]۔

وہ اپنے تذکروں میں شعرا کے کلام کے متعلق رائے لکھتے ہیں لیکن اُس میں تنقیدی حیثیت بہت کم ہوتی ہے۔ تاہم بعض نامور شعرا کے متعلق اُن کی رائیں خاص وقعت

(۱) حال شیخ مغل خانی (تذکرہ ثانی)

رکھتی ہیں۔ مثلاً سودا کے تذکرے میں اگرچہ پورا ایک صفحہ بھی نہیں لکھا لیکن جو کچھ لکھا ہے اُس میں اُن کے کمال اور سیرت کی تصویر کھینچدی ہے۔ نکتہ چینوں کے اعتراضات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "غرض ہرچہ بود، در روانیٔ طبع نظیر خود نہ داشت" اور آخر میں کہتے ہیں "نقاشِ اولِ قصیدہ در زبان ریختہ اوست، حالا ہر کہ گوید پیرو و تتبعش خواہد بود"

مظہر جان جاناں کی نسبت فرماتے ہیں کہ "در دورِ ایہام گویان اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ اوست" آخر میں لکھتے ہیں "فی الحقیقت نقاش اولِ ریختہ بایں وتیرہ باعتقاد فقیر مرزا است، بعدہٗ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ"

سودا سے مقابلہ کرنے کے بعد جس کا رواج اُس وقت عام تھا اور جس کا اثر اب بھی باقی ہے۔ میر صاحب کی نسبت فرماتے ہیں "غرض ہرچہ ہست استادیٔ ریختہ بر و مسلم است . . . . . . ہمہ ریختہ گویان ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستثنیٰ می دانند و الحق چنیں است"

یقین کے کلام کے متعلق بھی قریب قریب وہی رائے ظاہر کی ہے جو مظہر جان جاناں کے حق میں لکھی ہے۔ آخر یقین ہیں تو مظہر ہی کے تربیت یافتہ۔ کہتے ہیں کہ "در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود، بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ"

مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے میر حسن کی مثنوی کی سچی تعریف کی ہے "و مثنویِ آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ۔ الحق کہ کار کار اوست۔ قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ"

ہمعصروں کے کلام کے متعلق صحیح رائے کا ظاہر کرنا آسان نہیں، اور خاص کر ایسے لوگوں کے متعلق جن سے آویزش اور کشمکش رہی ہو۔ انشاء اللہ خاں اور اُن میں کیا کچھ نہیں گذری تھی اور ان بزرگوں نے کون سی بات تھی جو اٹھا رکھی تھی، اس پر بھی جب وہ انشا کا حال لکھنے بیٹھے تو سچی تعریف اور بے لاگ رائے ظاہر کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن کی سہ زبانی اور خاص کر

فارسی دانی کی تعریف کی ہے۔ انشا نے مثنوی شیر برنج مولانا بہاء الدین آملی کی مثنوی نان وحلوا کے جواب میں لکھی اُس کی نسبت لکھتے ہیں "بسیار بصفا گفتہ داد فصاحتِ زبان فارسی در وداده"۔ اُن کے اُردو کلام کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہے "اگرچہ ہمہ کلامش در عالم ظرافت، خالی از کیفیتے نیست اما انچہ از اشعار سادہ اش انتخاب فقیر افتادہ اینست" اُن کے کلام کا انتخاب بھی بہت اچھا کیا ہے۔ انتقال کے بعد بھی انھیں یاد کیا ہے ؎

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں | یاد ہے مرگِ قتیل و مردنِ انشا مجھے

بقا سے مصحفی کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اُس کے خلق وظرافت اور قناعت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کلام کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ "در قصیدہ ید طولیٰ دارد . . . . اما در گفتنِ غزل بطی است"۔

آتش اُن کے شاگرد تھے، اُن کے متعلق کیا خوب صحیح رائے دی ہے "اگر عمرش وفا کردہ وچندیں سال بر ہمیں وتیرہ رفت وفکر تیننش را مانعے در پیش نیاید یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد"۔

رنگین بھی اُن کے شاگرد تھے کیا خوب کہا ہے کہ "ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد اما ذکاوتِ طبعش بر صاحبِ علمان غالب"۔ رنگین نے اپنا دیوان اصلاح کے لئے پیش کیا شروع سے آخر تک دیکھ کر فرمایا "کلامش لبسیار کم اصلاح بر آمدہ"۔ اصل رائے یہ ہے "چوں مزاجش عشق باز افتادہ، اکثر قطعہائے خوب خوب وغزل ونامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشید"۔

ناسخ کی نسبت ایک جگہ فرماتے ہیں "تلاش ہائے معانی تازہ می کند"۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "بہ معنی بندیِ تازہ علمِ استادی برافراشتہ"۔ لیکن مصحفی اس قسم کی شاعری کو جس میں معنی بندی اور "اشعار خیالی" زیادہ ہوتے ہیں پسند نہیں کرتے تھے۔[1]

(۱) دیکھو ذکر واجد تذکرہ ثانی۔

مصحفی کے تذکروں میں بیسیوں ہندو شاعروں کا حال درج ہے۔ ان کا ذکر بھی اسی گرم جوشی اور خوبی سے کرتے ہیں جیسا دوسروں کا۔ اس سے اُس زمانے کی تہذیب اور آپس کی یکجہتی کا اندازہ ہوتا ہے۔

تذکرے میں اکثر نامور شعرا کی تاریخ وفات کے قطعے لکھے ہیں۔ اس فن میں انھیں خاص دخل تھا۔

میر سوز کے ابتدائی تخلص "میر" کی شہادت بھی اس تذکرے سے ملتی ہے۔

سعادت امروہوی کا حال بھی لکھا ہے لیکن میر صاحب کے تعلق تلمذ واستادی کا ذکر نہیں کیا۔

مصحفی نے اپنے تذکروں میں ضمناً صرف تین تذکروں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک تذکرہ میر حسن[1] دوسرے تذکرہ گردیزی[2] تیسرے تذکرہ قدرت اللہ شوق۔

ایک بات اور قابل لحاظ ان تذکروں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک تحقیق ہوا ہے اُردو شعرا میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے "اردو" کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان تذکروں میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے۔ حضور کے حال میں ذکر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہجہاں آباد میں لطف علی خاں ناطق کے گھر پر مشاعرہ تھا۔ میر صاحب کی طرحی غزل میں قافیہ کے بعد ردیف "اور" "یعنی طرف تھی۔ بعضے فصحا نے اُسے خلافِ "اردو" خیال کر کے اُس کی پیروی نہ کی۔ نثار کے حال میں لکھتے ہیں کہ "ادائے زبان اردو چنانچہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود" قہر کے تذکرے میں مرزا قتیل کے متعلق فرماتے ہیں کہ "او ہم باوصفِ فارسی گوئی دعوئے اُردو دانی ریختہ داشت" اسی طرح مہجور کے حال میں لکھا ہے کہ "سہ کتاب در زبانِ اردوئے ریختہ شکر آمیختہ از خامہ فکرش رونق سواد پذیرفتہ" لیکن "زبانِ اردوئے معلیٰ" کا لفظ سب سے پہلے میر صاحب نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں لکھا ہے[3]

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۸۰ ذکر خاکسار، صفحہ ۲۶۰ ذکر نالاں

(۲) دیکھو صفحہ ۴۳ ذکر بقا۔ (تذکرہ ہندی گویان) (۳) صفحہ ایک

انشا نے بھی جابجا دریائے لطافت میں اردو کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد پھر میر امن کی باغ و بہار میں نظر آتا ہے۔

پہلے تذکرے کے آخر میں چند شاعر عورتوں کا حال بھی درج ہے۔

ان تینوں تذکروں کی تصنیف کی تاریخیں یہ ہیں۔

تذکرۂ اول، ہندی گویان۔ ۱۲۰۱ھ سے قبل شروع ہوتا ہے اور ۱۲۰۹ھ میں ختم ہوتا ہے۔ تاریخ اختتام تو مصحفی نے خود لکھ دی ہے۔ ابتدا کا صحیح سنہ تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن خاکسار کے ذکر میں میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ھ) کا تذکرہ ضمناً آگیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس سنہ سے قبل لکھنا شروع کر چکے تھے۔

تذکرۂ دوم، ہندی گویاں۔ اس کا سنہ تصنیف اس کے نام ریاض الفصحا سے نکلتا ہے یعنی ۱۲۲۱ھ، لیکن یہ تاریخ آغاز ہے، تاریخ اختتام ۱۲۳۶ھ ہے۔

تذکرۂ فارسی گویان یعنی عقد ثریا کا سنہ تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے۔

ہندی گو شاعروں کے دو تذکرے ہیں۔ ان میں بعض شعرا کے حالات مشترک ہیں، اس لئے کہیں کہیں بعض شعرا کے حالات کے متعلق رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے ایک عالمِ شباب کا نتیجہ ہے اور دوسرا زمانۂ شیب کا۔

ہندی گویوں کا پہلا تذکرہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے پر مبنی ہے۔ البتہ اس کا مقابلہ خدا بخش خاں کے کتب خانے کے نسخے سے کیا گیا۔ بعض مشتبہ مقامات کا مقابلہ کتب خانہ مدرسۂ ندوۃ العلما سے بھی کیا گیا۔ باقی دو تذکرے خدا بخش خاں کے کتب خانے کے نسخوں کی نقل ہیں۔ بعد ازاں ان تینوں تذکروں کے مبیضوں کا مقابلہ کتب خانۂ ریاستِ رامپور کے نسخوں سے ہوا۔ افسوس ہے کہ کتب خانہ خدا بخش خاں اور رامپور کے نسخے بہت غلط اور بدخط نکلے۔ تاہم مقابلے سے بعض مقامات کی کچھ نہ کچھ تصحیح ہو گئی۔

میں قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا ایڈوکیٹ پٹنہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے

دونوں نسخوں کی نقل خدا بخش خاں کے کتب خانے سے لکھوا کر بھیجی اور خود بڑی احتیاط سے تینوں نسخوں کا مقابلہ وہاں کے نسخوں سے کیا۔

حاشیہ میں ان نسخوں کا حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔ ن۔خ سے مراد نسخہ کتب خانہ خدا بخش خاں ہے اور ن۔ر سے نسخۂ رامپور۔ جہاں صرف ن لکھا ہے اُس سے بھی نسخۂ رامپور مراد ہے۔

عبدالحق

حیدر آباد دکن

۸ر نومبر ۱۹۳۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ مصحفی

نیکوترین تذکرہ کہ غنچہ دلہائے ارباب سخن را باہتزاز نسیم تقریر بشگفتن درآرد حمد خداوند سخن آفرینی است کہ مصرعہ ریختہ شمع قامت مہوشاں را باچندیں معنی سوز و گداز بسم اللہ دیوان عشق ساختہ و دلنشیں بیاضے کہ توتیائے اشعار آبدارش دیدۂ تماشائیان معنی دوست را آبحیات معنی ہائے روشن در جلباب ظلمات الفاظ مستراکم نماید۔ نعت سرسلیت کہ شیرازہ بند کاف ونوں دو مصرعہ چیان ذوالفقار دوسرا موزوں و سجع در قبضۂ تصرفش انداختہ۔ اما بعد بر ضمائر فیض ذخائر مشکل پسندان دقیقہ رس و دقیقہ رسان مشکل پسند پوشیدہ مباد کہ چوں ایں فقیر حقیر غلام ہمدانی مصحفی تخلص از تصنیف دیوان فارسی و ہندی و تالیف تذکرہ فارسی فراغت حاصل کردہ مہم تالیف تذکرہ ہندی درپیش آمد اگرچہ از علو ہمت خدا داد سر دماغ آں نبود کہ اوقات عزیز خود را باشتغال چنیں امر لاطائل کہ دیگراں الفخر بگردن خودش بستہ اند مصروف سازد اما بتکلیف میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کہ باشارۂ پدر بزرگوار خود کلام خود را از نظر فقیر می گذارند و شوق شعر ہندی دامن دلش را محکم فرا گرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں بادیۂ پرخار گذاشت و بقید حروف تہجی اسامی قدیم شعرائے عہد فردوس آرام گاہ تا شعرائے زمانہ شاہ عالم بہادر

بادشاہ غازی خلد اللہ ملکۂ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہٗ و احسانہٗ ہمت گماشت بشتر در آں ذکر معاصرین است کہ احوال ہر یکے بچشم خود دیدہ و بحسن و قبح مراتب سخن ہر کس وا رسیدہ۔ و کم کم احوال بعضے متقدمین نیز بطریق تیمن صورت اندراج یافتہ۔ فرقِ زبانِ ریختہ سابق و حال بر ہوشمندان پیدا است امید کہ منظور نظر مبصرانِ نقود معانی و صیرفیان راستہ بازار سخندانی گردد و باللہِ التوفیق و لہُ المستعان۔

(۱) آفتاب

تخلص شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی است کہ نور معدلتش بسیط زمین را چوں آفتاب عالمتاب روشن ساختہ و ہمائے دست تاج بخشش بر سرِ ذرات خاک از قاف تا قاف سایہ انداختہ، دریں زمانۂ پر آشوب کہ از ہر طرف غبار فتن و فساد برخاستہ خاطر عالمی را مکدر دارد و بر سرِ کونین آستیں افشاندہ اوقات عزیز خود را اکثر بطاعت و عبادت بسر می برد و پس از فراغتِ اوقاتِ معہود تلاوتِ قرآن و نوشتن آں اشہب فکر را در میدان شعر ہندی و فارسی و کبت و دوہرہ وغیرہ نیز جولان میدہند و در آں وقت اکثرے از کبیشران و ریختہ گویان پایہ تخت حاضر می باشند و وقت خواندن خوشخوان غلغلہ تحسین آفرین بلند می سازند برائے تیمن و تبرک بقولی کہ کلام الملوک ملوک الکلام اشعارِ حضرت نیز داخل ایں بیاض کردہ شد تا بر صفحۂ روزگار یادگار ماند۔ از وست

دل شاد ہو گیا تھا سن کر تری سواری
موقوف کیوں ہوئی پھر تقصیر کیا ہماری

تری اس مانگ سے کیا معنئ دلخواہ ہے پیدا
شب معراج کی اس خط سے گویا راہ ہے پیدا

جوں شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب
بے اختیار مجکو رولاتی ہے چاندنی

مدت سے اشتیاق ہی پیارے جو آئیے
ٹھلا رواقِ چشم میں سیریں دکھائیے
وہ گلبدن جو آکے ہم آغوش ہو کہیں
جوں غنچہ پیرہن میں نہ پھولے سمائیے
ہے مدتوں سے منتظر جلوہ آفتاب
مکھڑے سے ٹک نقاب کو جلدی اٹھائیے

بات کیجے غیر سے اور ہم سی منہ کو موڑئیے
ٹک خدا سے ڈریئے ان وصفوں کو اپنے چھوڑئیے
منہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے
لیجئے سنگِ جفا اور شیشۂ دل توڑئیے

اُس بسنتی پوشس کو گر پائیے
آرزو دل کی جو ہے بر لائیے

اے صنم جس سے جہاں میں آشنائی کیجئے
کیا ہے لازم پھیر اُس سی بیوفائی کیجئے

(۲) آصف

تخلص نواب وزیر آصف الدولہ بہادر یحییٰ خاں است کہ شور سخاوتش غلغلہ در چار دانگِ عالم انداختہ و برق شمشیر سطوتش زہرۂ شیران آہنی چنگال آب ساختہ۔ اگرچہ آصف است اما سلیمان زمانش می تواں گفت و اگرچہ یحییٰ است اما عیسیٰ عہدش می تواں خواند۔ سایہ پرچم ظفر توامش بر سر نزدیک و دور افتادہ و سم سمندان فولاد نعلش بہر طرف کہ رو آوردہ خاکِ بغی و طغیان را بر باد دادہ۔ ازبسکہ از ابتدائے عمر در جمیع فنون دانائے یگانۂ روزگار است۔ بمقتضائے موزونیٔ طبع گاہ گاہے خیال شعر نیز می فرماید۔ چند اشعار از کلام اوست۔ از وست۔

تجھے غیر سے جب ہم دیکھتے ہیں
نہ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں
تو جلدی سے آ ورنہ میرے مسیحا
کوئی دم کو راہ عدم دیکھتے ہیں

بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ — تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

وحشت میں کوہ و دشت جو یہ آہ لیگئی — کیا کیا کنوئیں جھکانے تیری چاہ لیگئی
کعبہ میں بھی گئے تو ہمیں تیری یاد آہ — پھر سوئے دیر لے بت دلخواہ لیگئی
جاروب کش نے اس کے نہ رہنے دیا مجھے — گر وہاں نسیم شکل پر کاہ لیگئی
آصفؔ چمن میں آتی ہی اُس رشکِ گل کی یاد — کیا جائیے کدھر مجھے ناگاہ لیگئی

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے — ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچہ میں نقش پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ یہاں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم — سنیو اک دن کہ جسم و جاں سے گئے

دل تو کہتا ہے یار آتا ہے — پر مجھے کب قرار آتا ہے
یہ بگولا نہیں اڑاتا خاک — سر یہ کوئی خاکسار آتا ہے
میں کروں گا ترا گلا تجکو — یہ بھلا اعتبار آتا ہے
خیر ہی آصفؔ اس گلی میں آج — دل کو ہر پھر پکار آتا ہے

کس طرح غیر کنے تم کو بہم دیکھیں گے — یہ تو واللہ ان آنکھوں سے نہ ہم دیکھیں گے
دور دامن کی تو نوبت کہیں پہنچے یارب — کب تلک دست و گریباں کو بہم دیکھیں گے
رام تم ہو چکے اور ہم نے بھی بس پوجے پانو — جا کے اب اور کسی بت کے قدم دیکھیں گے
کل کے نامہ کا تو آصف یہ کچھ آیا تھا جواب — آج کیا کرتا ہے تو حال رقم "دیکھیں گے"

---

(۳) آبرو

عرف شاہ مبارک کہ میاں نجم الدین نام داشت نبیرۂ حضرت غوث گوالیاری نور اللہ مرقدہٗ شخصے بود یک چشم باریش وعصا۔ شعررا بطوریکہ درآں زمانہ رواج داشت بسیار بخوبی گفتہ خصوصاً مثنوی کہ موعظ آرایش معشوق از خامۂ فکرش ریختہ بسیار است فقیر چند شعرش بطور خود از دیوانش انتخاب زدہ۔ نوشتہ عمرش از پنجاہ متجاوز خواہد بود کہ باسیب پائے اسپ پائے حیاتش فرو رفتہ از دست۔

افسوس ہے کہ ہم کو دلدار بھول جاوے
وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے

کتابت کا پہنچنا آہ سے میری ہوا مشکل
جلے جاتے ہیں گرمی سی ہوا کی پر کبوتر کے

کیا بری طرح بھوں مٹکتی ہے
کہ مرے دل میں آ کھٹکتی ہے
زلف کی شان مکھ اوپر دیکھو
کہ گویا عرش میں لٹکتی ہے
اب تلک گرچہ مرگیا فرہاد
روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

دامن دشت کیا نقش قدم سے پر گل
کس بہاراں کا یہ دیوانہ تماشائی ہے

عبث کیوں روبرو ہونگی کھاتے ہو قسم جھوٹی
بن آئینہ کے تم اکدم بھی رہ سکتے ہو منہ دیکھو

شور ہے اس کی اشکباری کا　　　آبروچشم تر قیامت ہے

سجا ہے نرگسی بوٹی کا جامہ　　　کرے کیونکر نہ ہم سے چشم پوشی

نالہ ہمارے دل کا غم کا گواہ بس ہے　　　دینے کے تئیں شہادت انگشت آہ بس ہے

دل کب آوارگی کو بھولا ہے　　　خاک اگر ہو گیا بگولا ہے

ظالم نگہ کا تیر ستم کام کر گیا　　　سینہ کو صاف توڑ جگر سے گذر گیا

جان اگر دشمن ہوئے ہو تم ہمارے اس قدر　　　تو ہمارے دل کو کیوں لگتے ہو پیارے اس قدر
گاہ گاہے پیار کی آنکھوں سے کرتا ہے نگاہ　　　مہرباں ہوتا چلا ہے اب تو بارے اس قدر
دیکھنے کو دوڑتے ہیں لوگ بھونچنیا سمجھ　　　آہ سے دل کے نکلتے ہیں شرارے اس قدر
عاجزوں کو بے گنہ آزار دینا خوب نہیں　　　ڈر خدا سے آبرو کو مت ستارے اس قدر

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہو گی　　　اس دلِ بیقرار کی صورت

تمہاری لوگ کہتے ہیں کمر ہے　　　کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے
کیا ہے بے خبر دو نو جہاں سے　　　محبت کے نشہ میں کیا اثر ہے
تخلص آبرو بر جا ہے میرا　　　ہمیشہ اشکِ غم سے چشم تر ہے

---

(۴) اثرؔ

کہ میر محمد نام دارد برادر خورد خواجہ میر درد نور اللہ مضجعہ، شخصے است بزیور علم و عمل آراستہ و بصلاح و تقویٰ پیراستہ، تا حین حیات برادر بزرگ خود را چون پیر پرستش می کرد، حالا بجائے او در شاہجہاں آباد سجادہ نشین است و شعر ہندی و فارسی، کم از برادر بزرگ نمی گوید۔ از وست۔

کب کب تری گلی میں ہم بے قرار آئے
سو بار جی نے چاہا تب ایک بار آئے
ہرچند جی پہ ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آویں
آخر نہ رہ سکے پر بے اختیار آئے

کب کب آوے ہے اثرؔ کیوں تجھ کو ننگ آتا ہے
آنکلتا ہے کبھی جی سے جو تنگ آتا ہے

تیرے کوچہ میں دوبارہ خوب ہم ہو کر چلے
ڈھونڈنے کو دل کے آئے جان بھی کھو کر چلے

یہ تجھ بن رات جو گذری ہے میں جانوں یا خدا جانے
تجھے تو کب ہوئی ہوگی خبر تیری بلا جانے

رقیبوں نے حماقت سے یہاں تک پاسبانی کی
کہ اُس نامہرباں نے ضد سے آخر مہربانی کی
نہ قصد اپنا کہ دل دیجے نہ قصد اُس کا کہ جی لیجے
مصیبت کیا بیاں کیجے بلائے ناگہانی کی

جس وقت کہ تو نے اُسے پیغام دیا تھا
قاصد بخدا اُس نے مرا نام لیا تھا
ناگاہ پس از عمر ملا مجھکو تو بولا
بس لگ نہ چل اب تو نے تو بدنام کیا تھا

ہوا کیا وہ ترا اے شر مگیں چپ ہو کے رہ جانا — کہی جو بات کہا بدنا ہوئی جو بات سہ جانا

بھلا شکر کرنے لگی پھر شکایت — کرم مہربانی توجہ عنایت

حد ہو چکی ہے اب تو خاطر بھلا کہاں تک — ہم نے ہوس کو مارا مقدور تھا جہاں تک

بس ہو یارب یہ امتحاں کہیں — یا نکل جاوے اب تو جان کہیں
حسن ویسا ہی گو رہو نہ رہو — کوئی جاتی ہے تیری آن کہیں
وائے غفلت کہ ایک ہی دم میں — میں کہیں اور کاروان کہیں

ہم ہیں بے دل دل اپنے پاس نہیں — آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر — مجھکو میری وفا ہی راس نہیں
قتل میرا ہے تیری بدنامی — جان کا ورنہ کچھ ہراس نہیں[1]
یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

کوئی کھاتا تھا دغا جھوٹی مدارات سے میں — آپھنسا دام میں کیا جانئے کس بات[2] سے میں
سخت ناچار ہے تقدیر کے ہاتھوں بندہ — ورنہ یوں باز رہوں تیری ملاقات سے میں

دل میں[3] ہے جور ترے از سر نو یاد کریں — تو سنے یا نہ سنے نالہ و فریاد کریں
ان بتوں کی ہے بڑی دوڑ یہی دل شکنی — یہ کہاں جو یہ کسی دل[4] کو کہیں شاد کریں
ہم اسیروں کی اسے چاہئے خاطر داری — اور الٹی نہ کہ ہم خاطر صیاد کریں

---

(۱) ان خ میں یہ شعر نہیں۔ (۲) گھات (خ ر)۔ (۳) جی میں ہے از سر نو جور ترے یاد کریں (خ ع)۔ (۴) دل کو کہیں (خ)

کبھو ادھر کو بھی ہو جلوہ گری عشوہ گری — تیری دولت کا بھلا ہم بھی تو کچھ یاد کریں
آپ کے دل سے بھلا ٹک تو نکل جائے بجا — اور بھی جی میں جو کچھ ہووے سو ارشاد کریں

جو سزا دیجے ہے بجا مجھ کو — تجھ سے کرنی نہ تھی وفا مجھکو
غم میں بیٹھوں کہاں تلک بُت کے — اب اٹھا وے کہیں خدا مجھکو
سرد مہری نے تیری اے ظالم — آہ کتنا جلا دیا مجھکو
کیوں تو ہر چند جفا ہی کرتا ہے — نہیں کچھ دعوئے وفا مجھکو
گر اسی میں خوشی تمھاری ہے — اور بھی کیجئے خفا مجھکو
دو ہی میں ہوں آثر وہی دل ہو — پر خدا جانے کیا ہوا مجھکو

نہ لگا لے گئے جہاں دل کو — آہ لے جائیے کہاں دل کو
تو بھی جی میں اُسی جگہ دیجو — منزلت تھی آثر کے ہاں دل کو

بے گناہوں سے دل کو صاف کرو — نہیں تقصیر پر معاف کرو
کر چکے قتل آثر غریب کے تئیں — اب تو شمشیر کو غلاف کرو

کدھر کی خوشی کہاں کی شادی — جب دل سی ہوس ہی سب اُڑا دی
تا ہاتھ لگے نہ کھوج دل کا — عیار تے زلف ہے اُٹھا دی
پل مارتے خاک میں ملایا — ٹک ہنس کے نظر جدھر ملا دی
یارب سِوا القائے وَجہک — لا مقصودی و لا مرادی
دیتے ہو کسے یہ بد دعائیں — کیا پیارے آثر نے پھر دعا دی

رُباعیات

کیا تجھ سے کہوں میں کس طرح گذرے ہے
کیا دوں میں پتا کہ اس طرح گذرے ہے
بالفرض اگر کہا تو پھر کیا حاصل
گذرے ہے خیر جس طرح گذرے ہے

احوالِ تباہ کو دکھاؤں میں کسے
افسانۂ دردِ دل سناؤں میں کسے
تو دیکھ نہ دیکھ، سن نہ سن، جان نہ جان
رکھتا ہوں تجھی کو اور رلاؤں میں کسے

نے حالِ تباہ کی اُنھیں بینائی
نے نالہ و آہ کی اثر شنوائی
کوئی مرتے مرو، جیتے جیو، بھائیں نہیں
اللہ و غنی بتوں کی بے پروائی

صدقے ترے نام پر یہی بندا ہے
دل دادۂ بے خطر یہی بندا ہے
بے عیب خدا کی ذات ہی ہے پیارے
تقصیر معاف آخر یہی بندا ہے

اب ضبط سے تاب جی کے رہنے کی نہیں
طاقت صدماتِ ہجر سہنے کی نہیں
اک بات ہی موقوف ترے آنے پر
بن آئے ترے کہوں سو کہنے کی نہیں

الم (۵)

کہ صاحب میر نام دارد خلف خواجہ میر درد صاحب نوراللہ مضجعہٗ جوانی است حلیم و سلیم۔ بمقتضائے موزونی طبع کہ موروثی است۔ گاہ گاہی فکر رباعی یا مطلع یا حسن مطلع میکند (حق تعالیٰ سلامت دارد۔ ن ر) رباعیات

کیا کہیے الم کہ اک گھڑی چین نہیں
معلوم ہوا کہ جیتے جی چین نہیں

میں تو بے چین ہوں پر ہے تحفگی یہ (۱) | بن میرے ستائے اس کو بھی چین نہیں

نے دل کو قرار بے قراری کے سبب | نے چشم کو خواب اشکباری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھی | یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

سودا کب تھا اسے یہ کب تھی وحشت | بس دیکھ تجھے ہوا پریشاں حالت
زلفوں کے دام میں الم سا آزاد | آکر پھنس جاوے یوں خدا کی قدرت

(۶) امیر

مسمّی بہ نواب محمد یار خاں خلف نواب علی محمد خاں امیرے بود از قوم افاغنہ۔ در علم موسیقی و ستار زدن یگانۂ روزگار و در رعنائی و زیبائی جوانے بود باغ و بہار۔ ہزارہا دریں کار برباد دادہ و بہ استادانِ ایں فن از داد و دہش بسیار چہ منتہا کہ نہ نہادہ۔ درایامیکہ بہ ترغیب حکیم کبیر سنبلے شوق شعر ہندی دامن دلش را بسوئے خود کشید، خطے بطلب میر سوز و مرزا محمد رفیع نوشتہ روانہ کرد۔ چوں در آں ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان خان رند تخلص بصیغۂ شاعری عز و امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدن ایشاں بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود اتفاق نیفتاد۔ آخر کار میاں محمد قائم کہ در آں ایام در بسولی بودند حسب الاشارہ آمدہ شرفِ ملازمتِ آں والا جناب دریافت۔ و بدر ماہہ یک صد روپیہ عز و امتیازش دادہ باستادیش برداشت۔ وعلی ہذا القیاس دیگر سخن سنجان مثل فدوی لاہوری و میر محمد نعیم نعیم تخلص و پروانہ علی شاہ پروانہ مراد آبادی و میاں عشرت (۲) ہندال و حکیم کبیر صاحب کہ از قدیم در سرکارش بودند و فقیر حقیر مصحفی از حاضرانِ مجلسِ او بودہ ہر وقت کہ غزل طرح می فرمودند سرانجام می رسانیدند۔

---

(۱) میں تو بے چین ہوں ہی پر تحفگی یہ (ن خ)۔ (۲) عشرت (ن ر)

وازبسکہ مزاج نواب بہ سیر وتماشائے مرقع گوناگوں نیز میلان تمام داشت۔ یک مرقع تصاویر شعرا نیز از عاقل خاں مصور کہ مصور سحر کار بود نویسانیدہ بر صفحۂ روزگار یادگار گذاشتہ۔ ازانجا کہ فلک حقہ باز از قدیم الایام بازیہائے تازہ برروئے کار آرد یک ناگاہ بر شیشۂ انعقاد ایں مجلس بہشت آئین سنگِ تفرقہ انداختہ شراب عیش یاران را بذائقہ ہلاہل ہجراں مبدل ساخت دسبب آں شکست خوردن ضابطہ خان از حضرت ظلِ سبحانی بود در سکرتال بامداد وکمک مرہٹہ ہائے ورآں ایام بے تمیزی ہر یک از ندمائے وشعرائے مجلس جدا جدا راہی در پیش گرفتند۔ فقیر درآں حادثۂ جانگزا بہ لکھنؤ رسیدہ بود بعد انقضائے مدت یک سال بہ شاہجہاں آباد رفتہ رختِ اقامت درآں دیار مینونشان انداخت۔ درآنجا پس از تمادی ایام بسمع رسید کہ نوابِ موصوف بعد شکست حافظ رحمت خاں باجل طبعی درگزشت۔ از وست۔

اس منہ سے آہ کچھ نہ نکلا — جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا
کیا تو نے دیا تھا مجھکو ساقی — شیشہ میں تو واہ کچھ نہ نکلا

تیرے گھر جانے سے یاں اپنا تو گھر جاتا ہی — اے مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے
اللہ رے سرخی ترے چہرے کی ہنگامِ عتاب — جتنا ہی بگڑے ہے اُتنا ہی سنور جاتا ہے

اُس شکار انداز سے لگ کر کوئی چھٹتی ہے آنکھ — کیوں نہ ہو سوئے قضا منہ وقتِ دم نخچیر کا

سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہی بیداری[1] سے — لہو اُترا ہی تری آنکھوں میں خونخواری سے
وقت رخصت کے ترے اے مرے جی کے دشمن — تھام تھام آج رکھا دل کو میں کس خواری سے
بس میں آیا جو تمہارے اُسے چاہو سو کرو — کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

---

(۱) مے خواری (ن خ)

کس نے نظروں میں خدا جانے اُسے بل ڈالا نرگس آج آنکھ اٹھاتی نہیں بیماری سی
کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیر گھر میں جاتے ہیں پرائے تو خبرداری سی

وہ دن گئے کہ جو روتی تھیں چشم آبِ رقیق گریں ہیں لختِ دل آنکھوں سے اب تو مثل عقیق

کیا عجب بالِ ملائک ہوں اس جاگہ فرش جس جگہ پا نو رکھے صاحبِ مسند میرا
جنسِ طاعت سے کچھ اپنے تو نہیں پاس امیر مگر احمد کا ہوں میں اور ہے احمد میرا

(۷) امجد

مولوی امجد امجد تخلص کہ پیرایۂ حالش باکسوتِ فضل وکمال مزین است ہمیشہ بہ درس وتدریس گذرانده ودر فارسی ہم برغم علمائے دیگر معلوماتِ معقول بہم رسانده۔ دم از شاگردیِ نظام خاں معجز میزند ودر گفتنِ معنی ابیاتِ جلال اسیر وغیرہما رخشِ خیال در میدانِ وسعت می دواند۔ معہذا بمقتضائے موزونیِ جبلی بگفتن شعر فارسی وہندی نیز قادر است۔ از مدت دراز دست بیعتِ بدست مولوی[1] فخرالدین محمد صاحب نور اللہ مضجعہ گذاشتہ وہمیشہ در مجلسیان بطریق آداب وسلوک در شاہجہاں آباد ممتاز بوده۔ عمرش قریب بہ ہفتاد باشد[2] است۔ ازو

بسمل مجھے نہ چھوڑیو لے یار دیکھنا ایسا ستم نہ کیجیو زنہار دیکھنا
ٹھوکر لگے ہے دل کو مرے ہر لنک کے بیچ کرتی ہے کیا ستم تری رفتار دیکھنا
تو آکے دل جلوں کو ستاتا تو ہے رقیب کوئی آہ لگ گئی تو مرے یار دیکھنا

جاں بلب تشنہ جگریاں سے چلا جاتا ہوں لے خبر جلدی سی ساقی کہ موا جاتا ہوں

---

(۱) گرامی فخرالدین صاحب (ن ر)۔ (۲) خواہد بود (ن خ)

مست ہم آغوشی کو آ نا مری اے سیل سرشک
اپنی ہی موج میں میں آپ بہا جاتا ہوں

حشر میں بھی نہ اٹھوں گا میں ٹک اک آنکھ لگے
اپنی بیداری سے یہاں تک تو خفا جاتا ہوں

ایک عالم نے تری تیغ سے پائی ہے نجات
سب گنہگاروں میں اک میں ہی بچا جاتا ہوں

جو کہا تو نے کہ آ بیٹھ تو میں بیٹھ گیا
جو کہا تو نے کہ جا یہاں سے کہا جاتا ہوں

جس گھڑی آپ کو دیکھوں ہوں ہے جیسے قطرۂ اشک
اپنی نظروں سے بھی امجد میں گرا جاتا ہوں

(۸) اسد

کہ میر امانی نام دارد جوانے بود ظریف مزاج وخندہ روی شاگرد مرزا محمد رفیع۔ دیوانے ضخیم ترتیب دادہ در قصائد وغزل ومثنوی ماہر۔ خصوصاً مثنوی گنجفہ را بسیار(۱) بہ تلاش گفتہ۔ اکثر در مشاعرہ فقیر در شاہجہاں آباد می رسید۔ اصلش از شاہجہاں آباد است وبقولے اکبرآباد۔ زبانی میر ذوالفقار علی کہ ہمسایہ ایشاں بود۔ چناں معلوم شد کہ مشارٌ الیہ عازم لکھنؤ شدہ است میخواست کہ خود را بہ پورب رساند چوں اجلش امان نہ داد در اثنائے راہ در سرائے بانکر مؤ ہنگام شب بر دست دزدان کشتہ شد۔ عمرش قریب پنجاہ خواہد بود۔ از وست۔

مانے ہے کوئی وہ بت گمراہ کسی کی
گو آ کے سفارش کرے اللہ کسی کی

پروانے پڑے جلتے ہیں روتی ہے کھڑی شمع
یارب نہ شب وصل ہو کوتاہ کسی کی

پھنس قید میں گر چاہ میں ہو گرگ کا طعمہ
جو چاہے اسدؔ کر نہ مگر چاہ کسی کی

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

زلفیں ہی دیکھ کر نہ خجل رات ہو گئی
مکھڑا جو کھل گیا تو سحر مات ہو گئی

(۱) ن خ میں "بسیار" نہیں ہے (۲) جو چاہے اسد یہ نہ کر چاہ کسی کی (ن خ)

ناگنی زلف کی رہتی نہیں بن جان لئے — کیا ہی بھری ہے بلا اُف ترا کاٹا نہ جئے

ہر ایک لالہ کا گُل چار داغ لے نکلا — گڑے ہیں زیرِ زمیں داغدار کتنے ایک
شرار و شعلہ و پروانہ و دلِ بیتاب — یہ ایک ایک سے ہیں بے قرار کتنے ایک

(۹) احسن

کہ مرزا احسن علی[1] نام دارد جوانے است سراپا خلق و خوش تقریر و خوش تحریر۔ پیش ازیں پیش خواجہ محمد یونس خاں می بود بعد ازاں در سرکار نواب وزیر مرحوم بصیغہ شاعری عز و امتیاز داشت۔ حالا در سرکار نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں بہادر ممتاز است۔ شعر خود را در اوائل فکر سخن از نظر میر ضیا می گزرانید۔ بعد ازاں از خدمت مرزا رفیع استفادہ گرفتہ۔ قوتِ شاعری چنانکہ شاعر را باید در قصیدہ وغیرہ پیدا کرد۔ چوں فی الجملہ طالب[2] علمی ہم دارد شعر را بہ متانت و رزانتِ تمام میگوید و احتیاطِ محاورہ و صحت زبان بسیار می کند۔ فقیر او را در لکھنؤ دیدہ۔ از وست۔

کل بوسہ کے سوال پہ کیا کیا نہ کہہ گیا — میں اُس کے آگے اپنا سا منہ لیکے رہ گیا

اُلٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا — دیکھ اُس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قمر نہ لگا — بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان ایک رمق باقی — لگا کے زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
اسی لئے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن — گھڑی گھڑی میرے پاؤں کو چشم[3] تر نہ لگا

---

(۱) حسن علی (ن ر) (۲) طلب (ن) (۳) چشم تر (ن ر)

شب جو دھڑکا مرے دل کا خلل انداز رہا | کامِ دل لینے میں اُس شوخ سے میں باز رہا
شام کی صبح ہوئی بندِ قبا کھلنے میں | سینکڑوں جان سے جاویں گے جو یہ ناز رہا
لیکے دل بات میں کی خانہ خرابی اُس کی | جس کے گھر جاکے تو اے خانہ برانداز رہا
ٹکڑے اُڑ جائیں گے سینہ میں جگر کے احسنؔ | تیرے نالوں کا کوئی دن جو یہ انداز رہا

یہ راہ تھی کیسی کہ تیرے گھر تلک آتے | ہر گام پہ یہ ہم بیٹھ گئے دل کو پکڑ کر
صاف آئی نظر سلِ اجل آنکھوں میں احسنؔ | جس دم کہ رکھا قبضہ پہ ہاتھ اُس نے پکڑ کر

کل جو اُس شوخ نے سنکھہ ہو لڑائی آنکھیں | برق نے ابر کی چادر میں چھپائیں آنکھیں
شوخ چشمی پہ گھمنڈ اپنی نہ کیجو نرگس | آنکھیں کھل جائیں گی جب اُس نے دکھائیں آنکھیں
پشت پا پر سے نظر اٹھتے نہ دیکھی ہم نے | واہ ری چشمِ حیا،[1] ہو ری لجائیں آنکھیں
وہ دس وہ دوں کس کو نہیں اس میں کسی کی تقصیر | آفتیں دل پہ مرے میری ہی لائیں آنکھیں
مل گئے خاک میں ہم تِس پہ بھی اُس ظالم نے | نہ ملائیں، نہ ملائیں، نہ ملائیں آنکھیں
کل عجب طرح سے تڑپے تھا ترے کوچہ میں | دیکھ کر حال کو احسنؔ کے بھر آئیں آنکھیں

(۱۰) آشفتہ

کہ مرزا ضیا قلی[2] نام دارد پسر حکیم محمد شفیع برادر بیات مرزا رضی جوانیست شوریدہ سر و وارستہ مزاج با وصف آشنائی با فن طبابت کہ موروثی است چوں دیگراں دوکان خود فروشی نمی چنید۔ و رطرز گفتن و خواندن شعر نشاگردی و تتبع میر سوز مفاخرت میکند۔ والحق کہ وقت روانیِ زبان حرکاتش از مردم سامعین دلفریبہا می نماید۔ شعر دردمندانہ کہ شستہ و صاف باشد دوست دارد۔ در ایامے کہ فقیر از شاہجہاں آباد در لکھنؤ آمدہ

---

(۱) حیا ہی نے لجائیں (ن خ) (۲) مرزا رضا قلی (ن خ)

اول طرح مشاعرہ او انداختہ۔ از وست۔

چہرا کچھ ان دنوں غم پنہاں سے زرد ہے — ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے

یہ جوشِ غم ہے کہ سینہ میں خوں ابلتا ہے — نہ رکھیو ہاتھ کلیجہ پہ میرے جلتا ہے
نہ پوچھو دل کی حقیقت تمہارے عشق میں آہ — اُسے وہ غم جو لگا ہے اُسی میں گلتا ہے
یہ ہم کو اُس کی جدائی نے اور ایذا دی — کہ رات دن کوئی سینہ میں دل کو ملتا ہے
کسی کے کان کا دُر دیکھا تو نے آشفتہ — جو اشک آنکھوں سے موتی سا تیرے ڈھلتا ہے۔

وہ رشکِ مہر جو عالم میں بے نقاب پھرے — پھر اس چمک سے نہ گردوں پہ آفتاب پھرے
گئے تھے کل مجھے بٹھلا کے میں یہ آتا ہوں — میں ایسے آنے کے صدقے بہت شتاب پھرے

لڑتے تو رات اُس سے میں غصہ میں لڑ لیا — پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجہ پکڑ لیا

ہمیشہ آگ نکلتی ہے میرے سینہ سے — الٰہی موت دے، گذرا میں ایسے جینے سے
نہ جاوے کیونکہ بصارت وہ چاند سا مکھڑا — نظر پڑا نہیں مجھکو کئی مہینے سے
ہو جس دماغ میں کچھ بوئے عشق وہ سمجھے — ملی خلی ہوئی بو عطر کی پسینے سے

چلا ہے کعبہ کو آشفتہ پارسا بن کر — خدا جو بیٹھے بٹھائے اسے خراب کرے

(۱۱) امین

کہ امین الدین خاں نام دارد پسر قاضی وحید الدین خاں کہ در عہد نواب نجیب اللہ

خدمتِ قضا بآں بزرگ مفوض بود. جوانِ خوش اخلاق وخوش اختلاطاست - در شاہجہاں آباد ہمسایۂ فقیر بود و شریک صحبت مشاعرہ نیز. حالا در سرکار صاحب عالم بخدمت داروغگی دوائی خانہ ممتاز است بمقتضائی موزونیٔ طبع گاہ گاہی خیال شعر ہندی می کرد و میکند یک شعر از و بخاطر است -

کون آتا ہے یہ کس کے پانو کی آواز ہے ہر صدائِ پا میں جس کے سو طرح کا ناز ہے

افسوس (۱۲)

کہ میر شیر علی نام دارد ابن میر علی مظفر خاں داروغۂ توپخانہ عالیجاہ[۱] جوانیست سلیم الطبع شعر کم از معاصرین نمی گوید بہ شاگردی میر حیدر علی حیراں اشتہار دارد - اگرچہ پیش ازیں چندے از میر سوز نیز استفادہ کردہ - وطن بزرگانش نارنول است فقیر او را در لکھنؤ دیدہ - بسیار بخوبی و خلق پیش می آمد - ازوست -

ہنس کر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر

کیا لکھوں اس کو میں احوال یہ کہنا قاصد بے حواسی کے سبب طاقت تحریر نہیں

کیا تو نے لکھا تھا جو تیرے خط کے تئیں دیکھ آنسو لگے افسوس کی آنکھوں سے ٹپکنے

اُس کی صورت کے تئیں یاد دلا دیتا ہے ہنستے ہنستے مجھے یہ گل تو رُلا دیتا ہے

صلاح جانے جو کچھ کہیو اُس سے لے قاصد پیام کیا میں تجھے دوں نہیں حواس مجھے

[۱] نسخہ ر میں "عالیجاہ" نہیں ہے -

آنکھوں کے اشارے سے غیروں کو بلاتا ہے — میاں جھوٹی منہ کھاتمیں تو کس کو اُڑاتا ہے

نہ اس لئے ملے ہیں کہ کچھ سیم و زر ملے — ہم تجھ سے اُسکے اور ہی امید پر ملے
خط کا جواب ایک طرف یہ نہیں امید — جیتا پھر آکے مجھ سے مرا نامہ بر ملے
کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف — مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

منہ تو دکھلائے ذرا گو نہ ملاقات کرے — ہم کو سو وصل ہیں جو ہنس کے وہ اِک[1] بات کرے

ہنس کر مجھے لوگوں میں اشارات نہ کیجئے — رسوائی ہو جس بات میں وہ بات نہ کیجئے

ابھی وہ پردہ میں ہے تسپہ خلق مرتی ہے — غرض دکھائے یہ دیدار دیکھئے کیا ہو

دیکھتے ہی اُسے حاضر ہوئے مرجانے کو — وہ ہی اشخاص جو یہاں آئے تھے سمجھانے کو

اصغر (۱۴۳)

که مرزا جواد علی نام دارد قوم قزلباش اصل بزرگانش خراسان است. از دو پشت در هندوستان بود و باش دارد - مولدش در لکھنؤ و نشو و نما نیز واقع شده - جوان حلیم و سلیم از شاگردانِ میر حسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ عمرش تا امروز بست و دو ساله خواهد بود - از یاوریِ بخت سعید در عمر دوازده سالگی شرفِ زیارتِ نجف اشرف و کربلائے معلّٰی و کاظمین شریف یعنی بغداد کہنہ و سامرہ یعنی جائے پنہاں شدنِ حضرت صاحب الزماں دریافتہ - مدت چہار سال دریں سفر بود - بتفضل الٰہی باز مراجعت نمودہ در لکھنؤ رسیدہ - از وست -

(۱) ذرا بات کرے (ن خ).

ہووے نصیب جلد کہیں وصل یار کا
احوال بے طرح ہے دلِ بے قرار کا

بزم میں اُس کی جو شب چاہ کا مذکور چلا
اُٹھ کے مجلس سے وہیں وہ بتِ مغرور چلا

لوہو کی جگہ اشک میں لختِ جگر آیا
دل کا مجھے احوال بُرا کچھ نظر آیا
بندہ ہوں تیرا اے اثرِ آہِ جگر سوز
صدقہ سے تیرے نالہ میرا کارگر آیا
تو نے جو کہا پیار سے مجھ کو ادھر آنا
آنکھوں میں لہو مدعیوں کی اُتر آیا
کل اہلِ محلہ نے مجھے منع کیا تھا
پھر آج میں اُس کوچہ میں اک آہ بھر آیا

میرے حق میں تو بہتر ہے مجھے آرام ہووے گا
ولے تو قتل کرنے سے مِرے بدنام ہووے گا

ظالم تو مجھ سے کس لئے بیزار ہو گیا
کیا رازِ دل مرا کہیں اظہار ہو گیا

جس کا خوباں سے دل لگا ہو گا
وہ نہ آرام سے رہا ہو گا
دامِ الفت میں پھنس گیا تو ہوں
دیکھوں انجام اس کا کیا ہو گا
مر گیا ہو گا وہ وفا کُشتہ
جس کا معشوق بے وفا ہو گا

کہئے دیدار بھی دکھایئے گا
یا یونہیں دربدر پھرایئے گا

سمجھا تھا اُس کو اپنا گریباں غلط کیا
کھینچا جو میں نے آپ کا دامان غلط کیا
لائے اُٹھا جو کوچۂ دلدار سے مجھے
گو اس میں تم خفا ہو عزیزاں غلط کیا

احقر وہ بدمعاملہ ہے بن لکھے پڑھے　　توسنے جو دل دیا اُسے ناداں غلط کیا

مجھے اس دوستی پر بدتر از دشمن سمجھتے ہو　　غرض کشتہ ہوں میں تو آپ کی ہی بدگمانی کا
تو ایسی ساعدِ نازک پہ پیارے گل جو کھاتا ہو　　نہیں آتا تجھے افسوس اپنی نوجوانی کا

ہم آخر ہو گئے بس انتظار صبح ہی کرتے　　قیامت آج تونے اے شب ہجراں درازی کی
گئے سو سو سلام اے احقر ہم نی اُسکو چھپ چھپ کے[1]　　پہ اُس کے ناز نے اس پر بھی ہم سے بے نیازی کی

(۱۴) اکبر

عرف بچو جوانیست شوخ طبع وطرار ولطیفہ گو۔ ہمیشہ نوکری خانہ بادشاہ ممتاز در بوایان کردہ۔ درآں ایام کہ فقیر در شاہجہاں آباد طرح مشاعرہ انداختہ اول برائے اصلاح شعر رجوع بفقیر آوردہ بود۔ بعد چندے بخدمت شاہ حاتم رفتہ استفادہ کلی از ذات بابرکاتِ ایشاں برداشتہ۔ حالا صاحب دیوان است دیررویۂ اُستاد قدم درراہِ ایہام گوئی بیشتر می گذارد و درآں معنی ہائے تازہ می بندد۔ اما فقیر اشعار ایہام را دوست نمی دارد لہذا دو سہ شعرِ سادہ ازو نوشتہ شد و آں نیست۔

ہمارے دل میں خنجر ناز کے کیا کیا نہ گڑتے ہیں　　یہ کافر خوبرو جس وقت تن[2] کر ٹک اکڑتے ہیں
یہ جتنے خوبرو سرکش ہیں ان کو خوب دیکھا ہے　　گئے پر حسن کے ہر ایک کے پھر پانو[3] پڑتے ہیں
خدا چاہے سو ہو وے اب ہمارے حق میں اے اکبر　　صنم سے لینے ہم بھی آج ایک بوسہ پہ اڑتے ہیں

(۱۵) انشا

انشا تخلص سید انشاء اللہ خاں نام دارد خلف الرشید میر ماشاء اللہ خاں۔ وطن

---

(۱) کراں خ (۲) بن (ن خ) (۳) پاوس (ن خ)

بزرگانش نجف اشرف وخودش در مرشدآباد تولد یافتہ تحصیل کتب عربیہ و فارسیہ وطب بقدر حال ہمہ وارد - از ابتدائے عمر بحکم موزونیِ طبع شعر در ہر سہ زبان می گوید زور طبیعت می نماید اما میلان طبع اش بطرف ریختہ بیشتر است - مثنوی شیر وبرنج در جواب نان وحلوا ر مولانا بہار الدین آملی بسیار بصفا گفتہ و داد فصاحت زبان فارسی درو دادہ - دیوانش از نظر فقیر گذشت - اگرچہ ہمہ کلامش در عالم ظرافت خالی از کیفیتی نیست اما انچہ از اشعار سادہ اش انتخاب فقیر افتادہ اینست -

سچ و جھچ اسے کہتے ہیں ہبیاختہ پن نکلے ‎ ‎ ہے اور کوئی ایسا جس مین یہ بھبن نکلے
جوں وقت سحر انشا سورج کی کرن نکلے ‎ ‎ انشاں کا وہ عالم ہو اُس چاند سے مکھڑے پر

لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا ‎ ‎ اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا
مجھ پر یہ لگے کرنے نیا تم ستم اچھا ‎ ‎ اغیار سے کرتے ہو میرے سامنے باتیں
واللہ کہ اس سے ہے مراتب عدم اچھا ‎ ‎ اس ہستی موہوم سی میں تنگ ہوں انشا

تس پر یہ غضب پوچھتے ہو نام ہمارا ‎ ‎ ٹک آنکھ ملاتے ہی کیا کام ہمارا
ساقی تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا ‎ ‎ رکھتے ہیں کہیں پانو تو پڑتے ہیں کہیں اور
پہنچے ہی بلاواسطہ پیغام ہمارا ‎ ‎ بے تابی دل کے سبب اُس شوخ تک انشا

کم نہیں شور قیامت سے یہ آوازہ صبح ‎ ‎ ہیے شب وصل کھلے کاش نہ دروازہ صبح

بولا کہ یہاں نہیں چل مچھی بھون کے اندر ‎ ‎ مانگا جو اُس (۱) سے بوسہ میں نے چمن کے اندر

(۱) مانگا جو میں نے بوسہ اُس سے چمن کے اندر (ن خ)

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گاہ گاہے جو ادھر آپ کرم کرتے ہیں
وہ ہیں اُٹھ جاتے ہیں یہ اور ستم کرتے ہیں

کل وہ نگہہ اچٹتی ہوئی یوں جو پڑ گئی
بے اختیار اُس سے میری آنکھ لڑ گئی
اٹھتی نہیں جو دل سے صدا آہ کیا ہوا
اس ساعتِ فرنگ کی کیا کل بگڑ گئی

(۱۶) اختر

میر اکبر علی اختر کہ پیش ازیں انجم تخلص می کرد ولد میر عبداللہ ابن حضرت اسان پانصد منی(۱) کہ ایشاں پیرزادہ ہائے نواب قمرالدین خاں بودند جوان ظریف الطبع ولسان است۔ در فن ساختن انواع آتشبازی وغیرہ نظیر خود ندارد روزے کہ مومی الیہ ہمراہ مرزا جانی کہ از کربلائے معلیٰ آمدہ بودند بلکھنؤ آمد فقیر درآں ایام رفیق میر محمد نعیم خاں صاحب بود چوں مرزائے موصوف بسابقہ معرفت بخانۂ میر صاحب موصوف فرود آمدہ بودند بعد چندے تعریف صناعتش بیان نمودہ اورا بہ سرکار میر صاحب نوکر کنانیدند۔ الحاصل درہماں روزہا بافقیر نیاز مندی کردہ چیزے شکستہ بستہ خود را برائے اصلاح اکثر می آورد۔ چوں چند سال بریں بگذشت و روزگارِ فقیر برہم خورد و وحشتِ مزاج برآں زیادہ گردید و مطلقاً بہ شعر و شاعری سروکار نماند بلکہ نفرت کلی رو داد۔ مومی الیہ بموافق معمول برائے اصلاح می آمد و متصدعِ اوقاتِ آزادگی می شد۔ لہٰذا جواب دادم کہ مرا دماغ اصلاح نماندہ است پیش میاں قلندر بخش جرأت بروید و اکنوں شعر خود را

---

(۱) "ایشان پانصد منی" بجنسہ (ان خ ر)

بہ ایشاں بنمائید اول راضی بریں نبود چوں دید کہ طبیعت ایشاں آزردہ میشود پیش مشار الیہ رفت و صورتِ حال را ظاہر کرد۔ جرأت گفت کہ میانِ من و ایشاں دوستی است و قول شمارا چہ اعتبار اگر رقعۂ از دستِ ایشاں نویسانیدہ بیارید مضائقہ ندارد۔ آخر کار چوں روزِ دویم آمدہ درخواستِ رقعہ از من کرد نوشتہ دادم۔ از ہماں روز انچہ گفتہ و می گوید بہ میاں جرأت می نماید۔ عمرش تقریباً از سی متجاوز باشد۔ از وست۔

صاف دل سی بھی جو اس کو اُنیٖ ہم گھر لے گئے ۔۔۔ تو بھی سب دل میں گماں کچھ اور ہم پہ لے گئے
بولے گھبرا کر ہمیں پیٹے جو یہ حرکت کرے ۔۔۔ سامنے اُس کے گلے تک ہم جو خنجر لے گئے
کر رہے ہیں لوگ باہر کے جو سب چرچا ابھی ۔۔۔ کون تھا وہ جس کو تم شب گھر کے اندر لے گئے

یہ تیغ جو کھینچے ہی قاتل اسے کہتے ہیں ۔۔۔ تڑپے ہی جو دل میرا بسمل اسے کہتے ہیں
یارب وہ ملے مجھ سے تا لوگ کہیں مجکو ۔۔۔ ساحر اسے کہتے ہیں عامل اسے کہتے ہیں
اختر میں اُسے چاہا یہاں تک کہ وہ میرا بھی ۔۔۔ قائل ہی کہ ہاں سچ ہی مائل اسے کہتے ہیں

کس رشکِ گل سے لگ کر آئی صبا چمن میں ۔۔۔ کیا بو مہک رہی ہی اب جا بجا چمن میں

اور کیا خاک ہو کوئی تجھ پہ ستمگر عاشق ۔۔۔ روتے پھرتے ہیں ترے اگلے ہی گھر گھر عاشق

سوچتے کیا ہو میرے قتل کو میاں بسم اللہ ۔۔۔ کھینچ کر تیغ لگا۔ اٹھیے ہاں، بسم اللہ

صدا آواز کی بھی ہم تو سننے کو ترستے ہیں ۔۔۔ خوشا حال اُن کا ہی جو آپ کے ہمسایہ[1] بستے ہیں
کیا مدفون کس کو کر کے ٹکڑے تو نے اے قاتل ۔۔۔ کہ جس کی خاک پر یہ ابر کے ٹکڑے برستے ہیں

(۱) سایہ میں (ن ح)

تمھاری جنبشِ ابرو ہی کا مارا ہو وہ پیارے　　مگر انجم کے ناحق قتل پر اب آپ کستے ہیں

تماشے کی ہے جا مژگاں پہ جو لختِ جگر نکلا　　عجب یہ نخل ہے جس میں کہ شکلِ گل ثمر نکلا

اشکِ خونیں یہ ہمیں کیا رنگ دکھلانے لگے　　جو سرِ مژگاں پہ اب لختِ جگر آنے لگے
کچھ ستارا شاید انجم کا پھرا ہے ان دنوں　　تم جو پاس اپنے اُسے پھر پھر کے بلانے لگے

لائی صبا یہ کس کی نکہت چمن کے اندر　　چھپتی ہے بوئے غنچہ سو پیرہن کے اندر

اللہ اللہ رے تیری جلوہ گری کا عالم　　نہ لگے گرد کو بھی جس کی پری کا عالم
پھروں میں آپ میں آتا نہیں ہمدم اُس بن　　مجھ سے مت پوچھ میری بیخبری کا عالم
کیا کہوں کل تیری رفتار کی اٹھکھیلی دیکھ　　کچھ عجب حال سے تھا کبکِ دری کا عالم
لیگئے دل جان سے مارا مجھے انجم اس نے　　کیا کہوں اُس کی میں بیدادگری کا عالم

کوئی جتا دے یہ اُس شوخ بیوفا کے تئیں　　کہ آشنا نہیں دُکھ دیتے آشنا کے تئیں
شبِ وصال میں بھی منہ کو پھیر بیٹھا وہ　　زباں پہ لایا جو میں حرفِ مدعا کے تئیں

گر یوں ہمیں وصل کے دن جی پر ملال ہوگا　　تو ہجر میں الٰہی کیا اپنا حال ہوگا

ہمارا لیکے خط تجھ سے اگر وہ نامہ بر کھولے　　تو کہہ دینا اُسے ٹک دائیں بائیں دیکھ کر کھولے
پھڑکتا رہ گیا مرغِ چمن حسرت میں اُڑنے کی　　بوقتِ ذبح بھی صیاد نے اُس کے نہ پر کھولے

(۱۷) آشفتہ

بھورے خاں جوان صلاحیتِ شعار و سپاہی پیشہ است. پیش ازیں روزہائے کہ فقیر در دہلی بود دیوان شوکت بخارائی از ملائے میخواند۔ و ہم بر و یہ اش کم کم فکر شعر فارسی تلاش تمام می کرد. چوں ایں ماجرا بعرصہ طویل گزشت اکنوں کہ دوبارہ بفاصلہ قلیل بلکھنو گزر افگندہ دیدمش کہ در ریختہ زبانے و بیانے پیدا کردہ و دیوانے درست ساختہ۔ اما عجب اینست کہ باوصف ملاقات کلامش بدستِ فقیر نیامد مگر ہمیں غزل ازوست۔

جامِ گدائی ہاتھ میں لخت سانچ سوئے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دو نو بھکاری حسن کے تیمے پھرتے ہیں

مدت سے اے اختر طالع ماہ جبیں بن گردش میں
کھول تو باھن پوتھی اپنی کب دن سیدے پھرتے ہیں

بنڈت پوچھو ہاتھ دکھاؤ فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنی گرس کے پھیرے پھرتے ہیں

عقل و فراست سلب ہوئے سب اے جنون اپنی جو تب
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیری گھیری پھرتے ہیں

یوں کاندھی پہ زلفیں اُس کی بل کھاتی ہیں و تیخ ام
مارسیہ کو ڈال گلے میں جیسے سپیری پھرتے ہیں

جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک اُن زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیری پھرتے ہیں

(۱۸) افسر

غلام اشرف[۱] ولد غلام رسول کہ در مرثیہ و سلام اشرف تخلص می کند و در شعر افسر قرار دادہ۔ قوم شیخ بزرگانش چودھری[۲] گاؤ خانہ بادشاہی بودہ اند۔ مشارٌ الیہ بمقتضائے موزونی طبع از یک دو سال فکر مرثیہ و سلام بر سبیل رواج زمانہ کردہ و می کند۔ در ایامیکہ مولف طرحِ مشاعرہ افگندہ در آں روز ہا بترغیب فقیر مجموع پنج غزل طرحی مشاعرہ گفتہ از نظرِ فقیر گزرانیدہ طبعش مناسبت تمام بدرستیِ کلام دارد۔ ازدست۔

---

(۱) شرف (ان خ) (۲) داروغہ کارخانہ۔ (ن خ)

جب دیکھے ہے مہ داغ سیاہی جبیں پر
آتا ہے اُسے رشک ترے رُوئے حسیں پر
معلوم نہیں کیا ہے تہِ خاک تماشا
نرگس کی جو رہتی ہے جھکی آنکھ زمیں پر

کٹے ہے خواب میں غفلت کے دوستاں ہر روز
یہ عمر جاتی ہے افسوس رائیگاں ہر روز
بہار آنے کی کچھ تو خبر سنی ہے جواب
کرے ہے صحنِ چمن صاف باغباں ہر روز
نہ طول اُس کا ہوتا روزِ آخرت آخر
کہوں گر اپنی شبِ غم کی داستاں ہر روز
جگاتا پھرتا ہے جوابِ عدم[1] سے فتنہ کو
یہ بے سبب نہیں گردش میں آسماں ہر روز
غمِ فراق سے اس شعلہ رو کے اے افسرؔ
جلا کرے ہے میرا مغزِ استخواں ہر روز

چہرے پہ ماہ کے نہ کیا گر خیال تو
آئینہ لیکے دیکھ ٹک اپنا جمال تو
گویا شفق میں پنجہ خورشید غرق ہے
جس وقت ہاتھ مہندی سے کرتا ہے لال تو

اب نہیں ہم سے وہ الفت اور ملنا پیار سے
بیشتر ہے ربط اُس کو آج کل اغیار سے
ایک جنسِ حسن تھی سو وہ زلیخا لے گئی
کیا خریدیں جا کے اب ہم مصر کے بازار سے
ٹک نزاکت دیکھیو پہنے ہے گجرا جب وہ شوخ
شاخِ گل سا ہاتھ لچکے ہے گلوں کے بار سے
سینکڑوں کے خانۂ دل پر خرابی آ گئی
ایک دن جھانکا تھا اس نے رخنۂ دیوار سے
کچھ تمنا دل کو اپنے باغِ جنت کی نہیں
کام اے افسرؔ ہے مجکو کوچہ دلدار سے

(۱۹) اوباش

شیخ امیر الزماں بجنوری اوباش تخلص از شیخ زادہ ہائے لکھنؤ جوانِ صلاحیت شعار است۔ بمقتضائے موزونی طبع چیزے کہ گفتہ آنرا بر بیاضے نوشتہ داشتہ روزے

---

(۱) خواب عدم (ن خ)

ہمہ کلام خود را بہ نظر مولف گزرانیدہ انچہ عجالتاً بطورِ انتخاب افتادہ انیست۔

یار مجھ سے وہ مہ جبیں نہ ہوا — میری خواہش پہ آسماں نہ پھرا
دین و دنیا سے ہم پھرے پر آہ — اپنی خو سے وہ بدگماں نہ پھرا
ہو گئے پیر انتظار[1] میں ہم — تو بھی او باش وہ جواں نہ پھرا

خون ہو دل کاوش سے اُس کی بہہ گیا — ٹوٹ کر سینہ میں پیکاں رہ گیا
مجھ سے مت منزل کی پوچھو سرگزشت — ہمرہاں آگے گئے میں رہ گیا

چمکے ہے چشم تر میں رخ اُس بے حجاب کا — پانی میں جیسے عکس پڑے آفتاب کا

دل و دیدہ اپنے جو یار تھے سو وہ دردِ غم میں پھنسا گئے — ہیں جن سے چشم امید تھی وہ ہمیں سے آنکھ[2] چرا گئے

(۲۰) الہام

شاہ ملول الہام تخلص قوم شیخ کہ پیش ازیں تخلص ایشاں ملول بود شاعر فارسی گو است۔ طبعش چوں بحر مواج رواں رواں افتادہ۔ کم کم بطرف ریختہ ہم متوجہ می شود بعضے از موزوناں لکھنؤ چہ در فارسی و چہ در ہندی شاگردیش را فخر خود می شمارند و او را استاد مسلم الثبوت می دانند و الحق کہ در درویشی و شاعریش دوش بدوش راہ می رود و بہ سبب نام درویشی اعالے و ادانئے شہر توقیر و تعظیمش را موجب افتخار می پندارند وطن اجدادش ہمیں شہر لکھنؤ و قبل مرادآباد۔ عمرش از شصت متجاوز زیادہ شدہ از وست۔

قدر تو نے کچھ نہ جانی گو بُرے یا نیک تھے — ناز برداروں میں پر ظالم تیرے ہم ایک تھے

---

(۱) انتظاری میں (ن ر) (۲) آنکھیں (ن ر)

نگہ وہ شوخ کہ طعنہ کٹار پر مارے مژہ وہ تیر[1] کہ خنجر کو دھار پر مارے

حرف البا

(۱) بیدار

بیدار کہ میر محمد علی نام دارد بہ میر محمدی بیدار مشہور است شاگرد مرتضیٰ قلی بیگ فراق تخلص کہ شاعر فارسی گو گذشتہ۔ جوانیست محمد شاہی قامت حال خود را بہ لباس درویشی[2] آراستہ دارد یعنی بھینٹھ گیروی بر سر تاج می بندد و دیگر لباس اوبطور دنیا داران است۔ در عرب سرائے اقامت دارد۔ دیوان ریختہ اش مشہور است زبانش بسیار رشستہ و رفتہ۔ کم کم فکر شعر فارسی ہم می کند چنانچہ اشعار فارسی خود را نیز از قسم چند غزل و رباعی و دو سہ قصیدہ کہ در نعت و منقبت وغیرہ گفتہ بر پشتِ سرورقِ دیوان خود نوشتہ داخل ساختہ۔ چوں اعتقاد بجناب مولوی فخرالدین صاحب بسیار داشت ہر گاہ کہ از عرب سرائے در مدرسہ غازی الدین خاں برائے دیدنِ آں بزرگ می آمد۔ گاہ گاہ بہ فقیر ہم اتفاق ملاقات می افتاد و صحبت شعر بمیان می آمد۔ حالا گویند کہ از چندے در اکبر آباد رونق افزا است۔ دیوانش از نظر فقیر گزشت۔ انتخاب اوست۔

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجئے گا ایک ملنے کو نہ کم کیجئے گا
گر یہی زلف و یہی مکھڑا ہے غارتِ دیر و حرم کیجئے گا
جی میں ہے آج بجائے مکتوب یہی بیت اُس کو رقم کیجئے گا
مہربانی سے بھلا اے بندہ نواز کہئے کس روز کرم کیجئے گا

---

(۱) تیز (ان خ) (۲) لباس شاہی یعنی درویشی (ن خ)

تنہا نہ دل ہی لشکرِ غم دیکھ ٹل گیا — اس معرکہ میں پائے تحمل بھی چل گیا
گزری شبِ شباب ہوا زور شبِ اخیر — کچھ بھی خبر ہے قافلہ آگے نکل گیا
قابل مقام کے نہیں بیدار یہ سرائے — منزل ہے دور، خواب سے اٹھ، دن تو ڈھل گیا

مل گئی تھی اس میں کل کس کے دلِ سوزاں کی خاک
گرد باد دشت فرسا شعلہ جوالہ تھا
ہو گیا گرتے ہی تیری چشم سے دامن کے پار
اشک تھا بیدار یا یہ آگ کا پرکالہ تھا

حیف ہے ایسی زندگانی پر — کہ فدا ہو نہ یار جانی پر
حال سن سن کے ہنس دیا میرا — کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

ہے بعد مرگ گور میں شورِ جنوں ہنوز — میں کشمکش میں دست و گریباں کی ہوں ہنوز
آیا تھا رات خواب میں وہ سرو خوش خرام — بیدار چشم سے ہے رواں جوئے خوں ہنوز

اب تک میرے احوال سے واں بےخبری ہے — اے نالہ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے
فولاد دلاں چھیڑیو زنہار نہ مجھ کو — چھاتی مری جوں سنگ شراروں سے بھری ہے
ہے زور میں کچھ آب و ہوا شہرِ عدم کی — ہر شخص کہ بیدار ادھر کو سفری ہے

مقدور کیا مجھے کہ کہوں داں کہ یہاں رہے — ہیں چشم و دل گھر اس کے جہاں چاہے وہاں رہے
نہ بتکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا — محوِ خیالِ یار ہے ہم جہاں رہے

آئے تو ہو پہ دل کی تسلی ہو تب مری — اتنا کہو کہ آج نہ جائیں گے ہاں رہے
بیدار زلف کھینچے اُدھر چشم یار اِدھر — حیراں ہو دل کہاں نہ رہے کس کہاں رہے

کیا ہوئے گلشن میں آ کر اے عزیزاں شاد ہم — روئے ہر گل کے گلے لگ یار کو کر یاد ہم
قتل تو کرتا ہے آخر کھول دے آنکھیں ٹک ایک(۱) — دیکھ لیویں تیری صورت پھر کے اے جلاد ہم

قاصد اس کا پیام کچھ بھی ہے — یا دعا یا سلام کچھ بھی ہے
تو جو بیدار یوں پھرے ہے خراب — پاس ناموس و نام کچھ بھی ہے

صبا کوچہ میں تیرے اس لئے ہر صبح آتی ہے — کہ تیری بو سے جا پھولوں کو گلشن میں بساتی ہے
بہ چشم اشک و بدل داغ و بلب آہ و غم دوری — تری الفت مجھے اے بیوفا کیا کیا دکھاتی ہے

جان تک تو نہیں ہے تجھ سے دریغ — اے میں قربان کیوں تو برہم ہے
گاہ رونا(۲) ہے گاہ ہنسنا ہے — عاشقی کا بھی زور عالم ہے

اُٹھ گئے لوگوں سے کنارے آئیے — کچھ نہیں کہنا ہے پیارے آئیے
کچھ تو کی تاثیر نالے نے مرے — آئے تم مدت میں بارے آئیے

جو کچھ چاہئے آپ ہی فرمائیے — پہ غیروں کی باتیں نہ سنوائیے
نصیحت سے بیدار کیا فائدہ — جو ہو آپ میں اس کو سمجھائیے

---

(۱) اب بجائے ایک (ن خ) (۲) روتا بجائے رونا ہنستا بجائے ہنسنا (ن خ)

گر بڑے مرد ہو تو غیر کو یہاں جا دیجے　　اس کو کہہ دیکھئے بیٹھے یہیں اٹھوا دیجے

جس وقت تو بے نقاب آوے　　ہوگا کوئی جس کو تاب آوے
اے جان بلب رسیدہ آنا　　رہتا ہو کہ تا جواب[1] آوے
بیدار کو تجھ بن لے دل آرام　　ہوتا ہی نہیں کہ خواب آوے

سلام بھی ہو زمانے میں اور دعا بھی ہو　　ہمارے یار نے قاصد سے کچھ کہا بھی ہے

جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہو گئے　　شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے

جی میں بیدار ترے ملنے کے　　ہائے کیا کیا خیال رکھتا ہے

جی میں بیدار کھب گئے میرے　　فندق اُس پنجہ حنائی کے

سیا تو ہو یہ کوئی دم میں پھر گریباں کا　　جدا جدا نظر آتا ہے تار تار مجھے
یہ پیچ و تاب تو کچھ بے سبب نہیں بیدار　　دکھا گیا ہے کوئی زلف تابدار مجھے

دانت تو کیا ہیں اگر کاٹو چھری سے پیارے　　ہاتھ سے میرے تو ممکن نہیں داماں چھٹے

یوں مجھ پہ جفا ہزار کیجو　　پر غیر کو تو نہ پیار کیجو
کرتے تو ہو تم وفا کی باتیں　　پر ہم سے ٹک آنکھیں چار کیجو

---

(۱) رہ جاتو کہ تا جواب - (ن خ)

بیدار تو اس جہاں میں آ کر — جو چاہے سو میرے یار کیجو
پر جس سے گرے کسو کے دل سو — وہ کام نہ اختیار کیجو

کہاں ہیں طالع بیدار یہ کہ ایسا ہو — کہ سر دھرے مرے زانو پہ یار سوتا ہو

صورت اس کی سما گئی جی میں — آہ کیا آن بھا گئی جی میں
تو جو بیدار یوں ہو آتا رک — ایسی کیا بات آ گئی جی میں

مان کہنے کو نہ جا چھوڑ کے اس وقت مجھے — بات رہ جائے گی اور دن تو گذر جاتے ہیں

تیری ہم خاطر نازک سے خطر[1] کرتے ہیں — ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
دل وہ دیں تھا سو لیا اور بھی کچھ مطلب ہے — بار بار آپ جو ادھر کو نظر کرتے ہیں
کیا ہو گر ایک[2] گھڑی یہاں بھی کرم فرماؤ — آپ اس راہ سے آخر تو گذر کرتے ہیں
تیرے ایام فراق اے صنم مہر گسل — آہ مت پوچھ کہ کس طرح بسر کرتے ہیں
دن کو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے اور رات تمام — شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں
یہ وہی فتنہ و آشوب جہاں ہے بیدار — دیکھ کر پیر و جواں جس کو خدر کرتے ہیں
بس نہیں خوب کہ ایسے کو دل اپنا دیجے — آگے تو جان میاں ہم تو خبر کرتے ہیں

جا نہیں مشتاق کے لب پر آئیاں — بل بے ظالم تیری بے پروائیاں
سادہ روئی ہی غضب ہے تس پہ اور — کرتے ہو ہر لحظہ حسن آرائیاں

(۱) خدر بجائے خطر (ن خ) (۲) کوئی بجائے ایک (ن خ)

یوں بہارِ خطِ سبز اُس کے ہے رخسار کے ساتھ
جیسے پھولا ہو بنفشہ کہیں گلزار کے ساتھ
آہ مت پوچھ کہ کس طرح کٹی شب تجھ بن
صبح کی رو رو گلے لگ در و دیوار کے ساتھ
آئینہ دیکھ تو اس منہ سے تجھے اے طوطی
دعویٰ ہم سخنی اس لب و گفتار کے ساتھ

اُس آئینہ رو کے ہو مقابل
معلوم نہیں کدھر گئے ہم
جوں شمع اس انجمن سے بیدارؔ
لے[1] داغِ دل و جگر گئے ہم

یہ بھی کوئی وضع ہے آنے کی جو آتے ہو تم
ایک دم آئے نہیں گذرا کہ پھر جاتے ہو تم
دور سے یوں تو کبھی[2] جھمکے دکھا جاتے ہو تم
پر جو چاہوں یہ کہ پاس آؤ کہاں آتے ہو تم
کہئے مجھ سے تو بھلا اتنا کہ یہ میں بھی سنوں
بندہ پرور کس کے ہاں تشریف فرماتے ہو تم
اس پری صورت بلا انگیز کو دیکھا نہیں
ناصحو معذور ہو گر مجھ کو سمجھاتے ہو تم
دیکھئے خرمن پہ یہ برق بلا کس کے گرے[3]
بے طرح کچھ تیوری بدلے چلے آتے ہو تم
جو کوئی بندہ ہوا اپنا اس سے پھر کیا ہے حجاب
میں تو اس لائق نہیں جو مجھ سے شرماتے ہو تم
آج یہ گو اور یہ میداں انھیں کہہ دیجئے
دیکھ یوں جن کے بھروسے مجکو دھمکاتے ہو تم
پھر نہ آویں گے کبھی ایسے اگر آزردہ ہو
بس چلے ہم خوش رہو کاہے کو جھنجھلاتے ہو تم
حالت بیدارؔ اب کیا کیجئے آگے بیاں
وقت ہے اب بھی اگر تشریف فرماتے ہو تم

(۲) بیان

کہ خواجہ احسن الدین خان نام دارد، شاگرد مرزا مظہر۔ دست بیعت بہ مولوی فخر الدین صاحب نور اللہ مضجعہٗ دادہ۔ شاعر مربط گو و صاحب زبان است۔ مدتے گزشتہ کہ بہ طرفِ دکن رفتہ گویند کہ درسرکار نظام علی خاں عز و امتیاز دارد۔ فقیر ہنوز

(۱) بے بجائے لے۔ (ن خ) (۲) کبھی۔ (ن خ) (۳) پڑے (ن خ)

اورانہ دیدہ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ انتخاب دیوان اوست۔

کسی کا کوئی بیاںؔ آشنا نہیں دیکھا　　سوائے اس کی بھی آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

میں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا　　گرد غم دل سے دھو نہیں سکتا
شب مرا شور گریہ سن کے کہا　　اس کے ہاتھوں میں سو نہیں سکتا
مصلحت ترک عشق ہے ناصح　　لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
جوں سلسل بیاںؔ کہے ہے سخن　　کوئی موتی پرو نہیں سکتا

ہمدم نہ فکر کر کہ مرا کام ہو چکا　　جو دل یہی ہے تو مجھے آرام ہو چکا
آتا ہے تجکو ننگ مرے نام سے عبث　　لے شوخ اب تو شہر میں بدنام ہو چکا

گل کی حسرت سے مرے دل میں سدا خار رہا　　میں تو بھر عمر قفس ہی میں گرفتار رہا

قفس میں میں رہائی کے لئے کیا کیا نہیں کرتا　　پھڑکتا ہوں تڑپتا ہوں کوئی پروا نہیں کرتا

جانے دے مجکو اے ہوس سیر گلستاں　　اب اس چمن سے اپنے غم آباد کی طرف
وامق تو کیا ہے قیس بھی جاتا ہے مجکو بھول　　جب دیکھتا ہوں حسرت فرہاد کی طرف
ہووے گا ذوق حسرت دیدار میں خلل　　شیریں گذر نہ کیجیو فرہاد کی طرف
باتوں میں آہ کس نے لگایا اسے بیاںؔ　　رکھتے تھے کان ٹک مری فریاد کی طرف

بھلا سن تو اے دین و ایمان عاشق　　ہوا ہے تو کیوں دشمن جان عاشق

مقابل ہی رہتا ہے ہر وقت تیرے　　ہی آئینہ یا چشم حیران عاشق
بیاںؔ اس برابر بھی دولت ہی کوئی　　کہ معشوق ہو وے ثنا خوان عاشق

میں جانتا تھا وصل کی شب کچھ و راز ہی　　آنکھیں جو کھل گئیں تو درِ صبح باز ہے
ظاہر میں وصل کا نہیں اسباب گو بیاںؔ　　نومید بھی نہ ہو کہ خدا کارساز ہے

رخصت ہی عقل و ہوش کو جا ہی جہاں رہے　　اے ساکنانِ کوئے بتاں ہم تو یہاں رہی
کیا دیکھتے ہو دل کو مرے تم اُلٹ پلٹ　　آیا ہے گر پسند تو اے مہرباں رہی
فرہاد و قیس نے تو لیا گھیر کوہ و دشت　　اب کونسی جگہ ہی کہ جس میں بیاںؔ رہی

خدا کرے کہ خفا ہو کے جی نکل جاوے　　کہیں شتاب یہ قضیہ چکے خلل جاوے
میں وہ نہیں کہ ترا جا بجا کروں شکوہ　　ترے فراق میں گو جی مرا نکل جاوے
جو سوز دل سے کوئی حرف منہ پہ آیا ہو　　خدا کرے کہ بیاںؔ کی زبان جل جاوے

جو ہوتا ہے ریحان و سنبل کے صدقے　　نہ ہو کیونکہ اُس زلف و کاکل کے صدقے
خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوف چمن کو　　غرض ہو جیے عشق بلبل کے صدقے
جلو میں پھرے ہیں پریزاد لڑکے　　دِوانے ترے اس تجمل کے صدقے
ابھی وعدہ کر کر لگا سوچنے تو　　نہیں یاد گویا، تامل کے صدقے
بیاںؔ کون ہے اب تلک پوچھتے ہو　　تغافل کے قربان تجاہل کے صدقے

رسوا نہ کر خدا سے ڈر لے چشم تر مجھے　　آنا ہی اُس کی بزم میں بار دگر مجھے

ساقی تری نگاہ کے صدقے میں الجبار — دو نو جہاں کی فکر سے کر بے خبر مجھے
آیا ہوں اُس گلی سے ابھی دم نہیں لیا — پھر لے چلا ہے یہ دل وحشی اُدھر مجھے

آفریں عشق کو بیاں تیرے — مر گیا ضبط سے پر آہ نہ کی

چشم کرم کسو ہی سی اپنے تئیں نہیں رہی — رسم مروت اُٹھ گئی مہر کہیں نہیں رہی
وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تجھ سی ہم نشیں — شام سی لیک صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

ہمیشہ کہتے ہو مجھ سے کہ بے وفا تم ہو — خدا ہی جانے مری جان میں ہوں یا تم ہو

کافر ہوں جو زیادہ کچھ اس سی آرزو ہو — ایک بے خلل سی جا ہو بس میں ہوں اور تو ہو

گئی مجنوں کے ساتھ رونق عشق — اتنی کچھ چُہل تھی بیاں تک ہی

تھا حکمِ شرمِ عشق کہ ہرگز نہ رو بیاں — گو ضبطِ گریہ سے نہ ترے جی کو کل پڑے
بھر عمر ہم نے ضبط کیا لیک وقت نزع — بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی — ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
کیدھر ہی کہاں ہے خوش دلی تو — ہم سے بھی کبھی تو آشنا تھی

شب فراق کی دہشت سی جان جاتی ہی — یہی ہی صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہی

جا کہو کوئے یار میں کوئی　　　مر گیا انتظار میں کوئی
کیوں بیان سیرِ باغ کی رخصت　　　نہیں دیتا بہار میں کوئی

جنگ پر جس کی لوگ لڑتے ہیں　　　صلح میں اُس کی کیا مزا ہوگا

جاتا ہے یار کچھ تو بیان منہ سے بولئے　　　اے بے نصیب مانعِ گفتار کون ہے

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی　　　جس طرح کٹا روز، گذر جاوے گی شب بھی

رُباعیات

کیا تو نے سمجھ کے دل بیان اُس کو دیا　　　میں کیا کہوں اُس کی خوبیاں ہیں کیا کیا
بدخو بدعہد شوخ سرکش مغرور　　　بے دین بے مہر بے وفا بے پروا

جس شخص سے ہوتی نہیں قنبر کی مدح　　　وہ کیونکہ کرے حیدرِ صفدر کی مدح
مجھ سے تو یقیں کی نہیں ہوتی تعریف　　　کس منہ سے کروں حضرتِ مظہر کی مدح

از بس میں نہیں زباں پہ اپنی قادر　　　اکثر ہوتی ہیں دل کی باتیں ظاہر
کہتا ہے وہ طفل شر مگیں جھنجھلا کر　　　یارب عاشق نہ ہو کسی کا شاعر

(۳) بیتاب

کہ از دورۂ سابقین است چنانچہ از زبانش می تراود - از دست -

اُس کے ابرو ہلال کے مانند　　　خال اس کا بلال کے مانند

کیوں نہ ہو ہم سے وہ سجن باغی جس کا قد نونہال کے مانند
گل رخاں کی گلی میں اے بیتاب خاک پا ہے گلال کے مانند

(۴) بیتاب

نمیدانم کہ بود ایں قدر دانم کہ شاگرد محمد قایم است مقطعش کہ از زبان ایشان شنیدہ بودم بیاد ماندہ۔

بے تاب بھی کیا جواں تھا اے وائے ہو خانہ خراب اس اجل کا

(۵) بیجان

کہ عزیز خاں نام دارد قوم افغان یعنی روہیلہ۔ فقیر در ایامیکہ در آنولہ بودم بموی الیہ اتفاق ملاقات اکثر می افتاد۔ حالا معلوم نیست کہ کجاست۔ از وست۔

ایسے نادان ہیں ہم تم کو نہ پہچانیں گے ہم سخن غیر سے ہوتے ہو جو آواز بدل
پیچ دیتا ہے تجھے کہہ کے برادر یہ رقیب اس سے دستار نہ اے خانہ برانداز بدل

نہ بوئے مشک ہو ایسی نہ نافۂ تاتار جو لپٹیں آتی ہیں گلرو ترے پسینے میں

(۶) بیباک

کہ میر نجف علی نام دارد سید موسوی از اولاد حضرت موسیٰ کاظم۔ اصل بزرگانش عربی است۔ از چند پشت در سرکار کوئل مقام داشتند اگرچہ مولدش نیز کوئل است اما نہ سالہ در شاہجہاں آباد آمدہ بسن تمیز درہمیں جا رسیدہ قدرے تحصیل صرف و فارسی نمودہ بود کہ طبعش بطرف طبابت مائل شدہ۔ الغرض در بست و دو سالگی مثل اطبائے

دیگر علاج میکند چون موزون طبع افتادہ گاہ گاہے سرے بفکر شعر نیز دارد و ہرچہ گفتہ
ومی گوید از نظر فقیر گزرانیدہ ومی گزراند ایں چند شعر از وست ۔

ہم کو لیل و نہار نے مارا — گردش روزگار نے مارا
ایک تو آگے ہی تھے سودائی — تسپہ جوشش بہار نے مارا
صبر کس طرح کیجئے بیباکؔ — اس دل بے قرار نے مارا

جب ہمارا وہ شوخ یار ہوا — دل وحشی کو تب قرار ہوا
داد خواہوں سی گھر گئے رستے — اس کا جس کوچہ سے گزار ہوا

بیباکؔ کیونکہ پہنچیں گے منزل کو دیکھئے — اپنی کھلی تب آنکھ کہ جب کارواں گیا

صیاد یہ ہوس ہے دل داغدار میں — گلپوش کر قفس کو مرے نوبہار میں
ملتے ہیں دل کو مثل حنا پانو کے تلے — یہ رسم ایک نئی ہے بتوں کے دیار میں
بیباکؔ کوئی کھول کے دیکھے تو اک بار — آتش بھری ہوئی ہے ہمارے مزار میں

جو کوئی تجھ پہ مبتلا ہووے[1] — پھر کسی کا نہ آشنا ہووے[1]

ہمیں تیری ہی ہر دم جستجو ہے — کہ اپنا مطلب و مقصود تو ہے
اگر منظور ہے تم کو مرا قتل — تو فدوی بھی تمھارا روبرو ہے
گر اب کے اٹھ گیا ہاتھ اپنا ناصح — گریباں اور دامن سب رفو ہے

(۱) ہوگا (ن ر)

کرخون ایک جہاں کا اور ہی جہان بدلا　　یہ رنگ تو نے کیسا اے آسمان بدلا
مجلس میں اسکی ہم نے تہمت کے ڈر کے مارے　　سو سو جگہہ سے اٹھ اٹھ اپنا مکان بدلا

(۷) بقا

کہ بقاء اللہ نام دارد پدرش حافظ لطف اللہ خوشنویس از اکبرآباد آمدہ بود خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ پیشتر غمین تخلص میکرد و شعر فارسی می گفت و از نظر مرزا فاخر مکین می گزرانید آخر آخر شوق شعر ہندی دامن دلش را فرا گرفتہ، در ایامے کہ وارد شاہجہاں بود باشارۂ شاہ حاتم بقا تخلص گزاشتہ حالا نسبت شعر فارسی بسوئی خود کمتر می کند و خود را یکے از ریختہ گویان می پندارد، شاہ مذکور مشارٌ الیہ را بہمین جہت در سلکِ اسامی شاگردانِ جدید خود نوشتہ وطرفہ اینکہ شیخ مذکور در تذکرۂ فتح علی خاں حسینی تخلص کہ بر بھوجلا پہاڑی قیام دارند بطوع و رغبت خود خود را شاگردِ میر درد نویسانیدہ۔ در غزل وغیرہ تلاش بسیار می کند اما در قصیدہ خیلے ید طولیٰ دارد ہرچہ می گوید بسیار بتلاش و علو می گوید اما در گفتن غزل بطی است۔ با فقیر در رابطۂ آشنائی بسیار مربوط است بلکہ اکثر در شاہجہاں آباد چندے یکجا بودیم و شام و چاشت باتفاق ہم می کردیم۔ غرضکہ جوان سراپا خلق و ظریف مزاج و قانع دیدمش طبیع شوخش بطرف ہجو بسیار مائل افتادہ در شاہجہاں آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا معرکہ گیر یہا کردہ و دقت طبع خود را اظاہر نمودہ۔ حالا در لکھنؤ بکنج قناعت پا شکستہ اوقات بسری میکند با فقیر گاہ گاہے ملاقات می شود۔ از وست۔

رہ رواں کہتے ہیں جس کو جرس محمل ہے　　محنت راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے
موج سے بیش نہیں ہستی وہمی کی نمود　　صفحۂ دہر پہ گویا یہ خط باطل ہے
کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگ رواں　　جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے

آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی — یہ یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے
کھول دو عقدۂ کونین بقا کے پل میں — یا علی تم کو یہ آساں ہے اُسے مشکل ہے

ترے جو خال سیہ لب پہ آشکارا ہے — کسی کے بخت سیہ کا مگر ستارا ہے
چمن میں لالہ نہیں تجھ کو دیکھ کر قاتل — زمیں سے خون شہیداں نے جوش مارا ہے
بقا کی آہ نے اُس میں کبھی نہ کی تاثیر — بتاں یہ دل ہے تمہارا کہ سنگ خارا ہے

تو نے اس طرح کا اے چرخ گرایا ہم کو — کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اٹھایا ہم کو

وہ صورتیں جو پیش نظر تھیں سو مثل اشک — یوں گم ہوئیں زمیں میں کہ ڈھونڈے نہ پائیاں

دست ناصح نہ(۱) مری جیب کو اس بار لگا — پھاڑوں ایسا کہ پھر اس میں نہ رہے تار لگا
یار کو بھیجی خبر نالۂ تنہائی کی — مدعی کون کھڑا تھا پس دیوار لگا

شب گذری اب اے سحر کے نالو — پھر چرخ پہ برچھیاں سنبھالو
گر قتل کیا بقا کو خوباں — اس بات کو منہ سے مت نکالو
پنہاں ہی بھلا ہے خون عاشق — جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

اس بزم میں پوچھو نہ کوئی مجھ سے کہ کیا ہوں — جو شیشہ گرے سنگ پہ میں اس کی صدا ہوں
اے عشق تو ہر چند مرا دشمن جاں ہو — مرنے کا نہیں نام کو اپنی میں بقا ہوں

(۱) جو بجائے نہ۔ (ن خ)

رُخ اُس کا صفائی ترے تلووں کی نہ پاوے　　خورشید ہزار اپنے تئیں چرخ چڑھاوے

آئینہ دیکھ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں[1]　　اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

(۸) برق

تخلص میاں شاہ جیو کہ بسبب موزونی طبع اول ہمیں غزل از خامہ فکرش تراوید جوانِ ظریف مزاج وشوخ طبع وسلحشور با فقیر از قدیم الایام بسیار با عتقاد پیش می آمد وچوں تخلصش فقیر گذاشتہ لہذا دم از شاگردی ہم می زند۔ از وست۔

یوں لاکھ ہوں دنیا میں تو کچھ کام نہیں ہے　　واللہ کہ تجھ بن مجھے آرام نہیں ہے

ہو وے دل پژمردہ مرا کیونکہ شگفتہ　　ہر باغ میں گل پر وہ گل اندام نہیں ہے

کیا دھوم سے اُمڈی ہے گھٹا ایسی ہوا میں　　افسوس کہ ساقی وے وجام نہیں ہے

اے برق نہ جی اپنا جلا یاد میں اُس کی　　کچھ خوب تو اس کام کا انجام نہیں ہے

حرف پ

(۱) پروانہ

پروانہ علی شاہ مرادآبادی کہ پروانہ تخلص میکرد جوان شوریدہ سر وقلندر وضع بود بنگ وشراب بہ شدت میزد وکسب وشغل نفی واثبات وغیرہ نیز راہی داشت۔ گاہ گاہے از وکشف کہ اہل کمال را باشد مشاہدہ کردم بمعرفت محمد قایم درسرکار محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گزشت اوہم درسلسلۂ شعرا جا داشت وچیزے کہ موزوں میکرد از نظر ایشاں می گزرانید دو شعر از وست[2]۔

---

(۱) ن خ میں یہ شعر فاضل ہے۔ (۲) از وبخاطر است۔ (ن خ)

آج ثابت نہ رہی دل نہ کوئی جان درست | اس کی مژگاں نے کئے پھر پہ پیکان درست
ہمتِ حضرت قایم سے اگر ہو امداد | چند ایام میں کر لیجئے دیوان درست

(۲) پروانہ

تخلص راجہ جسونت سنگھ عرف کاکا جی پسر راجہ بینی بہادر کہ رکن رکین نواب شجاع الدولہ مرحوم بود جوانِ خلیق و ذی شعور است۔ پیش ازیں شعر فارسی می گفت واز نظر راے سرب سنگھ دیوانہ میگذرانید۔ چنانچہ اشعار فارسی اش پیش فقیر در شاہجہان آباد بوساطت مرزا قتیل رسیدہ بودند درہماں ایام داخل تذکرۂ اول شدند اما در روزہائے کہ مولف از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ رسید چوں غائبانہ ہمیشہ مشتاقِ ملاقات می ماند، خبر آمدنِ ایں خاکسار شنیدہ بسیار بہ گرمی و تپاک پیش آمدہ واز ہماں ایام عطفِ عنانِ فکرِ شعر فارسی بطرف ریختہ کردہ خود را شب و روز در گفتن شعر ہندی مصروف داشت تا الی الیوم کہ عرصۂ دوازدہ سال شدہ باشد مشق او بسیار رسا و پختہ گردیدہ۔ در گفتن قصیدہ و غزل طور مرزا رفیع را مسلم میدارد و اکثر بر صید معانیہائے تازہ ہمت می گمارد پیش از آمدنِ فقیر کہ ہنوز آغازِ شوق او بود اعتقاد بہم رسانیدہ مثل میر تقی و میر حسن و میاں لقاء اللہ وغیرہ داشت۔ اکنون از تہہ دل بفقیر رجوع کلی دارد و درستی اشعار درستش موقوف بر مشورہ ایں ہیچدان باعتقاد او افتادہ۔ الہم خوبی اوست و الا شاعریش از ہیچ صاحب طبیعتے در مرتبہ کمی نیست از وست۔

کھا تیغ نگہ جب ترے گھایل کو غش آیا | گویا وہ دمِ نزع میں بسمل کو غش آیا
کیا کیجئے ہمدم کہ اُسے دیکھ کے ہم تو | ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا
کرتے تو کیا قتل پہ خون بہتے جو دیکھا[1] | ٹھیرا نہ گیا سامنے قاتل کو غش آیا

---

(۱) ن خ میں یہ شعر نہیں ہے۔

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غمخواری کرے
بیوفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے
کب نزاکت گل کی سرگوشی کی رخصت دے اُسے
جھوک جب بالی کی کانوں پر گرانباری کرے

دیکھتے ہی اُس کو چہرے پر بحالی آگئی
زعفرانی رنگ جو تھا اس میں لالی آگئی

بشیر

تخلص میر بشارت علی از شاہجہاں آباد در لکھنؤ آمدہ بود[۱] شاگردِ میر نظام الدین ممنون گردیدہ۔ از وست۔

یارب نہ کھلے زلف گرہ گیر کسی کی
وابستہ ہے وہاں خاطرِ دلگیر کسی کی
شاید دلِ بے تاب کو تسکین ہو اپنے
کھنچوا کے رکھوں سینہ پہ تصویر کسی کی
دیوانہ بشیر آیا ہے اِدھر کہیں شاید
پھر کھڑکے ہے اس کوچہ میں زنجیر کسی کی

حرف التا

(۱) تاباں

میر عبدالحی[۳] تاباں[۴] کہ قصہ حسن یوسفیش[۵] در چار سوئے مصر دہلی شہرت تمام دارد جوانے بود شیریں شمائل نہال قامت رعنائش در باغ لطافت از شیرۂ جانہا پرورش یافتہ و لُعبتی بود حورانژاد کہ لُعبت باز پردۂ نیلگونِ آسمان دست صبر خیدیں عاشق بیتاب را بیک کرشمۂ دلفریبش بر تافتہ۔ طبع موزونش حسن و عشق را یکجا ساختہ و شیرینی گفتارش نمک بر زخمِ جگر ملیحان ہند انداختہ اگرچہ زبانی شاہ حاتم در ابتدا شاگرد شاہ حاتم است اما آنچہ شہرت دارد وواقعی است اینست کہ بہ شاگردیٔ محمد علی حشمت

---

(۱) شاگرد میر نظام الدین ممنوں از شاہجہاں آباد وارد لکھنؤ شدہ بود (ن خ) (۲) اس شہر میں (ن خ) (۳) تاباں تخلص میر عبدالحی نام داشت (ن خ) (۴) "کہ" ندارد (ن خ) (۵) حسن یوسفش (ن خ)

کہ [۱] شاگرد محمد غنی بیگ قبول کشمیریست بسیار بسر بردہ حشمت تخلص محتشم علی خاں برادر میر ولایت اللہ ولد میر باقی نیز بود۔ چوں ایں ہر دو بزرگ نسبتِ شعر ہندی میلان طبع بہ شعر فارسی بیشتر داشتند لہٰذا احوالِ ایں صاحبان در تذکرۂ فارسی تسوید یافتہ غرض ازیں جملۂ معترضہ تصریح احوالِ ہر یکے بنا بر رفع اشتباہ سامع بود۔ آمدم بر مطلب کہ اگرچہ فقیر آں یوسف ثانی را بہ سبب نبودن در آں دورہ کہ در عین جوانی کہ گرگِ اجلش درربود ندیدا اما تصویر آں آفتِ جاں [۲] در چاندنی چوک بر دوکان پارچہ فروشش کہ مرقع تصاویر گوناگوں [۳] داشت بملاحظہ رسیدہ والحق کہ از دیدن آں معنی عین الیقین بمشاہدہ افتادہ ہر کہ ہر چہ در وصفِ حسن وجمال خوبیٔ اعضائے آں دلفریبِ عالم گوید بجا است دیوان ریختہ اش مشہور است۔ از وست۔

مری لوح تربت پہ یارو کھدانا	کہ اس سنگدل سے نہ کوئی دل لگانا
زبس تیری مژگاں سے ہی مجکو الفت	جہاں دیکھنا خار وہاں لوٹ جانا

رہتا ہی خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا	مرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا
میں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح	یارب کبھی خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا
تو دیکھ مجھ کو نزع میں مت کڑھ کہ تیری یار	مجھ سی بہت ہیں ایک نہ ہو گا تو کیا ہوا
ہر دم کروں نہ کیونکے گریباں کو اپنی چاک	آتا ہی یاد یار کا جامہ پھٹا ہوا
تاباں کے دیکھنے سے برا مانتے تھے تم	کھو دی بہار خط نے تمھاری بھلا ہوا

جفا سے اپنی پشیمان نہ ہو، ہوا سو ہوا	تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا
سبب جو میری شہادت کا یار سے پوچھا	کہا کہ اب تو اسے گاڑ دو ہوا سو ہوا
نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم	وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

---

(۱) کہ مشار الیہ شاگرد محمد غنی الخ (ن خ) (۲) آفت جاں روزے در (ن خ) (۳) گوناگوں پیش خود داشت (ن خ)

سر پر مرے سایہ کیا گر اے ہما تو کیا ہوا
یا کھائی میری استخواں بعد از فنا تو کیا ہوا
دنیا کے نیک اور بد سے کچھ تاباں نہیں ہے غم مجھے
گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور وں ہوا تو کیا ہوا

غیر کے ساتھ جو دیکھا ہے اُسے بال کھلے
اس سبب دل ہے بہت آج پریشاں میرا

تعلق سے جہاں کے جو کوئی آزاد ہو بیٹھا
وہ آبِ زندگی سے اپنی بیشک ہاتھ دھو بیٹھا
گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے
کہ کچھ حاصل نہیں ہونے کا ساری عمر رو بیٹھا

ایسا ہی مرے اشک کا گر جوش رہے گا
تو شمع صفت جسم بھی پانی ہو بہے گا
جز ترکِ محبت کہ میں لاچار ہوں اس میں
مانوں گا میں ناصح جو تو سب مجھ سے کہے گا
میں خواب میں دیکھا ہے لگاتے اُسے مہندی
کیا جانئے کس کس کا لہو آج بہے گا

آئی بہار شورشِ طفلاں کو کیا ہوا
اہلِ جنوں کدھر گئے یاراں کو کیا ہوا
غنچے لہو میں تر نظر آتے ہیں تہہ بہ تہہ
اُس رشکِ گل کو دیکھ گلستاں کو کیا ہوا
اُس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ
حیراں ہوں میں کہ گل کے گریباں کو کیا ہوا
آنے سے تیرے خط کے یہ کیوں ہے گرفتہ دل
بتلا کہ تیری زلفِ پریشاں کو کیا ہوا
روتے ہی تیرے غم میں گذر گئی ہے اُس کی عمر
پوچھا کبھی نہ تو نے کہ تاباں کو کیا ہوا

ہمیشہ رات گھر غیروں کے رہنا
پھر آ کے صبح کے تئیں ہم سے کہنا
عجب احوال ہے تاباں کا تیرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

تجلی (۲)

عرف میاں حاجی ولد میر محمد حسین کلیم جوانے است در فن ریختہ بے نظیر و ہمشیرہ زادہ میر محمد تقی میر۔ دیوان ضخیم ترتیب دادہ و مثنوی لیلیٰ مجنوں را نیز بنائی خوبی نہادہ اکثر مخمس و مسدس خوب خوب و غزلہائے بحر کامل ازو بر زبان شائقان زمان در شاہجہان آباد جاری است۔ عمرش قریب بہ چہل خواہد بود روزگار و رفقہ سپاہ گری با متیاز تمام کردہ می کند۔ بافقیر بسیار آشنائی داشت حق تعالیٰ سلامت دارد ایں چند شعر کہ مشتی نمونہ از خرواری در ینجا یاد باید کرد۔ ازوست۔

کئی دن سے روٹھ گئے ہیں وہ نہ پیام ہے نہ سلام ہے
کبھی پاس بھی جو بلاتے ہو تو ہزار سی باتیں سناتے ہو
جو یہی طرح رہی ہمنشیں تو ہمارا کام تمام ہے
مری صاحب اتنا تو جانیے کوئی کیا تمھارا غلام ہے

طرب کا رنگ رخ گل پہ آشکار آیا
تڑپ کے جان نکل جائے گی ابھی صیاد
بلا میں خاک میں مر مر کے آہ پر تو بھی
مری وفا پہ تجھے روز رشک تھا اے ظالم[1]
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے
کلی سے کھل گئے جو نہیں وہ گلعذار آیا
نکہیو باغ میں پھر موسم بہار آیا
نہ بے قرار ہی دل کے تئیں قرار آیا
یہ سر یہ تیغ ہے لے اب تو اعتبار آیا
کفن میں کھولدیں آنکھیں سنا جو یار آیا

جب رات تھی دراز ملاقات کم ہوئی
ملنے کے دن جو آئے تو اب رات کم ہوئی

عشق میں کرتے ہیں بدنام تجلی کو عبث
وہ بچارا کبھی اس کوچہ میں آیا نہ گیا

(۱) زور بجائے روز۔ (ن خ)

یہ تارِ دم ہی صورت باز کا رشتہ کہ ہر صورت — چلے جاتے ہیں پردے میں لئے ناچار جب کھینچا

(۳) تنہا

کہ محمد عیسیٰ نام دارد وطن بزرگانش شاہجہاں آباد و خودش در لکھنؤ تولد یافتہ عمرش قریب بست و ہفت رسیدہ۔ جوان صلاحیت شعار و خوش اطوار از ابتدائے عمر بسبب موزونی طبع چیزے موزوں میکرد حالا ریختہ[1] گفتہ دمی گوید و از نظر فقیر می گذراند خیالش بسیار رساست۔ شوق مرثیہ خوانی و گفتن سلام ہم دارد و روزگار در فرقہ سپاہ گری بسر می نماید[2] من کلامہ[3]۔

غیر سے شکوہ مرا بس دیکھی دانائی تیری — میں ہوا رسوا تو کیا ہو گی نہ رسوائی تیری
اب پشیماں ہوں کہ یہ کیا بات مجھ سی ہو گئی — روبرو غیروں کے کیوں میں نے قسم کھائی تیری

حیران تھا کل وہ آئینہ یکبار دیکھ کر — کچھ میں بھی رہ گیا اُسے لاچار دیکھ کر
میں وہ اسیرِ سیرِ چمن ہوں شکستہ بال — روتے ہیں جس کو مرغ گرفتار دیکھ کر
دل ہے وہ جنس بد جسے بازارِ دہر میں — مونہ پھیر لیوے اپنا خریدار دیکھ کر
بلبل کو لیکے نکلا تھا صیاد کل کہیں — شاید کہ خوش ہو یہ گل و گلزار دیکھ کر
گلشن تلک پہنچنے نہ پایا کہ مر گئے — چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھ کر
تلوار پر نہ ہاتھ رکھو جان مر گیا — تنہا تمہاری ابروئے خمدار دیکھ کر

آئے تو وے آن کے اِک آن نہ ٹھہرے — میں کتنا کہا وہ کسی عنوان نہ ٹھہرے
مجلس سے دیا تو نے اٹھا اپنی جو مجکو — شاید تری نظروں میں ہم انسان نہ ٹھہرے
آغاز ہی میں ہو گئی وحشت مجھے تنہاؔ — اس فصل میں شاید کہ گریبان نہ ٹھہرے

---

(۱) انچہ (ان خ) (۲) می کند ۔ بجائے می نماید (ان خ) (۳) از دست ۔ بجائے من کلامہ ۔ (ان خ)

ہو کر جدا وہ سب سے جب ہم سے آ ملے گا
البتہ اپنے دل کو تب کچھ مزا ملے گا

بلبل کے توڑتا ہے کیوں بال و پر دوانے
ان کاوشوں سے تجکو صیاد کیا ملے گا

گو قافلے سے یارو تنہا رہا ہے پیچھے
دن تو ابھی بہت ہے کیا ڈر ہے جا ملے گا

مذکور رے چلا تھا شب ہمنشیں کسی کا
جی میں خیال گزرا میرے وہیں کسی کا

سینہ پہ ایک پرزا اب جیب کا نہیں ہے
دیکھا تھا ہاتھ میں نے بے آستیں کسی کا

تنہا رکھیں توقع کس بات کی کسی سے
ہاں سچ تو یہ ہے بھائی کوئی نہیں کسی کا

کرتا ہے ستم ہم پہ تو آسان سمجھ کر
ہم کچھ نہیں کہتے تجھے نادان سمجھ کر

مر جائیں نہ زندانی تری مارے خوشی کے
ٹک کھولیو ظالم در زندان سمجھ کر

معمورۂ دنیا میں یہ کثرت ہے کہ اللہ
آئے تھے اسے ہم تو بیابان سمجھ کر

کیوں ترک کیا اُس کی ملاقات کو تنہا
کرتا ہے جو کچھ بات تو انسان سمجھ کر

یہ تو فرمائیے ہم آپ کا کیا لیتے ہیں
آپ بے وجہ جو منہ ہم سے چھپا لیتے ہیں

دل بھی کیا جنس زبوں ہے کہ خریدار آ کے
لیتے ہیں پر اسے سو جا پہ دکھا لیتے ہیں

تھم کے بے وجہ تڑپتے نہیں بسمل تیرے
آب خنجر کا یہ رہ رہ کے مزا لیتے ہیں

خاک میں دل کو ملا کہتے ہیں قیمت کیا دوں
چیز اگر لیتے ہیں تو پہلے چکا لیتے ہیں

اک آدھ کا ڈر ہم کو نہ دو چار کا خطرا
ہے ہی تو تری خوئے ستمگار کا خطرہ

کوئی رنگ گل لئے گلشن سے جو دامان میں آیا
دل ہو کے لہو دیدۂ گریان میں آیا

کیا کیجئے اے یارو کہ اس دست جنوں سے — یہ نقص پڑا اپنے گریبان میں آیا
زندانیوں میں آج ہے اک حشر سا برپا — شاید نیا قیدی کوئی زندان میں آیا
کیا تو نے کیا زہر کو کیوں کھا لیا تنہا — کیا بیٹھے بٹھائے یہ ترے دھیان میں آیا

رویا جو میں اک شب بت ناداں کے آگے — وہ صبح لگا کہنے ہر انسان کے آگے
لے دست جنوں چاہے تو کر اس کے بھی پرزے — اب باقی ہی دامن ہے گریبان کے آگے
بجلی کی چمک شعلۂ جوالہ کا عالم — ہے گرد تری جنبش داماں کے آگے
زنداں سے ہمیں عید کو اس نے جو نکالا — ہم گر پڑے غش کر در زنداں کے آگے
کچھ شعر پہ موقوف نہیں سنتے ہو تنہا — گر بات بھی کہئے تو بس انساں کے آگے

عجب طرح کی بہار ان دنوں کسی پر ہے — نہ حد پر وہ لطافت ہے نازکی پر ہے
کہا جو میں نے کہ ہم پاس اب نہیں آتے — تو بولا وہ کہ یہ موقوف اپنے جی پر ہے
چمن میں آکے جماہی یہ کس نے لی ہے نسیم — شگفتگی سی جو ہر گل کی یہاں کلی پر ہے
ادھر کو پھیر کے منہ پھیر بھی ذرا ہنس لو(۱) — کہ جان اپنی غش اس آپ کی ہنسی پر ہے
نہ غافل اب ہو بارشاد مصحفی تنہا — بہوش باش کہ عالم روا روی پر ہے

ہم سے کرتے ہو بیاں غیروں کی یاری آن کر — رہ گئی ہے آپ کی یہ دوستداری آن کر
ہم کو آنے سے تمہاری بزم کے کیا تھا حصول — دیکھ لیتے تھے مگر صورت تمہاری آن کر
روٹھنے پر میرے کیا لازم تھا ہو جانا خفا — بلکہ کرنی تھی تمہیں خاطر ہماری آن کر
طعن بدخواہاں سے تو اک دم نہ پاوے گا قرار — کی جو تیرے در پہ ہم نے بے قراری آن کر
تھا اگرچہ غش میں مجنوں لیکن آنکھیں کھل گئیں — سر پہ اس کے جس گھڑی لیلیٰ پکاری آن کر

---

(۱) ہنسیو (ن خ) (۲) کرتے تھے (ن خ)۔

جس جگہ کشتہ کا تیرے لاشہ تھا خوں میں پڑا — خوب سا رو یا وہاں ابر بہاری آن کر
میں بھی کیا برگشتہ طالع ہوں کہ تنہا رات کو — پھر گئی در تک مرے اس کی سواری آن کر

(۴۴) تصوّر

سید احسان[1] حسین ولد سید حیدر حسین خاں از سادات زیدیہ متوطن قصبہ پنکوڑ[2] جوانِ صلاحیت شعار و خوش ظاہر است۔ مشورہ شعر از میاں قلندر بخش جرأت کردہ دمیکند و سلسلہ نسبش بحضرت امام زین العابدینؑ منتہی می شود۔ عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود۔ از وست۔

صدمۂ غم متصل جب تیرے بایل پر رہے — ہاتھ اس مضطر کا ہر دم کیوں نہ پھر دل پر رہے

مر قدسے میرے ہاتھ قدمبوسی کو نکلیں — گر بعد فنا بھی وہ مرے خاک پر آوے
رونا کہیں موقوف کریں ہیں مری آنکھیں — جب تک نہ تسلی کو دل آوے جگر آوے
لگ جائے تصور کے گلے آکے وہ بت آج — اللہ کرے اُس کی یہ امید بر آوے

مجھے بے تاب آتا دیکھ کر کوچہ میں یہ بولا — بھلا کیوں دوڑ دوڑ آتا ہے یہ کیا اس کی شتابی ہے
تصوّر گرمجوشی یار کی مجھ کو رُلائے گی — بہت گرمی کا ہونا مینہ برسنے کی علامت ہے

غیر کے دل کو کرو تم شاد یوں نہیں چاہیے — اور مجھ پر اس قدر بیداد یوں نہیں چاہیے
ذکر شکوہ سے بھی میرا تم کبھی کرتے نہیں — واہ کیا دل سے بھلائی یاد یوں نہیں چاہیے

ہجر و وصال یار سے اپنا یہ ملک دل — ویراں ہوا کبھی کبھی آباد ہو گیا

---

(۱) سید احسان حسین نام دارد ولد حیدر حسین خاں۔ (۲) پنکور بہ رائے فارسی۔ (ن خ)

ناصح تو کسی بت سے تو جا آنکھ لڑا دیکھ | سن میری نصیحت یہ ٹک اس کا بھی مزا دیکھ
کیا اس کے تصور میں تری بن گئی صورت | لے آئینہ شکل اپنی تصور تو ذرا دیکھ

لے گئے یوں ترے کوچہ سے تصور کو لوگ | جوں اٹھا دیں کسی بدمست کو میخانے سے

یہ کہتے ہیں طبیب آ کر سر بیمار پر تیرے | نہیں آتا ہے رونا اب تو جان زار پر تیرے

گو وہ گیا پر اپنی آنکھوں کے سامنے سے | جاتا ہی کوئی اس کی رفتار کا تصور

خفا تعظیم کی خاطر نہ ہو اے دوستاں ہرگز | کہ بستر پر سے ہل سکتا نہیں یہ ناتواں ہرگز
تصور مر گیا گھٹ گھٹ کے ظالم عشق میں تیرے | ہوا ظاہر نہ اس کا آہ کچھ درد نہاں ہرگز

(۵) تسکین

میر سعادت علی جوان شائستہ و صلاحیت شعار است۔ دم از شاگردی میر قمر الدین منت میزند۔ از وست۔

حال دل کہیے تو ہم سے وہ صنم رکتا ہی | اور چپ رہیے تو مشکل ہی کہ دم رکتا ہی
کس کا کوچہ ہی یہ یارب نہیں معلوم ہمیں | خود بخود یاں کے پہنچتے ہی قدم رکتا ہی

(۶) تسلی

تخلص لالہ ٹیکا رام پسر گوپال رائے بخشی برادر خورد لالہ بھولا ناتھ کہ خدمت دیوانی کچہری بخشی گری فوج نواب وزیر کہ تعلق بایشاں دارد۔ جوانے است تہذیب الاخلاق

خصوصاً به اہل کمال ہر فن به تواضع و تعظیم پیش می آید وطن بزرگانش موضع کرہل قریب به آٹاوہ وخودش در لکھنؤ نشو[1] ونما یافته۔ چوں از ابتدائی عمر ذوق موزونی شعر دلنشین خاطرش بود حالاکه بفضل الٰہی سن عمرش از بست وپنج متجاوز خواہد بود۔ شعر ہندی وفارسی به سلیقه تمام می گوید اما در ہند شہرت نیست۔ اکثر مثنویہا و دواوینِ اساتذه جمع ساخته وانتخاب زده[2] زیبا ئیده چنانچه فقیر ہم یک دیوان فارسی ودو دیوان ہندی خود مع تذکرہ فارسی حسب الاشاره نوشته داده ودیوان اول فقیر را در عالم[3] مکتب نشینی که فقیر درآں روزہا نووارد ایں شہر بود از کمالِ اشتیاق آدم فرستاده طلبیده بدست خود در عرصه قلیل نقل گرفته۔ اگرچه ذہانتِ طبعش چنداں محتاج مشوره نیست۔ اما احتیاطاً اشعار فارسی را از نظر مرزا محمد فاخر مکین می گزرانند وده پانزده غزل ہندی که گفته۔ مشاقگی آں موقوف برراے فقیر داشته۔ غرض که باہمه خوبیہاکه دارد اخلاقِ ایشاں بر زبان کہ ومه جاری است چنانچه فقیر ہم درآں جمله مرہون حسن[4] سلوک ایں بلند اقبال است۔ حق تعالیٰ ہمیشه برمسندِ ایالت ذاتِ شریفش را متمکن داشته۔ در سایهٔ حفظ خود نگاه دارد۔ از وست۔

دیکھے سماں جو اس مژهٔ اشکبار کا — ہو جائے شق جگر رگِ ابرِ بہار کا
جس کے قدم تلے دلِ خوباں ملے گئے — مذکور کیا ہی اپنے دلِ خاکسار کا
فہمیدہ والے کرتے ہیں دولت پہ کب گھمنڈ — کیا اعتماد زندگیِ مستعار کا
آنکھیں سحر تلک مری در سے لگی رہیں — کیا پوچھتے ہو حال شبِ انتظار کا

اب بھی اس نیم جاں میں کچھ ہے — فائدہ امتحان میں کچھ ہے
کیوں ستاتا ہی دیکھ تو پیارے — اس دلِ ناتوان میں کچھ ہے

جو چاہے سلطنت اسے ظلِ ہما ملے — مجھکو یہی ہوس ہی کہ وہ مجھ سے آ ملے

---

(۱) تولد ونشو ونما (ن خ)، (۲) ساخته (ن خ)، (۳) ایام (ن خ)، (۴) حسن نہیں ہے (ن خ)

دیتے اگر نہیں ہو تسلی کو تم کچھ اور
بوسہ ہی ایک شعر کا اس کے صلا ملے

تجھ سا جو بے وفا ہوا ہوگا
اس کا عاشق نہ کوئی جیا ہوگا
کیوں تسلی سے اب نہیں ملتے
غیر نے کچھ سکھا دیا ہوگا

گزر چمن میں اگر وقت صبح تو نہ کرے
نسیم پاس نہ جا گل کے اس کو بو نہ کرے
کوئی بشر نہ زمانے میں ہووے گا ایسا
کہ جس کے دل میں جگہ تیری آرزو نہ کرے
کوئی اڑانے سے باز آئے ہو صبا اس کے
ہماری خاک کو جبتک کہ کو بکو نہ کرے
جہاں میں اور تسلی کا کون پوچھے حال
جو اُس کے حال پہ اے یار رحم تو نہ کرے

تو نہ میری ہی جان ہے کافر
تجھ پہ شیدا جہان ہے کافر
بھاگتا ہے مرے تصور سے
کس قدر بدگمان ہے کافر
دن پھرے پھر مگر تسلی کے
ان دنوں مہربان ہے کافر

کیا پوچھتے ہو حال تم اس غم نصیب کا
میں تو یہی کہوں گا برا ہو رقیب کا

کب میں نے کہا پیارے تم مجھ سے جدا بیٹھو
پہلو سے مرے تکیہ پہلو کا لگا بیٹھو
آتے ہی کہا تم نے بس گھر کو میں جاؤں گا[1]
آخر کو تو جاؤ گے اک دم تو بھلا بیٹھو
کیا جانے تمھیں کس نے یہ بات سکھائی ہے
جب پاس مرے آؤ تب منہ کو بنا بیٹھو
مانگا جو تسلی نے اک بوسہ تو دو بیا مرے
منہ پھیر کے ظالم نے یوں ہنس کے کہا بیٹھو

---

(۱) جاتا ہوں۔ (ن خ)

جب ہمیں دکھلا دے بیٹھا گالی کیا خوب ۔۔۔ بارے اب آپ نے یہ وضع نکالی کیا خوب

بھلا اور تو مجھ کو دو چار کہہ جا ۔۔۔ بُرا میں نہ مانوں گا کہہ یار کہہ جا
خفا کیوں ہوا بیوفا کہنے سے تو ۔۔۔ جفا کار تو ہم کو سو بار کہہ جا
دھڑکتا ہے جی کیونکہ میں تجکو چھوڑوں ۔۔۔ پھر آوے گا سچ مجھ سے عیار کہہ جا
کیا ترک ملنا مرا کس سبب سے ۔۔۔ وہ بات آکے مجھ سے تو اکبار کہہ جا۔
تسلی سے کب ایسی باتیں تو کہتا(۱) ۔۔۔ کسی کے سکھانے سے دلدار کہہ جا۔

دکھاتا ہے مہ حسن کا اپنے جلوہ ۔۔۔ اگر تم بھی آؤ لب بام کیا ہو
ترے لب سے غنچہ کرے ہمسری کیا ۔۔۔ ترے آگے گل نازک اندام کیا ہو
تسلی عجب بیوفا کو دیا دل ۔۔۔ اس آغاز کا دیکھیں انجام کیا ہو

عالم اُس بت پہ مبتلا ہی رہا ۔۔۔ اُن میں فدوی بھی اک فدا ہی رہا
اٹھ گئی دوستی زمانہ سے ۔۔۔ آشنائی نہ آشنا ہی رہا
نہ سنی تو نے ایک بات کبھو ۔۔۔ ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا
تم خفا ہی رہے تسلی سے ۔۔۔ اور وہ تم پہ نت فدا ہی رہا

میاں جو کچھ تری سج دھج میں مرزائی نکلتی ہے ۔۔۔ کہاں مرزا مزاجوں میں وہ رعنائی نکلتی ہے
ادا و ناز جو تجھ میں ہے اوروں میں کہاں پیارے ۔۔۔ کہ تیری وضع میں کچھ اور زیبائی نکلتی ہے
صبا مذکور جب تجھ سے چلی ہے تیری زلفوں کا ۔۔۔ چمن سے بوئے سنبل ہو کے سودائی نکلتی ہے
خدا سے ڈر برابر کر نہ اوروں کے تسلی کو ۔۔۔ کہ تیرے عاشقوں میں اس میں یکتائی نکلتی ہے

---

(۱) کہتا؟ (ن خ)

تجھ پہ آفت یہ نئی پھر دلِ زار آئی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن[1] میں بہار آئی ہے
خوں ٹپکتا ہی تری تیغ نگہ سے ظالم
کسی مظلوم کو شاید کہ یہ مار آئی ہے
دیکھئے حال تسلی کا ہو کیا اب کے سال
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

کیا منہ جو کوئی آوے ترے تیر کے منہ پر
یہ ہم تھے کہ منہ رکھدیا شمشیر کے منہ پر
گو دل میں خفا ہو تو یہ اس بات کو ناداں
کہہ بیٹھیو مت عاشقِ دلگیر کے منہ پر
میرا ہی جگر ہو یہ کہ میں سینہ سپر ہوں
رستم تو چڑھے اُس بت بے پیر کے منہ پر
جب سی تری تصویر لکھی کلکِ قضا نے
وہ حسن نہ دیکھا کسی تصویر کے منہ پر
جانے دے تسلی تو نہ کر فکر سخن کا
پھبتا ہی سخن مصحفی و میر[2] کے منہ پر

حرف الثا

---

(۱) ثنا

میر شمس الدین ثنا تخلص۔ بزرگانش اہل خطہ بودند و خودش در عظیم آباد متولد شدہ۔ شاگرد شاہ مشتاق طلب بود۔ کم کم فکرِ شعر کردہ۔ ازوست

شب فرقت میں تیری نالہ و زاری ہی اور میں ہوں
جھپکتی ایک پل نہیں آنکھ بیداری ہی اور میں ہوں
چمن ہی خندۂ گل ہی مے و مینا ہی اور تو ہے
فغاں ہی نالہ ہی فریاد ہی زاری ہی اور میں ہوں

(۲) ثاقب

میاں شہاب الدین درویشے بود از سابقین۔ گویند کہ شعر خود را بہ میاں شاہ مبارک

---

(۱) مجلس (ن خ) (۲) مصحفی پیر۔ (ن خ)

آبرو می نمود و نیز بخان آرزو مشورہ داشت "یک شعر از وبہم رسیدہ اینست"(۱)

ثاقب کی نعش اوپر قاتل نے آکے پوچھا — یہ کون مرگیا ہی کس کا ہے یہ جنازا(۲)

حرف الجیم

(۱) جوشش

محمد عابد جوشش تخلص پسر جسونت ناگر، گویند جوان قابل است و در عظیم آباد بسر می برد۔ فقیر اورا ندیدہ دو شعر ازو بہم رسیدہ این است۔

تمھارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی — برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ — رہتا ہے مدام آب دیدہ

(۲) جوشش

تخلص رحیم اللہ جوانے است ورزش گیر۔ ور ابتدا بہ شاہجہاں آباد در مجمع و ہنگامہ ہا ریختہ بازی میکرد۔ چوں طبعش موزوں بود و از کلام اساتذہ دفترہا یاد داشت آخر آخر خود ہم چیزے موزوں کردن شروع نمودہ رجوع برائے اصلاح آں بفقیر آوردہ و چند سال کامل خود را دریں شغل مصروف داشت حالا در گفتن شعر قوت تمام پیدا کردہ۔ غزل درست بستہ بسرانجام میرساند۔ بالفعل یک شعر از و بخاطر است طرحیٔ مشاعرہ فقیر در شاہجہاں آباد۔

دریا مری آنکھوں سی نت جاری لہو کا ہی — بیدرد تو کیا جانے کیا رنگ کسو کا ہی

---

(۱) یک شعر الخ نہیں ہی اس کی جگہ صرف از دست ہی ان خ (۲) جنازہ (ان خ)

(۳) جہاندار

تخلص شاہزادۂ ولیعہد خورشید رکاب صاحب عالم خطاب کہ ازبس علو ہمت و سمو منزلت مرتبۂ عالیجائی خود را باوجِ افلاک رسانیدہ و دست دُربارش ہنگامۂ ابر نیساں را سرو ساختہ۔ باوصف استغنائے مزاج کہ خاصۂ بادشاہان است خود را کسب علم و ہنر نیز مصروف داشتہ و کمالاتِ بسیار در ذات بابرکاتش جمع آمدہ۔ معہٰذا بمقتضائے موزونیٔ طبع گاہ گاہے شعر ہندی و فارسی نیز می فرماید، ازوست۔

کون سی بات تری ہم سے اٹھائی نہ گئی — پر جفا جو یہ تری نت کی لڑائی نہ گئی
قصد ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے — وضع نالہ کی مرے اُس سوا اڑائی نہ گئی
دلِ سوزاں کی جہاندار تیرے تا بفلک — کونسی آہ تھی جو مشل ہوائی نہ گئی

کہاں طالع جو پہنچیں اُس کے در تک — رہیں دوری سے ہم اس کو نگر تک
رسائی میرے نالہ اور دعا نے — کہاں پائی اجابت اور اثر تک
بجھاؤں شمع ساں کیا اب جہاندار — شرارِ عشق تو پہنچا جگر تک

میں تو سو بار ترے ملنے کو آیا تنہا — ایک افسوس کبھی تجھ کو نہ پایا تنہا
شِرک سے خالی کسی کا نہ نظر آیا دل — وہ بڑے ظرف ہیں جن میں تو سمایا تنہا
کس کو دعویٰ نہیں الفت کا تری عالم میں — عاشقوں میں ترے میں ہی نہ کہایا تنہا
بندِ کاکل میں ترے جی بھی ہمارا ہی اسیر — دام میں زلف کے دل ہی نہ پھنسایا تنہا
کل جہاندار ہم اور یار تھے ٹک مل بیٹھے — بختِ ناساز نے پھر آج بٹھایا تنہا

وہ نوخط ان دنوں جو مشق جفا کرے ہے ۔۔۔ صاف اپنا ہاتھ ہر دم مجھ پر کیا کرے ہی
میں اور تیری نصیحت مانوں یہ دخل کیا ہی ۔۔۔ ناصح تو مجھ کو ناحق اب کیوں خفا کرے ہی
بیمار عشق اب تک جانبر بھی کوئی ہوا ہے ۔۔۔ تو لے طبیب ناحق میری دوا کرے ہی
پچتائے گا تو اک دن سنتا ہی اے جہاندار ۔۔۔ دیتا تو ہی دل اس کو لیکن برا کرے ہی

زلف آہنختہ[1] جو رخ پر یہ صنم رکھتے ہیں ۔۔۔ روز اور شب کو باعجاز بہم رکھتے ہیں
ٹھان لیتے ہیں وہ پہلے ہی سر اپنا دینا ۔۔۔ تیرے کوچہ میں جو لے شوخ قدم رکھتے ہیں
بوالہوس تیغ جفا کا تیری رو کش کیا ہو ۔۔۔ دعوی اب سینہ سپر کرنے کا ہم رکھتے ہیں
ہر دم زیست کے مانند ہیں ہر دم مے ۔۔۔ ساقی ہم جب پئیں[2] دم اپنے میں دم رکھتے ہیں
نہ جہاندار سا پاؤگے جہاں میں عاشق ۔۔۔ حیف ایسے پہ روا آپ ستم رکھتے ہیں

ہم نہ کہتے تھے کہ دل خوباں کو دینا خوب نہیں ۔۔۔ کیوں جہاندار آخر اب تو بھی تو پچتانے لگا

کون میکش اے جہاندار آج گذرا باغ میں ۔۔۔ ہاتھ میں ہر شاخ گل کے مے کا پیالہ دیکھنا

نرگس کے انتظار میں یہ بے اجل گیا ۔۔۔ آنکھیں جو یوں کھلی رہیں اور دم نکل گیا

(۴) جرأت

تخلص یحییٰ مان است، قلندر بخش نام وارد و یحییٰ مان نام آبائی او ست بدیں جہت کہ خود را از اولاد یحیے رائے مان می گوید داد شخصے گذشتہ کہ ہنوز در محلہ کہ متصل

---

(۱) اہنختہ (ن خ)، (۲) پئیں (ن خ)

چاندنی چوک جائے بود و باش او بود، بکوچہ رائے مان شہرت دارد۔ مشارٌالیہ از انقلاب زمانہ مع عشایر در صغر سن بہ پورب رسیدہ دہم اینجا نشو و نما یافتہ و جوان گردیدہ۔ از ابتدائے موزونی طبع مشق ریختہ پیش میاں جعفر علی حسرت کردہ کلامِ خود را بہ پایۂ پختگی رسانیدہ۔ چنانچہ الحال بقول جمہور از استاد خویش پائی کمی نمی آرد۔ و در شعر خود تلاشِ ماتیانہ بسیار می کند و پاس تمام از کلامش تراود و مزاجش بطرف مسلسل گوئی و غزل در غزل گفتن بیشتر مائل است۔ شاگردان بسیار بہم رسانیدہ و معہذا در علم نجوم ہندیاں و ستار نوازی نیز مہارتے دارد۔ حیف کہ چشمش در عین جوانی بیک ناگاہ نابینا شدہ۔

از وست۔

ہم کچھ اسیر ہوتے ہی خاموش ہو گئے　　سب چہچہے چمن کے فراموش ہو گئے

میری اور اُس کے جو پوچھو ربط کیا کیا کچھ نہ تھا　　پر دل اُس کا پھر گیا ایسا کہ گویا کچھ نہ تھا

آئے جو میرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے　　یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

ہمنشیں باتوں پہ تیری کیا کہوں ہر بار۔ ہوں　　تجھ کو اک قصہ لگا ہیں جان سی بیزار ہوں
کوئی آوے کوئی جاوے منع کر سکتا نہیں　　ہوں تو ہیں در پر ترے پر صورتِ دیوار ہوں
دوست ہوں اُس کا بھی جو ہو دشمنِ جانی مرا　　وہ نہیں میں جو کسی کے درپئے آزار ہوں

ہو گئے سنتے ہی ہم وصل کا پیغام تمام　　کامِ دل کچھ نہ بر آیا کہ ہوا کام تمام
ایک دن کا ہو جو رونا تو کہیں جرأت ہم　　یہاں تو روتے ہی کٹے عمر کے ایام تمام

ہوا ہی اب تو یہ نقشہ ترے بیمار ہجراں کا
کہ جس نے کھولکر منہ اُس کا دیکھا بس وہیں ڈھانکا
قفس میں ہمصفیرو کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ
بھلا میں بھی کبھی تو رہنے والا تھا گلستاں کا
خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو
ادا سے اس کا چلنے میں اٹھا لینا یہ داماں کا

وصل کے دن بھی ہیں کانپ اٹھوں ہوں بیٹھے بیٹھے
یاد آتے ہیں وہ صدمے جو شبِ ہجراں کے

عزیزو وصل میں بھی ہم جو رو رو کر نہ سوتے تھے
سو اندیشہ تھا روزِ ہجر کا اس دن کو روتے تھے

سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہی مجھے
گہ بٹھاتا ہی یہ اور گاہ اُٹھاتا ہے مجھے
یہ تو میں کیونکے کہوں کچھ نہیں بھاتا مجکو
کچھ تو بھایا ہے کہ اب کچھ نہیں بھاتا ہی مجھے
صحبت اب یار میں اور مجھ میں ہی جوں شعلہ و خس
جوں جوں میں اس کو بڑھاؤں وہ گھٹاتا ہی مجھے
گلشن دہر میں جوں خار یہ ہی قدر مری
جس کے دامن سی لگوں ہوں وہ چھڑاتا ہی مجھے
بارے کچھ جذبۂ دل نے تو اثر اس پہ کیا
اب جو آتا ہے سو مژدہ یہ سناتا ہی مجھے
منہ ترے گھر کی طرف کرکے یہ کہتا تھا وہ شوخ
اس طرف کو کوئی کھینچے لئے جاتا ہی مجھے
زخمِ تازہ کی طرح چرخ کہن لے جرأت
ٹک ہنساتا ہے تو پھر خوب رلاتا ہی مجھے

پر از گوہر سرِ تنگِ چشم سے داماں ترا پایا
تری دولت سی بس لے عشق ہم نے خوب بھر پایا

رتبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا
ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا

دیکھ کر کل لیلےٰ و مجنوں کی وہ تصویر کو
اپنے تئیں دیکھے تھا گہ اور گاہ مجھ دلگیر کو

تپش سے غم کی اب اعضا تمام جلتے ہیں
جو ہم سے دل کوئی بدلے تو ہم بدلتے ہیں

ترے فراق میں جرأت نے جی دیا اے شوخ
ہزار حیف نہ لی تو نے اس جواں کی خبر

غم بہت دنیا میں ہیں پر عشق کا غم اور ہے
ہے اسی عالم میں لیکن اس کا عالم اور ہے

بر ہم کبھی قاصد سے وہ محبوب نہ ہوتا
گر نام ہمارا سرِ مکتوب نہ ہوتا

جس سے پوچھا میں اس نے ملنے میں
جان کر خوب عاقل اور دانا
جیتے جی کس کو کہتے ہیں مرنا
ٹک مجھے اتنی بات بتلانا
سن کے بولا وہ کھینچ کر دمِ سرد
سچ کہوں تجھ سے دل کا لگ جانا

عجب انداز سے کل بزم خوباں میں وہ آتا تھا
کہ دل ہی دل میں اس پہ ہر کوئی قربان جاتا تھا

کیوں ہجر کی رات آئی بستر یہ لٹانے کو
پہلو سے تہی بس تھا کچھ یاد دلانے کو
یہاں پھونک دیا دل کو واں یار کو بھڑکایا
نالے بھی قیامت ہیں کچھ آگ لگانے کو

جسے کہ موت خیالِ جمالِ یار میں آئے
تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
پس از فنا جو ترے دل جلے کی خاک اڑے
تو مضطرب سا دھواں اک نظر غبار میں آئے

(۵) جولان

بہار علی شاہ جولاںؔ تخلص ساکن شاہجہاں آباد کہ پیش ازیں در عالمِ دنیاداری

رمضانی نام داشت، عمرش قریب بہ ہشتاد خواہد بود۔ گویند در عالمِ جوانی در علمِ تیراندازی یگانۂ روزگار بود۔ از وست۔

کنجِ قفس میں دیکھ کے بے بال و پر مجھے | اے ہمصفیرو چھوڑ گئے تم کدھر مجھے

(۶۱) جوان

مرزا نعیم بیگ جوان تخلص، اصلش شاہ جہاں آباد اقامت در کوچۂ چیلہ ہا۔ جوان وجیہ و خوش قامت و خوش تقریر و عظیم الشان و خندہ روئے ملازمِ خاص الخاص مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ۔ چوں از آغازِ شباب طبعِ موزوں داشت، بسبب ہم محلگی در شاہجہاں آباد گاہ گاہے کہ اتفاقِ ملاقاتش می افتاد بسیار بہ تپاک و نیازمندی پیش می آمد۔ از یک دو سال کہ دریں شہر فقیر باریابِ مجلسِ حضور پرنور شدہ اورا بر ہماں طریقہ راسخ الاعتقادی معترف یافتہ۔ اگرچہ چنداں بگفتنِ شعر سروکارش نیست اما چوں در موزوناں شمردہ می شود لہذا پیش ازیں روزہائے کہ در حضور مشاعرہ بود بموجبِ ارشادِ والا بسر انجام غزلہائے طرحی وغیرہ سعیِ بلیغ بکار بردہ بواسطۂ معرفتِ سابق آنہا بہ نظرِ اصلاحِ مولف می گذرانید۔ غرض کہ از ابتدا تا انتہا معتقدِ ایں خاکسارِ بے مقدار است۔ خیالش بسیار نفاستے دارد۔ از وست۔

پہلو میں دل اپنے کو بھی غمخوار نہ پایا | یہ خوبیٔ قسمت کہ کوئی یار نہ پایا
ظلم و ستم و جور سبھی ہم نے اٹھائے | جب اور کوئی تجھ سا طرحدار نہ پایا
ہم بیچتے آئینۂ دل تیرے ہی ہاتھوں | پر ہم نے تجھے اس کا خریدار نہ پایا
از بسکہ ہوئی گرمیٔ خورشیدِ قیامت | کوچہ میں ترے سایۂ دیوار نہ پایا
شب دردسے کرتا تھا جواںؔ نالہ و فریاد | محفل میں تری اس نے مگر بار نہ پایا

جائیں تھے اشک تو کل دیدۂ گریاں سے لپٹ ... آج کیا ہے کہ جدا ہوتے ہیں مژگاں سے لپٹ
تربتِ سوختہ جانوں پہ نہ اس طرح پھرو ... شعلہ جاوے گا کوئی آپ کے داماں سے لپٹ
ساتھ ہر اک کے اُسے شوق ہے اب کشتی کا ... اب جواں تو بھی تو اُس فتنۂ دوراں سے لپٹ

گر اُس کی بیوفائی کا شکوہ بیاں کروں ... تو رفتہ رفتہ جمع میں اک داستاں کروں
اُس سے تو اپنے حسن کا شعلہ نہ چھپ سکا ... میں ضبطِ آہ کیونکے بھلا اے جواں کروں

جب تیغ و سپر لے وہ سپاہی پسر آوے ... کیا تاب ہے رستم کی جو اُس سے بسر آوے
جیتا نہیں پھرتا ہے کوئی اُس کی گلی سے ... مجھ تک مرے دلدار کی کیونکر خبر آوے
اٹھ چل نہ جواں آج تو پھر اُس کی گلی کو ... شاید وہ نکلتا ہوا گھر سے نظر آوے

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رکھائیاں ہیں ... شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ سجھائیاں ہیں
اے عندلیب سچ کہہ کیا فصلِ گل پھر آئی ... فوجیں جنوں کی ہم پر کیسی چڑھ آئیاں ہیں
کس بے ادب نے تم سے گلبازی آج کی ہے ... مونہہ پر تمھارے چوٹیں کیا سخت آئیاں ہیں
دیوار و در کی چھاتی سوراخ ہو گئی ہے ... کیا روزنوں سے اُس نے آنکھیں لڑائیاں ہیں
پیوستہ ابرو اس کی میں دیکھ کر یہ سمجھا ... دو شاخیں ہیں کہ جھک کر ملنے کو آئیاں ہیں

نقاب اُلٹ کے جو شب کو وہ مہ لقا نکلے ... تو چاند شرم سے بادل میں منہ چھپا نکلے
مزا تو تب ہے کہ کشتہ کے اپنی تربت پر ... حنائی ہاتھوں کو ملتا ہوا وہ آ نکلے
شتاب دے لے ٹانکے کھڑا ہے کیا جراح ... نہ ہووے یہ کہ مرے زخم سے ہوا نکلے

جو دیکھ کر درِ گوش اُس کا مر گیا ہووے | بجا ہے خاک سے گر اس کی موتیا نکلے
کسی[1] کو اپنی سفارش کے واسطے اُس پاس | جو لیکے جاؤں تو اُس کا وہ آشنا نکلے
غزل جو آں کی پڑھی جائے جبکہ محفل میں | زبانِ اہلِ فراست سے مرحبا نکلے

چین نہیں ہے جی کو ٹک آہ جگر خراش سے | ہوک اُٹھے ہے دمبدم دل میں عجب قماش سے

حرف الحا

(۱) حسن

میر غلام حسن حسن تخلص ولد میر غلام حسین ضاحک۔ وطن بزرگانش ہرات است وخودش در شاہجہاں آباد تولد یافتہ و بہ عمر دوازدہ سالگی قضا او را بطرف پورب افگندہ بقیہ عمر در فیض آباد و لکھنؤ گذرانیدہ در سرکار نواب سالار جنگ بہادر یعنی بہ رفاقتِ سردار جنگ خلف نواب موصوف ممتاز بودہ۔ چوں از اوائل عمر طبعش موزوں بود اکثر خود را مشغول بایں شغل خطیر میداشت و شعرِ خود را از نظر میر ضیا رالدین ضیا رکہ در آں ایام ایشاں از مستعدان زمانہ دریں دیار بودند می گذرانید۔ بعد ازاں کہ دور دورِ مرزا رفیع شد و زبان ریختہ چنانکہ بود زیادہ براں دریں دیار رواج یافت۔ بحکم قوت ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیم اساتذۂ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی میر گذاشتہ کلامِ خود برتبۂ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوانِ ضخیم و مثنویہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ۔ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ الحق کہ کار کارِ اوست۔ قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش

(۱) کسو (ن خ)

بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ۔ تا زندہ بود با فقیر بسیار رابطۂ دوستی درست داشت در عشرۂ ماہ محرم رحلتِ اوست عمرش از شصت متجاوز خواہد بود فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ۔ تاریخ ؎

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں | رو ازیں گلزارِ رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی | شاعرِ شیریں زبانِ تاریخ یافت

١٢٠١

از وست۔

شبِ وصلِ صنم ہے آج اے ہمدم کسی ڈھب سے | گریبانِ سحر کو ٹانک رکھتا دامنِ شب سے

صیاد کی مرضی ہے کہ اب گل کی ہوس میں | نالہ نہ کریں مرغِ گرفتار قفس میں

ساتھ سونے کو ہمارے یہ بر آتے نہیں | جن سے چین آتا ہے جی کو وہ نظر آتے نہیں
مر گئے اس مہربانی پر رقیب اور ہم جئے | جو نہیں دیکھا اس نے کہا مجکو ادھر آتے نہیں
دل ہی اک پامال کر جاؤ ہو بس دیکھا تمھیں | تم کو آنکھوں پر کسی کے پاؤں دھر آتے نہیں
جب سے دیکھی ہیں قبا میں گھنڈیاں گلگوں ترے | شرم سے غنچے چمن میں شاخ پر آتے نہیں
رات دن بیخود رہا کرتے ہیں اُس کی یاد میں | مدتیں گذریں حسن ہم اپنے گھر آتے نہیں

اے گرد باد طرفِ چمن تک گذار کر | بلبل کے پر پڑے ہیں گلوں کے نثار کر

سب نقش اس فلک کے نگینے پہ آ رہے | کار جہاں تمام کمینے پہ آ رہے
غصہ میں جوش مارا جو دریائے حسن نے | جلوے نزاکتوں کے پسینے پہ آ رہے
دو دن کے چاؤ چوز حسن کے بھی ہو چکے | پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آ رہے

دل اب تو بات بات میں پیتا ہے اے حسنؔ — کیا جانے اس میں کس کی نزاکت سما گئی

مرنے کے بعد گل کی ہوا و ہوس کے بیچ — بلبل کے پر بھی اڑاتے ہیں کنج قفس کے بیچ

ہے دھیان جو اپنا کہیں اے ماہ جبیں اور — جاتا ہے کہیں اور تو جاتا ہوں کہیں اور
آخر تو کہاں کوچہ ترا اور کہاں ہم — کر لیویں یہاں بیٹھ کے اک آہ حزیں اور
میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جاتے ہی تیرے — برپا ہوئی ایک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور
تھا رہنے زمیں تنگ زبس ہم نے نکالی — رہنے کے لئے شعر کے عالم میں زمیں اور
نکلے تو اسی کوچہ سے پر گم شدہ نکلے — ڈھونڈے ہے حسنؔ دل کو تو پھر ڈھونڈہ وہیں اور

کیوں ان دنوں حسنؔ تو اتنا جھٹک گیا ہے — ظالم کہیں ترا دل کیا پھر اٹک گیا ہے

دی تھی یہ دعا کس نے مرے دل کو الٰہی — اجڑے یہ گھر ایسا کہ پھر آباد نہ ہووے

فائدہ آنے سے ایسے آ کے پچتائے ہیں ہم — اٹھ گئی جب یہاں کی گذری آ تب آئے ہیں ہم

آنے جا گہ نہ ملی اور کہیں مجھکو کیا — تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھکو کیا
میں ہوں آئینہ تو اپنا ہی تماشائی آپ — تیری آنکھیں جو مجھے دیکھ رہیں مجھکو کیا
تم تو لڑ بھڑ کے حسنؔ یار سے بس ایک ہوئے — مفت میں میں نے یہ باتیں جو سہیں مجھکو کیا

دور سے باغ جہاں دکھلا کے دیوانا کیا — متصل جانے نہ پایا میں کہ ویرانا کیا

دیکھتے ہی مے کے ساغر کا نہ کھینچا انتظار	مارے جلدی کے میں اپنا ہاتھ پیمانا کیا

کب قفس میں میں انھیں دیکھ پکارا نہ کیا	ہمصفیروں نے پر ادھر کو گذارا نہ کیا
تا اشارہ کو سمجھنے نہ لگے غیر کے وہ	میں نے اس ڈر سے کبھی اسکو اشارا نہ کیا

ابتدا حسن کی اُس کے اور نئی تیری چاہ	ہائے کیا دن تھے حسن اور زمانہ[1] کیا تھا

(۲) حیران

میر حیدر علی حیران اصلش از شاہجہاں آباد است و عمرش در پورب گزشتہ واز بسکہ اوقاتش صرف معاشِ دنیاداری شدہ و می شود۔ اکثر در مشاعرہ بہ ہنگام خواندن غدر کم مناسبتیٔ طبع بہ شعر علیٰ رؤس الاشہاد کردہ والحق کہ دروغ نباشد چرا کہ ایں فنِ شعر بے تعلقی بسیار می خواہد۔ الغرض تا ایں ہمہ حتی المقدور در تلاشِ معنی بیگانہ دارد و مزاج حریفانہ وظریفانہ۔ قطعۂ آخرِ غزلش ضرب المثلِ اکثر سامعان است۔ و وضعِ خواندنش نیز اگرچہ پسندِ فقیر نہ آمدہ۔ بشاگردی رائے سرب سکھ دیوانہ تخلص کہ بندہ احوالش مفصل در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام مشہور است و بگمانِ خویش شاعری خود را مغز در۔ مرد سپاہی پیشہ است از چندے در سرکارِ راجہ ٹکیت رائے در سواران عزو امتیاز دارد و بندہ اورا در لکھنؤ دیدہ ام ازوست۔

دم نکلتا ہے اب کوئی دم میں	بیٹھ جا کچھ نہیں رہا ہم میں

کل جو حیراں کو میں دیکھا روتے	بن گئی دو کھنی کی گھات مری

---

(۱) اور وہ زمانہ (ن خ)

اُن کی خدمت میں ادب سی میں نے　　عرض کی دیکھی کرامات مری
میں نہ کہتا تھا کہ دل آپ نہ دیں　　بندگی قبلۂ حاجات مری

کیا اک خلق کو اُن ابروُں نے قتل ای حیرآں　　کہاں جاتا ہی وہاں تلوار پہ تلوار پڑتی ہی

صفِ مژگاں سی اس کی جب تب دل جا اٹکتا ہی　　سمجھتا ہی نہیں ہر چند حیرآں سر پٹکتا ہی
وہ کیا تجھ میں نہیں جو دیر و کعبہ میں ہی تبلا تو　　عبث کیوں لے دل بیہودہ تو در در بھٹکتا ہی
جلا جاتا ہوں حیرآں آتشِ عشقِ نہانی سی　　گھُنا جاتا ہی دل اور جی سینہ آسا چٹکتا ہی

(۳) حسن

خواجہ حسن حسن تخلص ابن خواجہ ابراہیم نبیرۂ حضرت خواجہ کہاری[۱] قدس سرہ العزیز از فرزندان خواجہ مودودِ چشتی درویشی است. صوفی مذہب اکثر مسائل صوفیہ ہا را کہ مراد از وحدت وجود باشد بدلائل و براہین چنانکہ شیوۂ صوفیان با فضل و کمال است از روئے نص[۲] وحدیث باثبات رسانیدہ[۳] و در ریختہ موزوں ساختہ و دیوان ضخیم ترتیب دادہ - پیش ازیں در بریلی استقامت داشت و بعد ازاں در فیض آباد حالا در لکھنؤ، نواب وزیر وصاحب عالم بسیار عزت وحرمتش می کند. مشورہ بہ شعر در ابتدا بہ میاں جعفر علی حسرت کردہ ونیز بہ قلندر بخش جرأت دوستی داشت. از بسکہ باوجود ایں ہمہ بزرگی شوخ طبع وظریف مزاج و تماشا دوست واقع شدہ سرے بہ نسوان ہم دارد و قدم در راہ طلسم و شعبدہ بازی نیز می گذارد. و در مقطع ہر غزل آوردن لفظ بخشی را کہ نامِ محبوبۂ اوست سکون بخشی میداند فرق تخلص میر حسن و ایں بزرگ بر ہوشمنداں[۴] از وضع کلام اش پیدا است - از وست -

---

(۱) کماری (ن خ) (۲) فقہ وحدیث (ن خ) (۳) نسخہ خ میں "و" نہیں ہے - (۴) دانشمنداں (ن خ)

جھٹک کے ہاتھ سے دامن خفا جو یار ہوا
تو وو ہیں پیرہنِ صبر تار تار ہوا

یہ دوستی نے حسن بخشی اُس(۱) کی کچھ تاثیر
کہ دشمن آج ہر اک اپنا دوستدار ہوا

کونسا نقصان اس میں آپ کا ہو جائے گا
اس طرف ٹک مڑ کے دیکھو گے تو کیا ہو جائیگا

جاؤ گے گر جان بخشی کو حسن کی نزع میں
کیا بُرا ہے اک بچارے کا بھلا ہو جائیگا

جس جا کہ نہ بنتی تھی کبھی بات کی صورت
ٹھہری پھر اُسی گھر میں ملاقات کی صورت

کہتے ہیں جسے ہجر کی شب سخت بلا ہے
یارب نہ دکھانا مجھے اُس رات کی صورت

کس رنگ ہے شیشہ میں جھمک دخترِ رز کی
ٹک دیکھیو اس کافرِ بدذات کی صورت

جان بخشی کر حسن کی نزع میں آکر شتاب
ورنہ یہ ارمان اس کو لے بتاں رہ جائیگا

آئینہ دیکھ کے حیراں جو ہوا اتنا تو
ہم تو تھے محو ترے تو نے بھلا کیا دیکھا

وہ تو آیا تھا تماشے کو مرے نزع کے، پر
میں نے اُس وقت میں بھی اسکا تماشا دیکھا

پہنچا تھا ہاتھ چوری سے رات اُسکے پاؤں تک
پر میرے بخت خفتہ نے اس کو جگا دیا

کوچہ میں اپنے دیکھ مجھے بول اٹھا وہ شوخ
میرا گھر اس دِوانہ کو کس نے بتا دیا

بخشی حسن یہ لذتِ غم اس کی یاد نے
راحت کا جو مزا تھا سو ہم نے بھلا دیا

اشک اس کو نہیں سمجھتے ہم
جس میں لختِ جگر نہیں آتا

(۱) اس کی بخشی کچھ تاثیر (ن خ)

یہ ظرف تیری کرم بخشی سے مرے صاحب   حسن نبیرۂ خواجہ کہار[1] نے پایا

(۴) حسرت

جعفر علی حسرت خلف الصدق ابو الخیر عطار کہ دکانِ عطاری در لکھنؤ متصل اکبری دروازہ چیدہ جوانِ خوش خلق و حلیم و سلیم واقع شدہ۔ از مدتِ بسیار مشقِ سخن می کند۔ شاگردان بسیار بہم رسانیدہ۔ فقیر اورا در مشاعرہ ہائے لکھنؤ دیدہ تا ایں مدت معاش بہ پیشۂ شاعری بسر بردہ۔ آخر آخر چندے[2] در سرکارِ صاحب عالم مرزا جہاندار شاہ ہم عز و امتیاز داشت چوں پدرش جہانِ فانی را پدرود کرد نوکریِ صاحب عالم گذاشتہ خود بجائے پدر دوکان نشیں گردیدہ بود کہ یک ناگاہ بہ ایمائے بزرگے خرقۂ درویشی پوشیدہ و ترکِ لباس دنیائی کردہ کنجِ عزلت اختیار نمود۔ شعرائے ایں دیار اورا از اول بہ استادی قبول کردہ اند۔ در قصیدہ و غزل[3] یدِ طولیٰ دارد و خود مشورۂ شعر بہ رائے سرب سکھ دیوانہ کردہ، چوں الحال شانش مقتضیِ اقرار نمی شود قدری منحرف است۔ چندیں شعر ازو نوشتہ شدہ۔

زخمی بے شمار ہے تیغ جفائے یار کا   کس سے کہوں ہیں جا کے آہ حال دلِ فگار کا
گر ادھر[4] آئیے تو ایک صیدِ ضعیف یاں بھی ہے   ہم نے سنا ہی تم کو ہے شوق بہت شکار کا
یار سے دوریوں ہیں بھینک دیا ہے غضب   ہم نے کیا تھا کیا گناہ گردش روزگار کا
روتے ہی اسکو گذرے ہے ہجر میں تیری رات دن[5]   حال[6] میں کیا کروں بیاں حسرتِ بیقرار کا

کس کی نگہ کا تیر لگا آہ کیا ہوا   تڑپے ہے دل مرا اسے اللہ کیا ہوا

---

(۱) کہار (ن خ) کمار (ن ر) (۲) "چندے" ندارد (ن خ) (۳) غزل وغیرہ (ن خ)
(۴) گر ادھر آئے تو لو ایک الخ (ن خ) (۵) روز و شب (ن خ) (۶) حال بیاں میں کیا کریں (ن خ)

کوئی دم کی بات ہے کہ نہ تھا بے قرار دل
کیا آفت اس پہ آگئی ناگاہ کیا ہوا

حسرت کا حال پوچھے اگر یار لے صبا
کہیو کہ دردِ ہجر سے رو رو کے مر گیا

بیاں کیا کیجے اُس سروِ رواں کے قد و قامت کا
بلا ہے آفتِ جاں ہے نمونہ ہے قیامت کا

ہوا کل پانی پانی دیکھ اے رشکِ چمن تجکو
نہیں شبنم عرق ہے گل کے چہرے پر ندامت کا

ترے لب کے ہلانے میں جو پیارے جی نہ اُٹھتا میں
نہ ہوتا معتقد ہرگز مسیحا کی کرامت کا

بادِ خزاں تو باؤ ہے یا تیغ آبدار
گلشن کا ہر شجر ترے آتے ہی چھٹ گیا

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

فلک اک دم بھی تو نے وصل کی شب کو نہ ٹھہرایا
یہ ساری عمر میں تجھ تک ہمارا کام آیا تھا

بہاریں بھول گئیں پر یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی(۱) اک ہنگام آیا تھا

نہیں معلوم کیا تھا جو سحر تک شمع رویا کی
کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

ہوا لبریز جامِ زندگی جس وقت اے حسرت
دریغ اس وقت میں ساقی پلانے جام آیا تھا

حسرت نے تیرے ہجر میں رو رو کے جان دی
بے رحم اس کے مرنے کا تجھ کو بھی غم ہوا

تجھ بن ہے اس طرح سے مرے دل کو اضطراب
ہوتا ہے جس طرح کسی بسمل کو اضطراب

دل دیکھتے ہی خنجرِ مژگاں سے بھر گیا
ہوتا ہے سخت جنگ میں جاہل کو اضطراب

---

(۱) یہی بجائے "بھی اک" (ن خ)

آشیاں چھوڑ چلے اے چمن آرا ہم تو — توہی لیجا ئیو سر پر یہ گلستان اُٹھا

آخر ترے غم میں مر گئے ہم — بھرنا تھا جو دُکھ سو بھر گئے ہم
کل روتے ہوئے جو اتفاقاً — حسرت کے مزار پر گئے ہم
پڑھتا تھا یہ شعر وہ تہ خاک — بس سنتے ہی جس کے مر گئے ہم
واماندوں پہ دیکھئے کہ کیا ہو — اپنا تو نباہ کر گئے ہم

کسے منظور تھا یوں تلخ کیجے زندگانی کو — ولے کیا کیجے حسرت بلائے ناگہانی کو
بصد خون جگر یک قطرہ مژگاں تک پہنچا ہے — نہ دے بربادیوں اے چشم اشک ارغوانی کو

تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا — کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کو

جوں لالہ بہار کر رہا ہے — یہ سینۂ داغدار اپنا

ساربان محمل لیلیٰ کو اُدھر ٹک لے چل — خاک مجنوں کی بھٹکتی ہے بیاباں کے بیچ

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے — لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے
دل لینے کو اوروں سے بھی کہہ دیکھو بھلا کچھ — لاویں گے بجا ہم تو جو ارشاد کروگے
بے خوابی و حیرانی و طغیانیٔ گریہ — سب آنکھوں پہ ہم لیں گے جو امداد کروگے
تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر آگے — کیا خاک ہے مجھ میں جسے برباد کروگے
کہدیجو صبا ٹک تو جوانانِ چمن سے — فرصت ہے کسی دل کو اگر شاد کروگے

پانی کریں پتھر کو بھی حسرت کی یہ آہیں
دل اپنا بتاں کب تئیں فولاد کروگے

ہر آن میں مژگاں پہ لختِ جگر تازہ
یہ نخلِ محبت کا دیکھا ثمرِ تازہ
ہر دم دلِ سوزاں کا احوال ہے کچھ کا کچھ
جو قاصدِ اشک آیا لایا خبرِ تازہ

کوڑیوں کے مول بیچا مصر میں تو نے فلک
ہائے اس یوسف کو جو تھا سارے کنعاں کی نشاط[1]

ترے سامنے ہو یہ دل جان کیا ہے
غضب ہے بلا ہے تری آن کیا ہے
کہا کرتے ہیں پھر نہ ملئے گا اُس سے
پر اس سے نہ ملنے کا امکان کیا ہے

(۵) حجام

عنایت اللہ حجام، مولدش قصبۂ سہارنپور[۲] است از مدت مدید در شاہجہاں آباد پیشہ سر تراشی با متیاز بسر می برد یعنی از بازار گردیدن و بر دوکان نشستن مثل سر تراشان دیگر عار کلی دارد و ہمیشہ خانہ نشین می باشد۔ چوں طبعش از ابتدا موزوں افتادہ بود با وجود کم علمی شعر بندی را بخوبی سرانجام می دہد و معنی ہائے[۳] نازک تر از موئے می یابد، چنانکہ در اکثر مشاعرہ ہا موردِ تحسین و آفریں یاران بودہ۔ و در مقطع ہر غزل رعایتِ پیشۂ خود را از واجبات می شمارد و سامعان را بداں محظوظ می کند۔ وضیع و شریفِ شاہجہاں آباد او را بسیار دوست می دارند۔ ازیں جہت ہمیشہ[۴] فخر شاگردیِ مرزا رفیع سودا می کند۔ و فخر دیگرش اینکہ دست بیعت بہ سلسلۂ چشتیہ پیشِ قدوۃ الاولیا و زبدۃ الاصفیا مولوی فخر الدین صاحب گزاشتہ، در حین

---

(۱) بساط (ن خ) (۲) لکھنؤ کے نسخے میں یہ لفظ نہیں ہے۔ (۳) معنی ہائے تازہ (۴) ہمیشہ ندارد (ن خ)

حیاتِ آں بزرگ اکثر بہ اصلاحِ خطِ مبارک وبستنِ خضاب درتعطیلین یعنی روز سہ شنبہ وجمعہ حاضر می شد وازاں زماں کہ ایں سعادتِ عظمیٰ ازصحبتِ کیمیا خاصیتِ ایشاں حاصل کردہ بود قامتِ حالِ خود را بلباس مشائخانہ یعنی پیراہن وتاج آراستہ دارد ہم ازیں جہت درمحلہ شاہجی گفتہ می شود ودرمجلسِ سماع ہمیشہ درو جد وحال شریکِ یاران است و یکے ازنظر کردہ ہائے آں وحیدِ زمان است بافقیر ازمدتے آشنائی داشت وبسیار بعجز پیش می آمد۔ عمرش تخمیناً ازسی وپنج متجاوز باشد[1]۔ شش سال شدہ کہ درشاہجہاں آباد درگزشتہ ازوست ۔ طرحِ مشاعرہ فقیر در دہلی ۔

ہردم نظر آتے ہیں نئے یار تمہارے ۔۔۔ ہم جی چکے گر ہیں یہی اطوار تمہارے
اک روز نصیبوں سی کہیں وہاں تئیں پہنچوں ۔۔۔ پھر سر ہے مرا اور در و دیوار تمہارے
ہے دل میں کہ اک روز ان آنکھوں سے یہ پوچھوں ۔۔۔ جیتے نہیں کس واسطے بیمار تمہارے
اُس شوخ کے کوچہ میں نہ جایا کرو حجام ۔۔۔ چھن جائیں گے اکدن کہیں ہتھیار تمہارے

فلک کے جور کے مارے ہوؤں سی یہ کوئی پوچھے ۔۔۔ کہ ہو زیر زمیں بھی دکھ میں یا آرام کرتے ہو
رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی ۔۔۔ بلا حجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو

روز رخسار کے لیتا ہے مزے خوبوں کے ۔۔۔ بہتر اس سے کوئی حجام ہنر کیا ہوگا

اب تو حجام شیخ کی داڑھی ۔۔۔ تا بہ موئے زہار گذری ہے

بسانِ ناقۂ لیلیٰ کے اک دو گام غلط ۔۔۔ خدا کرے کہ ادھر بھی ترا سمند کرے

---

[1] بود دن خ

حجام مرِ پڑا سخت حیا ناک کے پالے | کچھ اور تو کیا بات کہ وہ منہ سی نکالے
لگ چلتا ہوں اس شوخ سے رستہ میں تو مجکو | جھنجلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رجالے

دیکھ عاشق کی ترے رسوائیاں | عشق کی یاروں نے قسمیں کھائیاں

(۶) حزیں

از نامش خبر ندارم از دورِ فردوس آرامگاہ کسی خواہد بود سہ شعرش از عالم کتب نشینی بیاد ماندہ است

اس بیوفا کے عشق میں کچھ ہم کو حس نہیں | پاؤں تلک بھی اُس کے ہمیں دسترس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یہاں تلک کہ ہم | چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں
اس فصلِ گل میں کیوں نہ گریباں کو کیجے چاک | جاتی ہے یوں بہار حزیں ہائے بس نہیں

(۷) حیرت

میر مراد علی حیرتؔ، وطنش مراد آباد است فقیر او را در آوانِ آبادی کٹیھر رو ہیلے در آنولہ دیدہ بود ۔ شعر را بہ پاکیزگی می گفت در ہماں ایام شنیدم کہ بطرف کوہ برائے کارے حسب ایمائے رئیسے رفتہ بود کہ آفتابِ زندگیش در ہماں کوہ رو بغروب نہادہ از وست ۔

نظر آیا یہ جہاں نقش بر آب آخر کار | تاج سر پر سے گرا مثلِ حباب آخر کار
سادہ رویوں کی ولاہمر وفا پر مت بھول | منہ یہ دیویں گے تجھے صاف جواب آخر کار

بجھ کے دیکھا تو بجا ہے سب گلا دل کا | کہ چشمِ ترنے ڈبویا معاملہ دل کا

یہ اشک و آہ ہی شورِ جنوں ہی وحشت ہی — عجب جلوس سی جاتا ہے قافلہ دل کا

یہ قافلے یاروں کے اگر کہیں ٹھیری ہیں — آواز جرس کم ہی یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

(۸) حاتم

شیخ ظہورالدین حاتم کہ شاہ حاتم گفتہ می شد، مولدش شاہجہاں آباد است۔ تاریخ تولدش بقولے از حرف ظہور می آید۔ ہمیشہ عمدہ معاش بودہ و اوقات[۱] بخوبی گزرانیدہ مرد سپاہی پیشہ از ہندوستان زایان قدیم بود۔ روزے پیش فقیر[۲] نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبانِ خرد و بزرگ جاری گشتہ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاشِ مضمونِ تازہ می دادیم۔ غرضکہ از شعرائے متقدمین است۔ در ایامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد طرح مشاعرہ انداختہ اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانۂ سابق خود را می ستود۔ الحال کہ در دورۂ ما زبانِ ریختہ بسیار بہ پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشارٌ الیہ ہم مرتبۂ[۳] سخن تازہ گویان فہمیدہ دیوانِ قدیم خود را از طاق دل افگندہ دیوانِ جدید بزبان ریختہ گویانِ حال ترتیب دادہ و دیوان زادہ نامش گزاشتہ اما بسبب طوالت عمرِ بعض مردم و در دست راکہ اشتباہ حاتم دوم می افتاد برطرف کرد و بحور[۴] اشعار را ہم جدا جدا از سرخی بر سر ہر غزل نوشتہ و ایں ایجادِ اوست۔ و ازینکہ در درازیِ عمر و قدامت شعر از ہمہ بیشتر است۔ نغمہ سنجانِ حال وضیع و شریف او را استاد مسلم الثبوت میدانند بلکہ او خود اسامیِ کسانیکہ از اول تا آخر استفادۂ شعر از و گرفتہ

---

(۱) اوقات را (ن خ)۔ (۲) فقیر آمدہ (ن خ)۔ (۳) و تیرہ (ن خ) (۴) بحر (ن خ)

اند۔ بر دو سہ ورق بطریق فہرست بر پشتِ سر لوحِ دیوانِ خود نوشتہ چسپانیدہ تا معلوم کسان گردد کہ حاتم ایں قدر شاگرد داشت و درآنجملہ اسم مرزا رفیع سودا اسم کہ باتفاق ہمہ یکے از سرآمدِ شعرائے ہندی گویانِ ایں دیار گزشتہ مسطور است والحق کہ دروغ نیست ۔ قیاس استادیش ازینجا باید کرد و نیز بنابراں میر محمد تقی میر کہ شاعرے است جادو کار اکثر او را در مشاعرہ بطریق ظرافت واہ الشعرا می گفت۔ چوں دو چار جز و مسودۂ شعر فارسی ہم بطور رسائب داشت لہٰذا بیشتر ازیں در تذکرہ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ۔ عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود و سہ سال است کہ در شاہجہاں آباد ودیعت حیات سپردہ خدایش بیامرزاد۔ از وست۔

مضمون خط کو دیکھ ترے ہم بہت ڈرے ۔۔۔ جتنے مسودے تھے رہے طاق پر دھرے
پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر ۔۔۔ سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

رات میں خواب میں اُس زلف کو پیچاں دیکھا ۔۔۔ صبحدم حال دل اپنے[1] کا پریشاں دیکھا
نظر آئے ترے دنداں مسّی آلودہ ۔۔۔ رات اور دن کو بہم دست و گریباں دیکھا
کعبہ و دیر میں حاتم بخدا غیرِ خدا ۔۔۔ کوئی کافر نہ کوئی ہم نے مسلماں دیکھا

تو صبحدم نہ تھا بے حجاب دریا میں ۔۔۔ پڑے گا شور کہ ہے آفتاب دریا میں

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں ۔۔۔ دور ہو پہلو سے صحبت کے مری قابل نہیں
عکس ہے یہ خونِ عاشق کے فلک پر شفق ۔۔۔ یہ تماشا ہے کہ رنگیں دامن قاتل نہیں
کس کو ٹانکے دیجئے اور کس کا مرہم کیجئے ۔۔۔ کون ہے جو تیغ کا تیری میاں گھائل نہیں

---

(۱) کو (ل۔خ)

خوش حال اُن کا جن کو ہوئی رخصت چمن　　ہم جھانک جھانک رخنۂ دیوار رہ گئے

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو　　اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
دل تو چاہِ زنخ میں ڈوب موا　　آشنا تھا غریق رحمت ہو
مفلسی اور دماغ اے حاتم　　کیا قیامت کرے جو دولت ہو

مجھے تو دیکھ کر کیا تک رہا ہے　　ترے ہاتھوں کلیجہ پک رہا ہے
خدا کے واسطے اس سے نہ بولو　　نشہ کی لہر میں کچھ بک رہا ہے

(۹) حشمت

محتشم علی خاں حشمت پسر میر باقی اصلش از شاہجہاں آباد است. شعر فارسی را بسیار بہ لطافت می گفت و گاہ گاہے خیالِ ریختہ ہم داشت ۔ ایں مطلع دلیل بر لطافتِ طبع اوست.

نگہت گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ　　پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

گور کے سوتے دِوانوں کو جگاتی ہی بہار　　شور ہی غل ہی قیامت مست آتی ہی بہار
حشمت اپنا اور دکھ تو اس برس ظاہر ہی کہ　　ہم سنے کی ہی تو یہ اور دھومیں مچاتی ہی بہار

(۱۰) حیف

میر چراغ علی حیف شاگرد میر شیر علی افسوس، جوان خوش خلق و باتواضع است ایں چند اشعار ازوست ۔

ملنے بھی نہ پائے اُس جواں سے　　حسرت زدہ ہم چلے جہاں سے

گو آپ نہ آئیے ولیکن — اقرار تو کیجے زباں سے
کافی ہے ترا ہی دید[1] ہم کو — کیا کام بہار[2] و بوستاں سے
ہی دورِ شراب بسکہ ساقی — ڈرتا ہوں میں دورِ آسماں سے
اے راہروِ مری زبانی — کہنا یہ پیام کارواں سے
رستے میں تھکا ہوا پڑا ہے — اک شخص تمھارے ہمرہاں سے
کیا پوچھے ہی حیف کی حقیقت — ناشاد گیا وہ اس جہاں سے

وہ مہر جہاں تاب اگر بام پر آوے — تابندگیِ نیّرِ اعظم نظر آوے
کہتا ہے اسے بال کوئی کوئی رگِ گل — کچھ میں بھی کہوں تیری کمر جو نظر آوے
ہر اپنے تو نزدیک وفا خوب[3] ولیکن — ہو خوب جو تیری بھی طبیعت اُدھر آوے

(۱۱) حضور

لالہ بال مکند حضور تخلص شخص کہنہ مشق است۔ ہمیشہ در مشاعرہ ہائے شاہجہاں آباد حاضر می شد۔ حلقہ شاگردیِ خواجہ میر درد بگردن دارد و فقیر اور ایک دو بار در لکھنؤ ہم دیدہ۔ نقل است کہ روزے در شاہجہاں آباد بخانۂ لطف علی خاں ناطق مشاعرہ بود غزل طرحیِ میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف اور معنی طرف تقرر داشت۔ و ازیں جہت بعضی از فصحا اور را خلافِ اردو شمردہ پیرویش نکردند[4] و اکثرے اطاعت استادیش کردہ اشہب فکر را در میدانِ خیال دوانیدہ۔ مشارٌ الیہ کارے کردہ کہ پیش ہر دو گروہ خفت عقلش عاید حال نگشتہ یعنی در آں غزل طرحی شعرے طرفہ خواندہ و آں اینست

رکھتا ہوں میر صاحب و قبلہ سے میں سند[5] — یہ جانتا نہیں کہ زباں ہی کہاں کی اور

---

(۱) مجھ کو (ن خ)، (۲) واو ندارد (ن خ)، (۳) لطف (ن خ)، (۴) نہ کردہ بودند (ن خ)، (۵) یہ سند (ن خ)

وفا کو تم جفا سمجھے، ستم کو ہم کرم سمجھے
اُدھر کچھ دل میں تم سمجھے اِدھر کچھ دل میں ہم سمجھے

چلے ہو تم جواب اُس بت سی ساز کرنے کو
حضور پاس بھی کچھ ہے نیاز کرنے کو

حکیم (۱۲)

محمد پناہ خاں حکیم کہ پیش ازیں نثار تخلص میکرد و حالا از چندے تبدیل تخلص کردہ بجائے نثار حکیم قرار دادہ ولد سید محمد شریف خاں الک بخش یقولش سید صحیح النسب است از حضرت ظل سبحانی در سنہ ستہ بخطاب خانی و منصب ہزاری سرفراز شدہ - جوان خوش خلق و خوش اختلاط و عاشق پیشہ و دل بدر در سیدہ دیدمش تا کہ در شاہجہاں آباد اقامت داشت اکثر در مشاعرہ ہا مُی آمد - بلکہ در سفر لکھنؤ با فقیر ہم سفر و ہم قافلہ بود - باز بہ شاہجہاں آباد رفت و باز گردید - در علم موسیقی و عمل تکسیر و عبور کتب تواریخ و طب و سیر و دواوین اساتذہ و تذکرہ ہائے سلف یگانہ روزگار است - از آنجاکہ بہ شاگردیِ خواجہ میر درد نسبتی دارد شعر رندانہ می گوید و تلاش عاشقانہ می کند - از وست -

یہ دل کیا ہے جو تیرے قربان جاوے
سعادت ہو اپنی اگر جان جاوے
خلل شیخ نے ہم میں آ کر کیا ہے
الٰہی یہ مجلس سی شیطان جاوے
حکیم اُس کے کوچہ میں پوشیدہ جانا
مبادا کوئی تجھکو پہچان جاوے

پوچھتے کیا ہو حکیم جگر افگار کا گھر
ایک تکیہ سا ہو اس شوخ کی دیوار کے پاس

یہ کیا ہے آپ بھی شاید کسو کو چاہیں ہیں
کہ اشک نکلیں ہیں آنکھوں سی ہر دم آہیں ہیں

واشد سی جو گویائی پہ وہ غنچہ دہن تھا — گل جھڑتے تھے ہر بات میں یہ لطفِ سخن تھا
پامالِ جو تم کرتے ہو دل ایسی روش سے — اے سرو قد اس آگے بھی کیا یوھیں(۱) چلن تھا
خوابیدگیٔ طالع کہوں کیا کہ شبِ وصل — میں قصۂ دل کہتا تھا وہ نیند میں غن تھا
کیونکر نہ جلے حال پہ دلّی کے دل اپنا — یارو یہ خرابہ کبھی اپنا بھی وطن تھا

گرفتار(۲) اس کے ہر مو میں دل گبر و مسلماں ہے — یہ کھلایا ہوا سنبل ہے یا زلف پریشاں ہے

آنکھوں سے لختِ دل یوں آنسو نکالدے ہے — مردے کو جس طرح سے پانی اچھالدے ہے

تیرے لئے خلق در بدر ہے — اے خانہ خراب تو کدھر ہے
یہ کیونکہ کہوں کہ آئیے یہاں — تشریف جو لائیے تو گھر ہے
جو اس کے ستم اٹھائے ہے تو — تیرا ہی حکیمؔ یہ جگر ہے

نہ ہم ہی غم سے جل اس شعلہ رو کے خاک ہوئے — اجل رسیدہ ہزاروں یوں ہی ہلاک ہوئے
ہے رشکِ دستۂ گل کیوں یہ آستیں تیری — سرشکِ خون تبا کس کے اس سے پاک ہوئے
بہت دنوں میں ملاقات ہوئی جو اس سے حکیمؔ — سنیں تو ہم بھی کہ کیا کیا بہم تپاک ہوئے

جمعیتِ عالم ہے رہنے میں بندھی جس کے — آفت ہو اگر یارو وہ زلف پریشاں ہو
کہتے ہیں حکیمؔ آیا میخانہ سے مسجد میں — ہم کو تو تعجب ہے وہ گبر مسلماں ہو

---

(۱) "یہی" بجائے یوھیں (ن خ)، (۲) ن خ میں یہ شعر فاضل ہے۔

دے چین ٹک تو جان کو جوشِ شکست رنگ   خاطر پہ یہاں گراں ہی خروشِ شکست رنگ

جی ہی جانے کی یہ علامت ہی   دل کا لگنا نہیں قیامت ہی
ہم تو کیونکر کہیں کہ بوسہ دو   گر عنایت کرو کرامت ہی
دو رمت کیجے حکیم کے تئیں   اس کو مشفق بڑی قدامت ہی

ملکِ عدم کے یاروں کا احوال نہ کچھ دریافت ہوا
پوچھی خبر کہلا بھی بھیجا سینکڑوں آتے جاتوں سے

(۱۳) حقیقت

میر شاہ حسین المتخلص بہ حقیقت شاگرد جرأت وطن اجدادش بلخ وخوست است وخود در بریلی تولد یافتہ و بہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ۔ یکے از اجدادش بہ تعلیم کودکانِ نواب محبت خاں اشتغال دارد، غرضکہ ملازادہ وخوستی بچہ است پیش ازیں در ترک سواران نوکر بود در آں روزہائے امردی ونو مشقی اکثر بہ کتابتہائے غزلہائے اُستادِ خویش کہ بہ سبب کوری از نوشتن معذور است مصروف می ماند۔ چوں رسالۂ ایشاں برہم خورد امام بخش خاں کشمیری کہ باوصفِ جاہلی از مدتے خیال جمع کردن اشعارِ اساتذہ در سر داشت روزے از جرات درخواست شخصے کرد کہ ہم بہ تعلیم کودکان متوجہ شود وہم بہ نوشتن تذکرہ مصروف باشد۔ مشارٌ الیہ او را آوردہ روبرو کرد ومنت بر طرفین گزاشت۔ غرضکہ حسب الاشارہ مومی الیہ و بہ پشت گرمی کور موصلی کہ بہمسریِ من می میرد و در باطن ہمیشہ تخمِ کینہ می کارد او ہم تذکرہ نوشتہ درست ساختہ است[1] اما

(۱) "است" ندارد (ن خ)

ظرفہ اینست کہ خان مذکور پیش ازیں روزی بر مکانِ فقیر آمدہ بالحاحِ تمام مسودۂ خام تذکرہ مرا کہ دریں مدت بہ ہیچ کس نہ نمودہ بودم از من طلب نمود۔ من سادہ دل غافل از فطرت وبدذاتیِ کشمیریان سابقہ معرفتِ شاہجہان آباد آدمیت را کار فرمودہ اجزائی مسودۂ تذکرۂ خود را حوالہ کردم۔ درعرصہ یک دو روز خفیہ از من اشعار واحوال شعرائے دہلی وغیرہ کہ من بہ محنتِ تمام آنہارا بہم رسانیدہ بودم از دست حقیقت بے حقیقت نقل کنانید و دیگر بیاض وجنگ(۱) مرزا جہاندار شاہ کہ بعد فوت ایشاں پیش او ماندہ بود چیزے از و چیزے از جائے دیگر اخذ نمودہ ہر گاہ مسودۂ تذکرۂ بے مغز ش کہ آنرا ہیچ دانا نہ پسند د فی الجملہ صورت گرفت۔ روزے یکے از آشنایان جزو اول آں مجموعہ آوردہ بمن نمود غافل ازیں مقولہ کہ گفتہ اند۔ شعر۔ پنیر آب دادن نشاید بہ میش + کہ بیند درو قطرۂ خون خویش۔ چوں درو نظر کردم دیدم کہ ہمیں تخلص آفتاب و آصف بطور تذکرۂ من در(۲) و نوشتہ است۔ بسیار برہم شدم و تفحص احوال کردم۔ مشار الیہ حقیقت تذکرہ نویسانیدن امام بخش خاں بگوش من رسانیدہ اگرچہ مرا در بادی النظر(۳) از حرکت ایں اصحاب(۴) ثلاثہ آزردگی کمال بہم رسیدہ بود(۵) قریب بود کہ ہجو از من سر زند اما چوں بعبارت پوچ و غلطیِ احوال و اشعار شعرا کہ درآں جریدہ سمت تحریر یافتہ نگاہ کردم آسودہ شدم و درگزشتم و برہمیں قطعہ طبع زاد خود و یک بیت مولانا نظامی اکتفا کردم

قطعہ

جانتے ہیں سب کہ اک مدت سے یہاں — مصحفی کے تذکرہ کا شور ہے
تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا — بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

---

(۱) "جنگ" بجنسہ (ن خ)، (۲) "درو" ندارد (ن خ)، (۳) ازیں حرکت بجائے از حرکت (ن خ)، (۴) "ایں اصحاب ثلثہ" یہ عبارت ندارد (ن خ)، (۵) "بود" ندارد (ن خ)

اگر بر فروزی چو مہ صد چراغ
زخورشید باشد بر و نامِ داغ

غرضکہ جائے علی قلی خاں خالی است۔ از وست۔

کس کے ہیں انتظار میں آنکھیں
جو کھلی ہیں فراز میں آنکھیں

نہ خفا ہو جو تک رہوں پیارے
کہ نہیں اختیار میں آنکھیں

کیا ترے عشق میں لے عربدہ جو ہاتھ لگا
زیست سے ہاتھ بھی دھویا پہ نہ تو ہاتھ لگا

ہجر میں کیوں نہ کروں یاد ملاقات اسکی
کہ بہلتا ہے ذرا وصل کی تقریر سے دل

سخت اس کا ہو تعجب کہ حقیقت اُس کا
نرم ہو جائے مری آہ کی تاثیر سے دل

غم عشق دل کو جلائے گیا
اک آتش سی تن میں لگائے گیا

حقیقت وہ کھینچے جدھر تیغ تھا
اُدھر میں بھی سر کو جھکائے گیا

حرف الخا

(۱) خاکسار

میر محمد یار خاکسار تخلص کہ الحال بہ شاہ خاکسار شہرت دارد درویشی است قلندر وضع و آزاد منش در شاہجہاں آباد متصل قدم شریف در چوراہہ می باشد فقیر او را گاہ گاہے از دور دیدہ۔ عالی دماغی از بشرۂ او جلوہ ظہور میدہد۔ از ہندی گویان قدیم است۔ گویند کہ میر تقی میر در عالم شباب منظور نظر او بودہ۔ چوں زبان خوشی دارد چند اشعارش از تذکرۂ میر حسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نوشتہ شد۔ از وست۔

تیغ قاتل سے رہے محروم بے تقصیر ہم رُوزِ محشر کے اٹھیں گے گورسے دلگیر ہم

قیامت بھی ہوگی تو میری بلا سے مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے
شانہ اُس پر نہ کیجیو حجام تار اُس زلف کا رگِ جاں ہے

رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی اس خانماخراب کو چپکا[1] خدا کرے

(۲) خلق

میر احسن خلق خلف میر حسن صاحب، جوانے است خوش ظاہر و با علم و حیا بمقتضائے موزونی طبع کہ موروثی است کم کم خیالِ شعر می کند و از نظر پدر بزرگوار خود میگذراند۔ عمرش تا امروز نوزدہ سالہ است۔ از وست۔

دل میں تھا آتے ہی اُسکے جائیں لگ آغوش ہم جب وہ آیا سامنے تب رہ گئے خاموش ہم

عجب عالم میں بے ہوشی کے وہ مجھکو نظر آیا کہ اتنا بھی نہ آیا ہوش جو پوچھوں کدھر آیا
گلی میں اس کی میں کس کس توقع پر گیا لیکن نہ دیکھا جا کے واں اس کو تو آہِ سرد بھر آیا

دل لگاتے تو لگایا یہ نہ تھا کچھ معلوم جی پہ کیا گذرے گی اور جان پہ کیا ہووے گا
بے قراری میں کٹی رات تو یہاں اپنی تئیں چین سے زلفیں میں دل کیونکہ رہا ہووے گا

اک بار اس کے کوچہ میں جانا ضرور ہے یہ حال اپنا اُس کو دکھانا ضرور ہے

---

(۱) چُپکا (ن خ)

مدت سے تیرے طالب دیدار ہیں صنم
مکھڑے سے ٹک نقاب اٹھانا ضرور ہے

وہ ہلال ابرو نکل کر بام سے جاتا رہا
اک[1] جھلک دکھلا کے مجھکو شام سی جاتا رہا
گل کے آنے کی خبر بھی اب صبا لاتی نہیں
موسم گل شاید اس ایام سے جاتا رہا

مزا ہو وے ابھی گر وہ ادھر او دھر سے آ نکلے
کچھا یدھر سے گلا نکلے کچھا ودھر سے گلا نکلے
نہ وہ آتا ہے میرے ہاں نہ میں جا سکتا ہوں اُن تک
دل ناشاد کی حسرت کہو کیونکر بھلا نکلے

رُباعی

آئے ہیں عدم سے چپکے رُوتے ہیں پڑے
دو دن کی یہ زیست ہے سو کھوتے ہیں پڑے
لے خُلقؔ خوش احوال اُنھوں کا جو وہ
آرام سے زیرِ خاک سوتے ہیں پڑے

خلیق (۳)

میر مستحسن خلیقؔ برادر خورد میر احسن نیز از شانزدہ سالگی شوق شعر پیدا کردہ چیزے بخیال خویش موزوں می کرد و درست و نادرستش را والد بزرگوارش برائے پاس خاطر پسر درست کردہ میداد اما آنہم در عالم خوردی زیادہ از ذہنش معلوم می شد۔ چوں در آں ایام فقیر تازہ وارد ایں شہر بود مشار الیہ بعد ملاقاتِ چند بسیار محظوظ شدہ[2] برائے از دیاد بنائے خلت وودادآں عزیز را پیش من فرستادہ و آموختہ کرد کہ ایشاں دریں فن نظیر ندارند[3] اکنوں کہ فرصت وقت است تا میتوانی چیزے از ایشاں بیاموز۔ مومی الیہ انقیاد امر والد ماجد را واجب شمردہ برہنمونیِ شوق روز افزوں اکثر حاضر می باشد و مشورۂ شعر از من میگرفت۔ بندہ مناسبِ طبیعش شعر دریافتہ در ہماں ایام گفتہ بودم کہ اگر زمانہ

---

(۱) یک (ن خ) (۲) بعدِ شدہ "لفظ" بود" (ن خ) (۳) بے نظیر اند و نظیر ندارند (ن خ)

فرصت خواہد داد خوب خواہد گفت - از وست - (اشعارِ ایامِ خوردی - ر)

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم ۔۔۔ جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم
سر جھکا لیتا ہے لالہ شرم سے ۔۔۔ جب جگر کا داغ دکھلاتے ہیں ہم

اشک جو چشمِ خوں فشاں سے گرا ۔۔۔ تھا ستارا کہ آسماں سے گرا
آتشِ گل پہ جل کباب ہوا ۔۔۔ رات بلبل جو آشیاں سے گرا
شیشۂ دل تو[1] چور ہو جاتا ۔۔۔ کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا
میں نے آنکھوں سے لے لیا اُس کو ۔۔۔ پھول جو دستِ باغباں سے گرا
ہنس دیا یار نے جو رات خلیق ۔۔۔ کھا کے ٹھوکر اُس آستاں سے گرا

کہا جو میں نے اے گل کچھ وفا کر ۔۔۔ تو وہ ہیں ہنس پڑا وہ کھل کھلا کر

نزع میں گر مری بالیں پہ تو آیا ہوتا ۔۔۔ اس طرح اشک ہیں آنکھوں میں نہ لایا ہوتا
میرے خورشید نہ ہوتا یہ مرا روزِ سیاہ ۔۔۔ تو نے گر زلف میں مکھڑا نہ چھپایا ہوتا
باغِ جنت میں بھی کیا خوب گذرتی میری ۔۔۔ وہاں بھی سر پہ جو تری زلف کا سایا ہوتا
ناصحا چاکِ گریباں کے سلانے کا حصول ۔۔۔ چاک آنکھوں کا مری تو نے سلایا ہوتا
پھول پڑتا نہ خلیق آتشِ گل سے اس پر ۔۔۔ آشیاں ہم نے ٹک اونچا جو بنایا ہوتا

گر برا مانے نہ تو کہدوں کہ کیا تجھ میں نہیں ۔۔۔ اور سب باتیں ہیں لیکن اک وفا تجھ میں نہیں
بے مروت ہو تو کیا جانے تو ظالم کیا کرے ۔۔۔ اس مروت پر تو پاسِ آشنا تجھ میں نہیں

---

(۱) جو (ن خ)

کل جو جا بیٹھا میں اسکے پاس اٹھ کر ازِ خلق تنگ   رُک کے بولا آدمیت اک ذرا تجھ میں نہیں

کمر باندھی ہی ہر فندق نے تیری دلربائی پر   تصدق جان میری اس تری دست حنائی پر

حرف الدّال

---

(۱) درد

خواجہ میر درد تخلص خلف الرشید شاہ محمد ناصر مصنفِ کتاب نالۂ عندلیب در عہدِ فردوس آرامگاہ سپاہی پیشہ بود۔ آخر آخر ترک روزگار کردہ بر سجادۂ درویشی نشستہ در علم و فضل یگانۂ روزگار است۔ گاہے در تمام عمر از شاہجہان آباد با وجودِ چندیں تفرقہ کہ اہالے را ازاں دیار منیوتشاں آوارۂ اطراف وجوانب ساختہ پائے بیروں نہ گزاشتہ۔ چوں در علم موسیقی ہم مہارت تام داشت اکثر از استادانِ ایں فن بوسیلۂ بیعت حاضر مجلس او می گشتند۔ اگرچہ سلسلۂ آں بزرگ نقشبندیہ است اما واردات درد کہ نسخۂ الیست مختصر از تصنیف او برائے ہدایت مریدانِ خویش حرمتِ غنا را بطوریکہ ہست گذاشتہ باوجود[۱] دگہ گاہ گاہے مرتکب ایں امر می شد گناہِ آں بر ذمہ خود گرفتہ طلب آمرزش از ایزد بیہمال خواستہ۔ تا مرغ روشِ زمزمہ سنج باغ ہستی بود در ہر ماہ بتاریخ دوم بر مزار پدر خود مجلس غنا ترتیب میداد۔ آنروز ہمہ خورد و بزرگ شہر حاضرِ مجلس او می شدند مغنیان جابجا دست و بین نوازان بے کاسہ مست دادِ قانون نوازی و نغمہ پردازی میدادند بعد سہ پاس[۲] روز مجلس برخاست می شد۔ غرضکہ جامع جمیع فنونِ غریبہ بود و در فقر و توکل و استغنا نظیر نہ داشت۔ شمۂ بیان بے پروائیش انیکہ روزے حضرت ظل سبحانی

---

(۱) و خود کہ (ن خ)، (۲) بعد "روز" "رفتہ" (ن خ)

برائے زیارت ایشاں آمدہ بود بعد نشستن در مجلس عذر درد میان آوردہ اندکی پا را دراز ساختند۔ مشارٌالیہ از مشاہدۂ ایں حالت منغض شدہ ایں قاعدہ را خلاف معمول دانستہ خود ہم بطرف بادشاہ پا دراز ساخت۔ علم الکتاب از تصنیف او بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ و شعر ہندیش از بس شہرت تمام مشہور ہر دیار، اگرچہ شعر فارسی ہم دارد فقیر تاکہ در شاہجہاں آباد بود بعد سالی دماہی پیش آں بزرگ بے غرضانہ می رفت۔ یک سال است کہ درد مہجوریش شفا یافتہ و بہ شافی علی الاطلاق واصل گشتہ۔ از کلام اوست۔

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں　　جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں
ہر شام مثلِ شام رہوں ہوں سیاہ پوش　　ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں
اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے　　میں غمزدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

جاؤں میں کدھر جوں گلِ بازی مجھے گردوں　　جانے نہیں دیتا ہے ادھر سے نہ ادھر سے

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلا کرتا نہیں　　دل میں ہے جو وہی وفا پر جی کہا کرتا نہیں
عشوہ و ناز و کرشمہ ہیں سبھی جاں بخش لیک　　دردؔ مرتا ہے کوئی اس کی دوا کرتا نہیں

کہیں ہوا ہے سوال و جواب آنکھوں میں　　یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں　　زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

نزع میں ہوں پر وہی نالہ کئے جاتا ہوں　　مرتے مرتے بھی ترے غم کو لئے جاتا ہوں

کچھ کام نہیں وہ بتِ خود کام کہیں ہو　　پر اس دلِ بے تاب کو آرام کہیں ہو

ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں ہوں ستمدیدہ　　گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ
اے شورِ قیامت رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں　　چونکے ہے ابھی یہاں سے کوئی دل شوریدہ
اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں　　ایدھر کو نگہ کوئی پھینکو ہو تو دزدیدہ
مجھ پر بھی یہ عقدہ ٹک دے کھول صبا بارے　　زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامہ پیچیدہ
بدخواہ سبھی عالم گو ہو ویں تو ہوں لیکن　　یارب نہ کسی سے کے ہوں دشمنِ دل و دیدہ
کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ　　اے درد ترا تو یہ ہر مصرعہ چسپیدہ

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یہاں مجھے　　اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
اے گل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں　　گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے
کچھ اور کنجِ غم کے سوا سوجھتا نہیں　　آتا ہے یاد جب کہ وہ کنجِ دہاں مجھے

ہم چشمی ہے وحشت کو مری چشمِ شرر سے　　آتی ہے نظر پھر وہی غائب ہو نظر سے
اے ہموطناں اب کے یہ غربت زدہ کیوں ہیں　　پھرنے کا نہیں عمر کی مانند سفر سے

گر باغ میں خنداں وہ مرا لب شکر آوے　　گل سامنے داماں سے منہ ڈھانپ کر آوے
قاصد سے کہو پھر خبر اودھر ہی کو لیجائے　　یہاں بے خبری آگئی جبتک خبر آوے
کہتے ہیں کہ یکدست تری تیغ چلی ہے　　تب جانئے جب یک دو قدم چل ادھر آوے

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا　　بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
اذیت مصیبت ملامت بلائیں — ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھکو داغوں نے سرو چراغاں — کبھی آ کے تو نے تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے — ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

تو ہی نہ اگر ملا کرے گا — عاشق پھر جی کے کیا کرے گا
کہتے ہیں یہ تیرے ڈھنگ ظالم — دیکھیں تُجے کوئی دفا کرے گا

لیتا نہیں کبود کی اپنے عناں ہنوز — پھرتا ہے کس تلاش میں اے آسماں ہنوز
ہے بعدِ مرگ بھی یہی آہ و فغاں ہنوز — لگتی نہیں ہے تالو سے میری زباں ہنوز
سو سو طرح کی ہجر میں ہوتی ہے جاں کنی — مرتا نہیں ہوں تو بھی تو میں سخت جاں ہنوز

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں — جان سے اپنی جو کوئی کہ گذر جاتے ہیں
موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے — مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
آہ معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز — لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کا دل عالم سے — دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

ربط ہے ناز بتاں کو تو مری جان کے ساتھ — جی ہے وابستہ مرا ان کی ہر اک آن کے ساتھ
اپنے ہاتھوں کے بھی میں زور کا دیوانہ ہوں — رات دن کشتی ہی رہتی ہے گریبان کے ساتھ
دردؔ ہر چند میں ظاہر میں تو ہوں مور ضعیف — زور نسبت ہے ولے مجھکو سلیمان کے ساتھ

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں — ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں

اگر میں نکتہ رسی سے ترا دہاں پاؤں — کمر کو چاہوں تو اُس کے تئیں کہاں پاؤں
یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پروانہ — کہ حالِ دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

جی میں ہے سیرِ عدم کیجئے گا — یک بیک خلق سے رم کیجئے گا
موردِ قہر تو یہاں ہم ہی ہیں — اور کس پر یہ کرم کیجئے گا
سخت بیباک ہے یہ خامۂ شوق — اپنے ہاتھوں کو قلم کیجئے گا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا — میں چاہوں غیر کو سو یہ مجھ سے نہ ہو سکا
دشتِ عدم میں جا کے نکالوں گا جی کا غم — کنجِ جہاں میں کھول کے دل میں نہ رو سکا
گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر — میں نے تو در گذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

رسوائیاں اٹھائیں جور و عتاب دیکھا — عاشق تو ہم ہوئے پر کیا کیا عذاب دیکھا

دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا — پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا
پھرتی ہے خاک میرے لئے دربدر صبا — اے چشمِ اشکبار یہ کیا تم کو ہو گیا

ناصح میں دین و دل کے تئیں اب تو کھو چکا — حاصل نصیحتوں سے جو ہونا تھا ہو چکا

ایک تو ہوں شکستہ دل، تِس پہ یہ جور اور جفا　　سختیِ عشق واہ واہ، جی نہ ہوا ستم ہوا

اس کو سکھلائی یہ جفا تو نے　　کیا کیا اے میری وفا تو نے
بکسی کو عبث کیا بے کس　　قتل کر مجھ کو کیا کیا تو نے
دردؔ کوئی بلا ہے شوخ مزاج　　اُس کو چھیڑا بُرا کیا تو نے

فرصتِ زندگی بہت کم ہے　　مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے
نہ ملیں گے اگر کہے گا تو　　تیری خاطر ہمیں مقدم ہے
دردؔ کا حال کچھ نہ پوچھو تم　　وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

نہیں کچھ محتسب سی جان کا مجھکو تو اندیشہ　　کہیں ایسا نہ ہووے ہاتھ سے وہ چھین لے شیشہ

جگر پہ داغ نے میرے یہ گل فشانی کی　　کہ اُس نے آپ تماشے کو مہربانی کی

مرا جی ہے جبتک تری جستجو ہے　　زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
تمنا تری ہے اگر ہے تمنا　　تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا　　گلِ دوستی کی عجب رنگ و بو ہے
نظر میری دل کی پڑی دردؔ کس پہ　　جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

صورتیں کیا کیا ملیں ہیں خاک میں　　ہے دفینہ حسن کا زیر زمیں

(۱) میں (ن خ)

درد و درویش ہوں مری تعظیم   کرتے ہیں لوگ کہہ کے یا اللہ

(۲) داغ

میر مہدی داغ کہ پیش ازیں آہ تخلص میکرد پسر میر سوز جوان ملیح و خوش رو ی و خوشخو بود با وجہ و شاہدی قدم در راہ شاہد پرستی گذاشتہ بر زنی اہل سوق وارفتہ بود غافل ازیں کہ فراق ایں قوم فریبندہ اگر آدم را بکشتن دہد سر موئے رحم بحالش نکنند۔ قضائے کار بعد از انقضائے چندے مہاجرت در پیش آمد۔ خو کردۂ وصال تاب جدائی نیاوردہ بر بستر بیماری افتاد۔ دریں اثنا خطی از مطلوب رسید، ایام وفاتش قریب رسیدہ بودند کہ در خطِ جواب ایں شعر حسب حال خود نوشتہ رواں کرد و بعد آں جان شیریں بہ جاناں سپرد۔ شعر ایں است ؎

ازجاں رمقے بود کہ مکتوب تو آمد   دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

از وست۔

رباعی

یہ چاہ نہیں بھلی بُری ہوتی ہے   جی لیتی ہے دوستی بُری ہوتی ہے
لگتا ہی نہیں ہے جی کہیں اُس بن آہ   سچ کہتے ہیں یہ لگی بُری ہوتی ہے

حرف الذال

(۱) ذوقی

شاہ ذوقی، ذوقی تخلص، درویشی است خانہ بردوش۔ شعر را بطور بازاریان می گوید۔ از وست۔

جلد آل جو تجھ کو آنا ہے ورنہ کوئی دم کو دم روانا ہے
تجھ کو ڈھونڈھے کوئی کہاں ذوقی نہ ترا ٹھور نا ٹھکانا ہے

اُس کا شکوہ نہ گاہ کیجئے گا جس طرح ہو نباہ کیجئے گا
اپنی یہ چاہ اُس کی وہ صورت ملے عزیزاں نگاہ کیجئے گا
اپنے ذوقی کے گھر میں مشفق من گر کرم گاہ گاہ کیجئے گا
اس کے دیوانہ پن کے عالم کو دیکھ کر واہ واہ کیجئے گا

حرف الرّا

(۱) رضا

مرزا محمد رضا، رضا تخلص شاگرد مرزا محمد رفیع، صاحب دیوان است[۱]۔

یہ یقیں ہی کہ اس کی موت آئی ہی جس کو ملتا ہے یار ہرجائی
ہجر کی رات کیونکے گذری گی یہ تو ساتھ اپنے آفتیں لائی

یارب یہ آرزو کہیں پانے[۲] میں دل نہ جائے جب تک کہ یار آوے یہاں دم نکل نہ جائے
کس کس کا جور و ناز اٹھایا کرے یہ دل چھوٹے اگر مژہ کجی آنکھوں کا بل نہ جائے

شام ہجراں گر نہ بیتابی کرے دل کیا کری دمبدم ہوتی ہی آفت سر یہ نازل کیا کری

---

(۱) از دست (۲) پالے

جواب یہاں سے تشریف لیجائے گا — ہمیں بھی کبھی یاد فرمائے گا
یہ دل ہل(۱) رہا ہے ترے ساتھ پیارے — بھلا کس طرح اس کو بہلائیے گا
چلا جب کہا میں نے کیا حال میرا(۲) — لگا کہنے تجھ کو بھی بلوائے گا
وہ ہر چند روٹھا ہے پر اس کو پیارے — یہاں تک کسی طرح سے لائیے گا
رضا یہ زمیں ہے نہایت شگفتہ — غزل در غزل اس کو کہلائیے گا
ترے در سے پیارے اگر جائے گا — بہت دل کے ہاتھوں سے دکھ پائے گا
نہ کہئے کہ عاشق نہیں جان دیتے — تماشا تمھیں یہ بھی دکھلائیے گا
ستانا کسی کا نہیں خوب ہرگز — عزیزو یہ بات اس کو سمجھائیے گا
سمجھتے ہو تم خوب غیروں سے ملنا — کئے کو بہت اپنے پچھتائیے گا
کبھی اے عزیزو قدم رنجہ کر کر — ق اگر اس کے کوچہ تلک جائیے گا
رضا مر چلا ہے جدائی میں تیری — مرا یہ پیام اس کو پہنچائیے گا

(۲) رقت

مرزا قاسم علی رقت(۳)، قوم مغل ملقب بہ عراقی وطن اجدادش مشہد مقدس کہ شہر بزرگانش در خطۂ کشمیر ہم اقامت داشتہ اندا اما مولدش شاہجہان آباد است و در فیض آباد بسن تمیز رسیدہ طبعش از چہاردہ سالگی بطرفِ شعر میلان تمام داشت۔ آخر گفتہ پرگو شدہ و در آں ایام مشق سخن از میاں قلندر بخش جرأت کردہ لیکن زبانش(۴) چنیں است کہ من از جعفر علی حسرت کہ استادِ جرأت است استفادہ کردہ ام خیر ہرچہ باشد بیک سلسلہ است عمرش سی سالہ خواہد بود۔ از وست۔

خط وہ بھیجے رقیب کا لکھا — یہ بھی اپنے نصیب کا لکھا

---

(۱) ہل ان خ، (۲) تیرا ن خ (۳) رقت کے بعد لفظ تخلص ن خ، (۴) زبانیش ان خ،

ہمارے سامنے مست ابر بار بار برس	جو ہم سے ہو سکے تجھ سے نہ ہو ہزار برس
جوان تم ہوئے نام خدا یہ رقت تو	گھٹا کے دیکھے ہیں اب تک بھی تین چار برس

نہ کر گھمنڈ رقیب اُس سے گر ہوا اخلاص	کسی زمانہ میں ہم سے بھی یونہیں تھا اخلاص

چھٹ جائے کسی سے نہ ملاقات کسی کی	اللہ بگاڑے نہ بنی بات کسی کی

دو دل نے اس پہ سب نادان و دانشمند ہوتے ہیں	یہ عالم اُس کا دیکھا ہی کہ رستے بند ہوتے ہیں

دیوار گل رخاں کا سایہ مگر پڑا ہی	زاہد بتا تو مجھکو طوبیٰ میں شاخ کیا ہے

(۳) رنگین

سعادت یار خاں رنگین پسر طہماسپ بیگ خاں تورانی کہ مشارٌ الیہ در عہد نواب نجف خاں مرحوم اقتدار کلی داشت ۔ جوان فہیدہ و سنجیدہ در فن سپاہ گری و سواری اسپ بے نظیر و در فکر سخن خامہ خیالش بسیار خوش تحریر ۔ ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد اما ذکاوت طبعش بر صاحب علمان غالب ۔ در ایام آغاز شوق شعر تا در دہلی بود شعر خود را از نظر شاہ حاتم علیہ الرحمتہ می گزرانید ۔ حالا کہ بتفضل الٰہی در نظم کلام ترقی و امتیاز تمام پیدا کردہ از راہ انصاف دیوانِ خود را از اول تا آخر بہ نظرِ مؤلف در آوردہ ۔ کلامش بسیار کم اصلاح بر آمدہ و چوں مزاجش عشقباز افتادہ اکثر قطعہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشیدہ ۔ ہمیشہ بہ حضور مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہٗ حاضر می باشد و تقرب و امتیاز تمام دارد ۔ ایں کلام از دیوان اوست

دل تھا جو بساط اپنی سو گذران چکے ہیں — جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں
مت چوک ادھر دیکھ یہ ہے مفت کا سودا — اک بوسہ پہ دین و دل و ایمان چکے ہیں
سو بار کہا آؤں گا اور آئے نہ ہرگز — بد عہد ہو تم ہم تمھیں پہچان چکے ہیں
پھر چل نہیں کچھ فائدہ بس سونے دے رنگیںؔ — وہ منہ پہ دوپٹے کے تئیں تان چکے ہیں

یک بیک چونک کے وہ کہنے لگے رات نہیں — روک مت جانے دے گھر ہم کو یہ کچھ بات نہیں
ہاتھ میں ہاتھ ہے پر بوسہ نہیں لے سکتے — دست رس اتنی بھی ہرگز نہیں ہیہات نہیں
رات دن یار تو رہتا ہے اُسی کے گھر میں — کون کہتا ہے کہ رنگیںؔ پہ عنایات نہیں

قسمیں کروڑ جس نے ملنے کی کھائیاں ہوں — یہ سوچ ہے اب اس سے کیونکر صفائیاں ہوں
نرگس کو وہ چمن میں کیا بھر نگاہ دیکھے — وہ انکھڑیاں نشیلی جس کو خوش آئیاں ہوں

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے — مجھ کو تنہائی میں پھر دل خفقان رہتا ہے
شکوہ ہم کرتے ہیں کیوں رسم ہے دنیا کی یہ — دل جو لگتا ہے تو پھر پاس کہاں رہتا ہے
جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی — کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے
پنکھڑی گل کی جو کروٹ تلے آ سکے آئے — نازک اتنا ہے بدن اس کا نشاں رہتا ہے
اُس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا ق — کوئی رنگیںؔ بھی ترے کوچہ میں یہاں رہتا ہے
تو کچھ اک تاؤ سا کھا چیں بہ جبیں ہو کے وہیں — گالی دے کر یہ کہا اُس نے کہ ہاں رہتا ہے

اپنی ہر اک قطرہ سے اشک جھڑتے ہیں اس قماش سے — لوگ جھڑ کتے ہیں گلاب جیسے گلاب پاش سے
تجھ کو جو چاہتے ہیں یار کیوں نہ وہ کٹ مریں بھلا — نکلا ہے سج بدل کے تو آج غضب تراش سے

دیکھا نہ آنکھ بھی اٹھا ان کے غیر کا کہا
دامن اٹھا گذر گیا بچ کے ہماری لاش سے

مجکو جو گالی دیتے ہو کیا یہ کچھ بھلمنسائی ہے
کون تھا وہ استاد تختی تم کو جس نے پڑھائی ہے

نشۂ حسن نے جس وقت وہ مخمور ہوئے
ہاتھ سے اُن کے کئی شیشۂ دل چور ہوئے
بدگماں اتنا ہوں گذرے مجھے لاکھوں ہی خیال
تم جو نظروں سے مری ایک گھڑی دور ہوئے

اب ہم کو سفر دور کا درپیش ہے جانی
دے ہاتھ کا چھلا تو مجھے اپنی نشانی
خیاط نے دامن کا کیا گھیر زیادہ
ڈرتا ہوں کمر پہ نہ کرے اُس کی گرانی
جل بل کے ہوا خاک ترے ہجر میں تو نے
افسوس کہ رنگیں کی میاں قدر نہ جانی

جی بیچ کے یہ عشق کا جنجال خریدا
اُس جنس کو کھو ہم نے عجب مال خریدا

عبث ہے قصد دلا اُس سے چاہ کرنیکا
نہ ہووے جس میں سلیقہ نباہ کرنے کا

تجھکو اپنے سے یار کرنا
ہے جبر کو اختیار کرنا

ایسے ظالم کو دل دیا ہم نے
آہ اللہ! کیا کیا ہم نے

دل ہو خون اور حنا کو بھاگ لگے
اس تری منصفی کو آگ لگے

باغ میں جس دم کہ تو چلتا ہی اے گل ناز سی — سرو کو کہتا ہوں میں ہٹ جا بلند آواز سی

بھلا کرنے آئے بُرا کر چلے — ہم آئے تھے کیا کرنے کیا کر چلے

جو کوچہ میں اُس نازنیں کے نہ ٹھیرے — تو پھر یہ کہو ہم کہیں کے نہ ٹھیرے

اے دستِ جنوں چل تو گریباں کی طرف بھی — اور جی میں ترے آئے تو داماں کی طرف بھی

شب کو جو آپ اُٹھ گئے، نیند مری اُچٹ گئی — تارے ہی گنتے گنتے پھر رات وہ ساری کٹ گئی

غم سے ترے یہ دل، دو چار، دیکھئے کب تلک رہی — ہم سے تو دور وہ دیار دیکھئے کب تلک رہی

ہر صبح میاں رنگیں جمنا کے نہانے کو — کیا نیل کے کٹڑے سے انسان نکلتے ہیں

میں نے چاہا جو اُس کو اے رنگیں — مجھ سے ہر ایک بدگماں ہوا
تو نے تے جوڑتی ہے کیا کیا خلق — جی لگانا بلائے جاں ہوا

جب میں نے کہا کہ مجھکو تم سے — ملنے کا ہی اشتیاق بیحد
یک بار وہ کھل کھلا کے رنگیں — بولے کہ چہ خوش چرا نہ باشد

(۴) رفافت

مرزا مکھن رفافت تخلص، شاگرد جرأت خوش خلق وخوش تقریر بود۔ بعمر بست ودو

سالگی بمرض دق درگزشت - ازوست .

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی | گر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی
وہاں کیونکے رسئے کہ منادی جہاں پہ ہو | زانو پہ سر کو دھر کے نہ بٹھا کرے کوئی
لے فرش گل پہ غیر کو بٹھیا وہ اپنے پاس | منظور ہے کہ خاک پہ لوٹا کرے کوئی
برسوں کی ایک دم میں رفاقت جو چھوڑ دے | کیا ایسی زندگی کا بھروسا کرے کوئی

خوف سی تیرے نہیں بولتے اغیار سی ہم | ورنہ بھڑ جانے کو موجود ہیں دو چار سی ہم

(۵) رضا

میر رضا علی طغرا نویس کہ رضا تخلص دارد اگرچہ در سلکِ شعرا نیست اما شعر تصنیفِ خود کہ رو بروئے ایں جانب خواندہ بسیار آبدار است - ازوست

ہدفِ یار جو کل سینہ کا صندوق ہوا | تیر جو دل میں لگا سو لب معشوق ہوا

رہا عالم یہ شب[1] اپنا کہ اس بن دل جو گھبرایا | کبھو تکیہ پہ سر ٹپکا کبھی پٹی سے ٹکرایا
یہ دامِ سبزہ رنگ اس مرغِ دل کو آہ پھنسوایا | سیہ بختی نے کیسا مجھکو باغ سبز دکھلایا

کچھ ان دنوں جو ایسا بے ربط ہو گیا ہے | شاید رضا کو یار د کچھ خبط ہو گیا ہے

ستم زمانہ سی مجھ پہ دن برے ایکبار ہی یہ پڑ گئے | وہ جو آشنا تھی سو لڑ گئے جو دوست تھے سو بچھڑ گئے
کبھی آئے آ کے خفا ہوئے جو گئے تو جلکے بلا لیا | کبھی بیٹھے لیٹے چل گئے کبھی بیٹھے بیٹھے بگڑ گئے

---

(۱) "رہا یوں عالم شب اپنا اس بن دل جو گھبرایا" (ن خ)

مت پوچھو رضاؔ کا کچھ حالِ غمِ تنہائی — اک دل تھا سو کھو بیٹھا اک سر ہے سو سودائی

ستم زمانہ سے مجھ پہ دن بُرے ایک بار ہی پڑ گئے — وہ جو آشنا تھے سو لڑ گئے وہ جو دوست تھے سو بچھڑ گئے
کبھی آئے آکے خفا ہوئے جو گئے تو جا کے بلا لیا — کبھی لیٹے لیٹے مچل گئے کبھی بیٹھے بیٹھے بگڑ گئے

رباعی

جس دل کو قلق نے آہ گھیرا ہوگا — آنکھوں میں پھر اس کی اک اندھیرا ہوگا
کیوں گرد سے اپنے تئیں بچاتا ہے رضاؔ — اک خاک میں آخرش بسیرا ہوگا

دیگر

گر غصہ پہ غصہ یوں ہیں دل کھاوے گا — گھبرا گھبرا کے دم نکل جاوے گا
اُس شوخ کے غم میں آ کہا مان رضاؔ — اتنا مت رو وگرنہ مرجاوے گا

جو یکبار بھی دیکھنے تجھ کو پاؤں — بلائیں میں لے لوں تصدق بھی جاؤں

(۶) رِند

نواب مہربان خاں رندؔ تخلص کہ در زمانہ اقبالِ خود بہ علم موسیقی و شعر و مرثیہ شوق تمام داشت ہزار ہا دریں کار بر باد دادہ و در نیکنامی بر روئے خود کشادہ۔ اگرچہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا او را ہم بہ عرصہ قلیل بہ مرتبہ والائے شاعری رسانیدہ فقیر حسب اتفاق رونے برائے دیدنِ آن بزرگ ہمراہِ مرزا قتیل در رستم نگر بر مکانش گزر افگندہ بود مخرج زبان ہم درست نہ داشت آخر ہمیں جا در گزشت۔ از وست۔

یارب کہیں سے گرمئی بازار بھیجدے — دل بیچتے ہیں کوئی خریدار بھیجدے
دیتے ہیں عقدِ حسن میں عاشق عروس جاں — آتا نہیں جو آپ تو تلوار بھیجدے

ہم کو نہ کچھ سیم و نہ زر چاہیئے — لطف کی اک تیری نظر چاہیئے
کس لئے تلوار خریدی میاں — باندھنے کو بھی تو کمر چاہیئے

مجھکو صدقے تو یار ہونے دے　　آپ پر سے نثار ہونے دے
میری چھاتی پہ رکھ کے برچھی کو　　نہ اٹھا دل کے پار ہونے دے
ہے تری جان کا یہی دشمن　　رندؔ اس دل کو خوار ہونے دے

(۷) رُسوا

آفتاب رائے رسوا۔ گویند جوہری پسرے بود از قید مذاہب بر آمدہ سر سودا بر آوردہ سیاہی تا بہ بر رو مالیدہ و در ڈولی نشستہ در کوچہ و بازار می گردید و تودۂ خرمہرہا پیش خود داشتی۔ عوضِ یک خرمہرہ یک سرخنگ از دستِ طفلان وغیرہ بخوشی تمام می خورد و نیز بہ شربِ خمر سرہ مصروف بود این بیت ورد زبان داشت۔ بیت

رسوا ہوا خراب ہوا در بدر ہوا　　اس عاشقی کے پنتھ میں جس کا گذر ہوا

نقل است کہ بمقتضائے شوریدہ سری چندے برائے سیر تا قصبہ امروہہ آمدہ بخانۂ یکے از سادات آنجا فروکش شدہ۔ چوں در آں زمانہ باطراف واکنافِ شاہجہان آباد مردم شاہجہان آباد را عزت بیشتر بود خصوصاً کسی کہ قابل و دانا باشد، صاحب خانہ رسم مہمانداریش بخوب ترین وجہی بجامی آورد۔ چوں موما الیہ بے شرب شراب یک ساعت آرام نمی یافت میزبان روزے یک طفل را برائے آوردن شراب بہ احمد نگر کہ محلہ بیرون شہر واقع شدہ فرستاد چوں آمدنش دیر کشید بایشاں گفت کہ بیائید تا شراب آید اندکے سیر باغ کنیم بدیہہ از زبانش بر آمدہ۔ شعر لڑکا گیا شراب کو کاہے کی سیر ہو۔ ہم گذرے اس شراب سے لڑکے کی خیر ہو۔ دوستے نقل میکرد کہ ہرگاہ وقت رحلتش در رسید وصیت کرد کہ مرا بہ شراب غسل دہند چنانچہ دوستان ہمیں کردند ہرگز کفن و میتش بوے شراب نداشت۔ و در روایتِ دیگر چنیں است کہ بر جوہری پسرے کہ شیفتۂ او گردیدہ سودا بہم رسانیدہ بود، در سیر باغ از دستِ او بہ شمشیر کشتہ شدہ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

از وست۔

وصل میں بے خود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو   اس دوانے دل کو رسوا کس طرح سمجھائیے

کوئی جا نہیں زمین میں کہ اشکوں سے نم نہیں   رسوا ابھی اس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں

حرف الزا

(۱) زار

میر جیون زار اصلش از کشمیر است و خودش در شاہجہاں آباد نشو و نما کردہ اکثر در مشاعرہ ہائے دہلی داخل صحبت می شد۔ جوانِ چیچک رو و شورش طلب است پیش ازیں سودائے بہم رسانیدہ بود۔ بندہ او را در دہلی و چہ در لکھنؤ مکرر دیدہ ام۔ عمرش از سی متجاوز نخواہد بود۔ از دست

شب جھڑے آنسو میں یوں لخت جگر بھیگے ہوئے   گل جھڑیں شبنم سے جوں وقت سحر بھیگے ہوئے

موسم برسات ہے ساقی شتابی دے شراب   مینہہ میں آنکلے ہیں ہم بھی تیرے گھر بھیگے ہوئے

کس سے ہولی کھیل کر آیا ہے اے رشک بہار   رنگ میں کپڑے ہیں سارے تر بتر بھیگے ہوئے

ایک دن آ گئے ہی دنیا سے اٹھانا ہم کو   (۱)   شبِ فرقت پہ الٰہی نہ دکھانا ہم کو

فصل گل کی کچھ ہوئی آمد جو اس ل گئیں   (۲)   شور و غل طفلوں کا اور دستِ جنوں جانے لگا

ایک تجھ کو زار کے احوال پر آیا نہ رحم   (۳)   ورنہ ہر اک حال اس کا دیکھ غم کھانے لگا

---

(۱) ن خ و میں اشعار ۱ تا ۱۱ مظہر علی زار کے نام درج ہیں۔

حق نہ رکھے دور یار و یار کے تئیں یار سے (۴) کوئی مرض مہلک نہیں دنیا میں اس آزار سے
لا سکو اس کو تو اس سے اور کیا بہتر ہے آہ (۵) بات یہ بھی پوچھنے کی ہے بھلا تکرار سے
ان دنوں میں زار سچ کہہ کیا ہوا تیرے تئیں (۶) کچھ تجھے مغموم پاتا ہوں میں دو چار سے

یہ وہ ہے عشق لا مذہب نہ جس کا دین و ایماں ہے (۷) نہیں پوچھے ہے اتنا بھی تو کافر یا مسلماں ہے

لے جاؤ گے تم اس کی گلی سے جہاں مجھے (۸) آرام جو یہاں ہے نہ ہوگا وہاں مجھے
فصل بہار تجھکو مبارک ہو عندلیب (۹) بن یار ایک سی ہے بہار و خزاں مجھے
بن دیکھے اس کے ایک بھی دم آہ رہ سکوں (۱۰) اتنی تو ناصحا نہیں تاب و تواں مجھے
رہتی نہیں ہے ذکر کئے بن تو یار کا (۱۱) رسوا کرے گی زار یہ تیری زباں مجھے

( ) زار

میر مظہر علی زار بہ سرکار احمد علی خاں شوکت جنگ علاقۂ روزگار دارد گاہ گاہے خیال شعر کردہ ومیکند۔ از وست۔

تیری ہی قسم تجھ بن کچھ اور جو بھاتا ہو (۱) کافر ہو اگر اس میں کچھ بات بناتا ہو

اب رہائی نے کیا اور پریشاں مجھکو (۲) خوب تھا اس سے وہی گوشۂ زنداں مجھکو

اگر کچھ بس ہی ہو اپنا تو کاہے کو یہ خواری ہو (۳) نہ چاہیں اس کو اے ناصح جو الفت اختیاری ہو
قسم ہے جی سے کہتا ہوں ستاؤ جس قدر چاہو (۴) خوشی اپنی بھی وہی ہے خوشی جس میں تمہاری ہو

(۱) ن خ میں اشعار ۱ تا ۶ میر جیون زار کے نام درج ہیں۔ (ن خ)

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں (۵) خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

وہ وعدہ وہ تپاک وہ اقرار ہو چکے (۶) بس دو ہی دن کے دیکھ لیا یار ہو چکے

(۳) زمان

سید محمد زمان زمان تخلص از سادات عالی تبار قصبۂ امروہہ جوان منخنی وبسیار قابل وقابل دوست بود۔ موصی الیہ درایامیکہ نظر بہ بے وفائی دنیا کردہ[1] تبدیل لباس نمودہ درباغیچۂ تنہا نشستہ می ماند۔ فقیر ہمراہ اُستاد خود روزے در عالم مکتب نشینی وابتدائے شوقِ موزونی بصحبتِ ایشاں رسیدہ بود اگرچہ چنداں بخیال شعر سروکار نداشت اما اگر گاہے چیزے موزوں مے کرد بسیار سنجیدہ چنانچہ ایں مطلعش دلیل بر ذکاوتِ طبع اوست۔

عارض ہے گل کا صاف ولیکن جھلک نہیں نرگس کی چشم ہے یہ کٹیلی پلک نہیں

حرف سین

(۱) سائل

مرزا محمد یار بیگ سائل، قوم اُزبک ہندوستان زاد سپاہی پیشہ، درابتدا شاگرد شاہ حاتم وبعد ازاں رجوع بہ مرزا محمد رفیع سودا کردہ شخص کہنہ مشق است وایں شعر او دلیل بر صدق ایں مقولۂ اوست۔

حاتم کی تو خدمت سے تھا فیض بہت مجھکو سودا کی دے صحبت اکسیر نظر آئی

---

(۱) دنیا تبدیل لباس کردہ" دنیا کے بعد لفظ کردہ۔ اندیہ اور نمودہ کی جگہ کردہ ہے۔ ن خ۔

آشنائی کا تری مجکو گماں یونھیں ہے
اس میں کچھ جھوٹ نہیں سچ ہی میاں یونھیں ہے

حرزِ جاں لیتے ہی اُس کی چشم نے ابرو کیا
شیر کے ناخن کو گویا ہیکلِ آہو کیا
وہ حمائل ہو گیا دستِ شکستہ کی طرح
آہ جس کو میں نے اپنا قوتِ بازو کیا

اٹھ گیا جب کہ تعین تو جہاں اپنا ہے
جس جگہ بیٹھ گئے پھر وہ مکاں اپنا ہے

(۲) سوز

محمد میر سوز تخلص کہ بطرزِ خود اُستاد است و وضع خواندنِ شعرش دیگرے راکم یاد[۱]۔ گویند اول میر تخلص میکرد چوں درآں ایام میر محمد تقی ہم شہرت بہ میر داشت لہٰذا ازآں درگزشتہ بجائے میر سوز قرار دادہ۔ کمالہائے[۲] ایں بزرگ ماورائے کمال شاعری و درویشی بسیار اند، چنانچہ در تیر اندازی و سواریِ اسپ و نوشتن خط نستعلیق و شفیعا و نازک بندی و نزاکت فہمیِ شعر و آدابِ صحبتِ ملوک و سلاطین و ظرافت طبع و خندہ روئی و ندامت پیشگی و تحصیلِ معاش و گفتن کلمۃ الخیر درحقِ دیگرے و باایں ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصۂ شعرا ست نظیر خود ندارد۔ گاہ گاہے کہ بافقیر ملاقات میشود بسیار مہربانی می فرماید و غائب و حاضر ازیں[۳] ہیچ مدان حظ دانی بر داشتہ بے تکلف درستایشِ دوستانہ می افزاید۔ عمرش از ہفتاد متجاوز خواہد بود حق تعالیٰ بایں شفقت بزرگانش[۴] دیرگاہ سلامت دارد۔ ازوست۔

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے
دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

---

(۱) "یاد" کا لفظ زائد ہے۔ (۲) کمالات۔ (۳) حاضر از مزخرفات ایں ہیچدان۔ (۴) بزرگانہ سلامت دارد "ش" اور لفظ دیرگاہ ندارد (ن خ)

شبنم آسا گلشن دنیا میں آہ — سوزؔ ہم با دیدۂ پُر نم گئے

کشورِ دل میں نہیں کوئی کہ آباد رہے — یوں اجاڑا ہے اُسے تم نے بھلا یاد رہے

شہد میں جیسے مگس ہم حرص کے پابند ہیں — وائے غفلت اس نئے زنداں میں یوں خورسند ہیں
رزق کا ضامن خدا، شاہد کلام اللہ ہے — تو بھی اپنی صوتوں کے روز حاجتمند ہیں
مقبروں میں دیکھتے ہیں اپنی ہم آنکھوں سے روز — یہ برادر یہ پدر یہ خویش یہ فرزند ہیں
تو بھی رعنائی سے ٹھوکر مار کر چلتے ہیں یار — سوجھتا اتنا نہیں ہم خاک کے پیوند ہیں
جب تلک آنکھیں کھلی ہیں دکھ پہ دکھ دیکھے گا یار — مند گئیں جب انکھڑیاں تب عیش سب آنند ہیں

زندگانی میں کسے آرام حاصل ہووے گا — ہائے آسودہ جہاں میں کونسا دل ہووے گا

تو ہم سے جو ہم شراب ہو گا — عالم کا جگر کباب ہو گا
ڈھونڈے گا سحاب چھپنے کو ہر — جس وقت(۱) تو بے نقاب ہو گا

اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا — آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

سُنے ہے سوزؔ! تو ملنے کا قصد مت کریاؔ — اُٹھا سکے ہے تو کب ناز بے دماغوں کا

مروت دشمنا، غفلت پناہا — ادھر بھی دیکھ لیجو مُڑ کے آہا

---

(۱) جس روز وہ بے نقاب ہو گا (ن خ)

کٹی اوقات سب بطلاں میں میری — خداوندا، کریما، بادشاہا
صَرَفتُ العُمرَ فِی لَہوٍ وَّ لَعِبٍ — فآہا، ثُمَّ آہا، ثُمَّ آہا

مجھے گر حق تعالیٰ عشق میں کچھ دسترس دیتا — تو دل ان بیوفاؤں کو کوئی میں اپنے بس دیتا
قسم ہے سوزؔ گر وہ قتل کرتا اپنی آنکھوں سے — تو جی دیتے ہوئے بھی صوت اُس کی فریادرس دیتا

رات آنکھیں تھیں مُندیں پر بخت ٹک بیدار تھا — تا سحر دل محوِ دیدارِ خیالِ یار تھا
سوزؔ کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو — وھاں تجھے کیا تھی کمی یہاں تجھکو کیا درکار تھا

اگر کچھ سوزؔ نے پایا تو میخانہ کی خدمت سے — حرم کے در پہ ورنہ بارہا سر مار مار آیا

غم ہے یا انتظار ہی کیا ہے — دل جواب بیقرار ہی کیا ہے
وائے غفلت نہ سمجھے دنیا کو — یہ خزاں یا بہار ہے کیا ہے
قفسِ تن تو جل کے راکھ ہوا — آہ ہی شرار ہے کیا ہے
کچھ تو پہلو میں ہی خلش دیکھو — دل ہی یا نوک خار ہی کیا ہے
کھینچ کر تیر مار بیٹھے بس — سوزؔ ہی یا شکار ہے کیا ہے

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا — اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا
تھرتھراتا ہی اب تلک خورشید — روبرو تیرے آگیا ہوگا

بستیاں بستی ہیں اور اجڑے نگر آباد ہیں — وے کہاں جن کے جدا ہونے سی ہم ناشاد ہیں

مسی پر سرخیِ پان دیکھ میری عقل بھولی ہے　　　کہ ہے خورشیدِ تاباں تپہ ایسی شام پھولی ہے

امیدیں دل کی ساری ہی بھر آئیں میں نے آہ　　　اے سوزؔ بعدِ مرگ تو اب مدعا ہے یہ
دامن کشاں وہ لاش پہ آکر مجھے کہے　　　ہے ہے کسو کے پیچھے ترستا ہوا ہے یہ

منہ لگانے سے مُرے کیوں تو خفا ہوتا ہے　　　جانِ من بوسہ کے لینے سے تو کیا ہوتا ہے

پرکار کی روش چلے ہم جتنی چل سکے　　　اس گردشِ فلک سے نہ باہر نکل سکے
رونا بھی تھم گیا ترے غصہ کے خوف سے　　　تھی چشم ڈبڈبائی پہ آنسو نہ ڈھل سکے
منہ دیکھو آئینہ کا تیری تاب لا سکے　　　خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

یوں[1] تو نکلی نہ مرے دل کی اپاہے گا ہے　　　اے فلک پھر خدا رخصتِ آہے گا ہے
سوزؔ سے ایک نے پوچھا کہ صنم سے اپنے　　　اب بھی ملتے ہو بدستور کہ گاہے گاہے
دیکھ کر منہ کو گھڑی ایک میں بھر کر دمِ سرد　　　یوں اشارت سے جتایا سر آہے گا ہے

غمِ عاشق سے کون محرم ہے　　　محرمِ عشق خلق میں کم ہے
لختِ دل مت نکل ابھی باہر　　　پیرہن اشک سے ابھی نم ہے
پھلجھڑی کی طرح سے جھڑتا ہے　　　اشک کا بھی تو زور عالم ہے
نتھ کے موتی پکارتے ہیں پڑے　　　تیرے عاشق کا ناک میں دم ہے
کیسی کیسی یہ باتیں کرتا ہے　　　سوزؔ ہے یا کہ جانِ آدم[2] ہے

---

(۱) (ن) نہیں نکلے ہے مرے دل کی اپاہے گا ہے۔ (۲) عالم (ن خ)

چین نا دن ہو ان آنکھوں کو نہ شب آرام ہو
شام سے تا صبح رونا صبح سے تا شام ہو
لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہے کہیں
عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہی

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا
مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا

یہ حال یا قیامت، یہ حسن یا شرارا
چلتا ہے کس جھمک سے ٹک دیکھیو خدارا
جوڑا لپیٹے جب تک روزِ حساب آخر
بل بے تری بناوٹ اے خود نما خود آرا
غرفہ کو جھانکیو ٹک کیسی جھمک ہے اللہ
یہ نور یا تجلی خورشید یا ستارا
کس کا یہ گورستان تیرے شہید پیارے
زیرِ زمیں سے اٹھ اٹھ کرتے ہیں پھر نظارا
پوچھے ہے مجھ سے سنیو عاشق کباب ہے کیا
کچھ جانتا نہیں ہے بھولا بہت بچارا
اتنی جراحتوں پر جیتا ہے سوز اب تک
سینہ ہے یا کہ ترکش دل ہے کہ سنگِ خارا

دامن تلک کو تیری کہاں دسترس مجھے
تیری گلی کی خاک بھی ہوں تو ہے بس مجھے
کیا آمدِ بہار ہے اس غل کو پوچھیو
اے وائے سوجھتا نہیں جا کے قفس مجھے

تو جو پوچھے ہے کہ تیرا دل تھا کس نے لیا
بس حیا آتی ہے مجھکو مت لگا کس نے لیا

سرشکِ شمع آخر شمع محفل ایک دن ہوگا
یہ آنسو رفتہ رفتہ جمع ہو دل ایک دن ہوگا
تجھے اے دل بغل میں محنتوں سے میں نے پالا تھا
نہ جانا تھا کہ تو میرا ہی قاتل ایک دن ہوگا

آتا ہے وہ جفا جو تیغِ ستم کشیدہ
دامن بدست چیدہ ابرو بہم کشیدہ

صورت گر قضا نے تجھ سا نہ کوئی کھینچا ہاں حسنِ ماہ کہئے سو ہے قلم کشیدہ

غرورِ حسن ہے تجھ کو تو مجھکو تمکیں ہے تو سنگدل ہے تو میری بھی آہ سنگیں ہے
اگر رحیم ہے تو میں بھی ایک عاصی ہوں جو تیغ زن ہے تو میری طرف سے تحسیں ہے
تو عشق ہے تو میں دل ہوں تو درد ہے تو میں سوز تو کوہکن ہے تو مجھ پاس جانِ شیریں ہے

رُباعی

بس سوز سنبھل یہ آہ و زاری کب تک بس ہاتھ نہ مل یہ بیقراری کب تک
آپ ہی عاشق ہے تو اور آپ ہی معشوق پردے سے نکل یہ شرمساری کب تک

(۳) سعادت

میر سعادت علی سعادت تخلص از ساداتِ قصبۂ امروہہ معاصر شعرائے ایہام گوئی محمد شاہی است شعر را بطرزیکہ دراں زمانہ رواج داشت بسیار بخوبی و تلاش می گفت۔ گویند روزے در مجلسی دردانہ نام رقاصہ رقص میکرد اتفاقاً کفش نوے ایشاں گم شد ہرگاہ از مجلس برآمد کفش را نیافت ظرافتاً بدیہہ از زبانش سرزد ایں شعر ؎

سعادت شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوڑا گیا تو جانے دے دردانہ کے بھڑووں کے سر صدقے

بے محابا زلف کے کوچہ میں جاگا بار بار سر چڑھایا ہے بہت تم نے میاں شانے کے تئیں

(۴) سکندر

کہ در مرثیہ گوئی شہرت دارد شاگرد میاں ناجی است در ابتدائے فکر شعر بیشتر قصہ خوانی میکرد آخر آخر طبعش بطرفِ نظم مراثی مائل افتادہ۔ شخص دائم الخمر دخوش طبع ظریف

مزاج دیدمش و طبعش بطرفِ پنجاب است۔ عمرش از پنجاہ متجاوز خواہد بود اکنوں ہم گاہ گاہ فکر شعر بطور قدیم وجدید میکند۔ از دست۔

کبھی فرقت میں شب کو آنکھ میری گر جھپکتی ہے
اُسی دم روح کوچہ میں ترے جاکر بھٹکتی ہے

سحر گذرا چمن سے کون سا خورشید رو یا رب
کہ شبنم گل کے منہ پر اب تلک پانی چھڑکتی ہے

مبادا آگ لگ جاوے بُرے مرے دل کی ترے دلکو
گلے لگنے سے اس دل سوز کے چھاتی پھڑکتی ہے

کرے گی مجھکو دیوانہ سکندر یا کہ متوالا
پری کی طرح صہبا پر وہ مینا سے تکتی ہے

گرا ہی مانگ میں دل میرا آہ ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی رات اُدھر ہے اور آدھی رات اِدھر

نہ دیکھا ہو جو کسی نے حباب میں دریا
وہ دیکھ لے مری چشم پر آب میں دریا

رباعی

اے زاہدو تم سے کیا جھگڑ کر لوں میں
ناحق میں دل اپنے کو کروں کیوں خوں میں

میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے
ہوں میں ہوس میں جو کچھ کہ ہوں میں موں میں

(۵) سوزاں

مرزا[۱] احمد علی خاں شوکت جنگ المتخلص بہ سوزاں خلفِ نواب مرزا علی خاں مرحوم چوں باآداب و امتیاز است طبعی رسا داد از دست۔

لیجا نہ شبِ فراق جاں کو
کیا زندگی مجھ سے ناتواں کو

مجنونِ شکستہ پا ہے پیچھے
کہدیجو پیام ساربان کو

---

(۱) نواب مرزا احمد علی خاں (ل، نخ)

مت دل لگا بتوں سے کہنے پہ جا کسی کے ہرگز ہوئے نہ ہوں گے یہ آشنا کسی کے
خوبی ہے کیا ستمگر اس ہفتہ دوستی میں اپنا کسی کو کیجے ہو رہیئے یا کسی کے
فرقت میں اُس کی سوزاں ناحق کو جان دی ہائے اُس لاابالی کو غم مرنے سے کیا کسی کے

(۶) سرسبز

مرزا زین العابدین خاں عرف مرزا مینڈو سرسبز تخلص از فرزندان نواب سالار جنگ مرحوم جوانے است باعلم وحیا وصاحبِ فہم و ذکا ہمتش اکثر اوقات بہ مطالعۂ کتب دینی ومسائل یقینی مصروف وبرخلافِ خاندانِ خود طبعش از غنا وغیرہ مجتنب بسلسلۂ نسبتش درقوم مالک اشتر منتہی می شود و بزرگانش در عہد فرخ سیر بہ ہندوستان قدم گزاشتہ اند وبرتبۂ عالی جاہی فائز شدہ ہمیشہ مقرب ملوک وسلاطین بودہ اند چوں مرزائے مذکور را بسببِ موزونیِ طبع عشقِ شعر ہندی از طفولیت دامنگیر حال بود رفتہ رفتہ بسن ہفدہ سالگی رسیدہ دیوانے ترتیب دادہ فقیر پیش ازیں مدت چار سال بصیغہ شاعری ملازم ورفیق ایشاں ماندہ بسیار بہ عزت دوست میداشتند۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ من کلامہ

قفس میں گذرے گی کیا عندلیبِ خانہ ویراں پر سنے گی جس گھڑی ہر آن نوں عالم گلستاں پر

شمع جب چہرۂ پرنور دکھاتی ہی مجھے یاد عارض میں ترے اور جلاتی ہی مجھے
خندۂ گل میں نکلتا ہی کہاں یہ عالم ہائے کیا وضع ترے ہنسنے کی بھاتی ہی مجھے
اُس کے کوچہ کی طرف میں تو نہ جاؤں سرسبز کششِ دل ہی کہ کھینچے لئے جاتی ہی مجھے

جو دوست مرا اس کو پیغام سناتا ہے وہ صاف اُسے یار و دشنام سناتا ہے

دید کو تیری ہم جو آتے ہیں — سینکڑوں آفتیں اٹھاتے ہیں
بے تکلف تھے دل کے لینے تک — ہم سے اب آپ منہ چھپاتے ہیں
آپ ادھر کیجئے علم شمشیر — ہم ادھر اپنا سر جھکاتے ہیں
ہر طرح اپنے یار کو سرسبز — روز اکبار دیکھ آتے ہیں

شب انتظار گذری ہمیں انتظار کرتے — کبھی دوست دوست کرتے کبھی یار یار کرتے
ترا یار اس جگہ تھا نہ ہوا تو ہائے سرسبز — اگر اُس گھڑی تو ہوتا تجھے ہم دوچار کرتے

بیٹھا ہوں میں تو کب سی سر راہ یار پر — کچھ نگاہ ٹک تو مرے انتظار پر
کیا حالِ گریہ پوچھے ہی ہمدم سرک کہیں — اب تو نچوڑ ہے مژۂ اشکبار پر
سرسبز ہو کے سینہ میں افسردہ رہ گیا — یہ کیا بلا پڑی دلِ امیدوار پر

یہ جو کانوں میں تباں عقدِ گہر رکھتے ہیں — میرے آنسو ہیں کہ یکجا انھیں کر رکھتے ہیں

منہ موڑ لیا تم نے اگر مہر و وفا سے — ہم ہاتھ اٹھانے کے نہیں دست دعا سے
میں نے جو کہا اُس سے کہ جاتی ہی مری جاں — منہ پھیر کے یوں کہنے لگا میری بلا سے

کل کبک دیکھ[2] تیری رفتار مر گیا — رسوا ہوا کہ بر سرِ بازار مر گیا
صیاد سے خبر بھی نہ لی اور قفس کے بیچ — سر کو پٹک کے مرغِ گرفتار مر گیا

---

(۱) کبھی (ن خ) (۲) دیکھ کر۔ (ن خ)

ترے گلشن سے کہہ جاویں کدھر ہم
کہ ہیں اے باغباں بے بال و پر ہم
نہ گذرا تو کبھی ایدھر سے ہو کر
گئے اس آرزو ہی میں گذر ہم
ہماری آہ پر ہنستا ہے کیا تو
دکھاویں گے تجھے اس کا اثر ہم

جگہ پاویں گے اتنی باغ میں اے باغباں ہم بھی
کبھو اگر بناویں گے چمن میں آشیاں ہم بھی
دماغ اپنا نہیں اس وقت حاضر ہم کو مت چھیڑو
سناویں گے کسی دن تم کو اپنی داستاں ہم بھی
جہاں کے ہمصفیروں کو ہوئی ہے خانہ ویرانی
اسی گلشن میں چھوڑ آئے تھے اپنا آشیاں ہم بھی

خبر لائی باد بہاری کسی کی
دو چنداں ہوئی بیقراری کسی کی
زلیخا کو یوسف ہی کا دھیان گذرا
جو اس رہ سے آئی سواری کسی کی
ترے ہاتھ سے بوئے مشک آئی شانے
مگر تو نے کاکل سنواری کسی کی
میں سر سبز روتا ہوں آتی ہے جب یاد
وہ صورت مجھے پیاری پیاری کسی کی

کب خوش آتی ہے ہمیں سیر گلستاں تجھ بن
نظر آتا ہے[1] چمن خانہ ویراں تجھ بن
خواب[2] میں ہی نظر آ جا کہ تسلی ہو مری
پر شوش ہوں میں اے زلف پریشاں تجھ بن
اپنے عاشق کی تو بالیں پہ نہ آیا صد حیف
جان دی اس نے بصد حسرت و ارماں تجھ بن
چل تو سر سبز گلستاں میں غزل خوانی کو
بولتے وہاں نہیں مرغان خوش الحان تجھ بن

(   ) سلیمان

مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ سلیمان تخلص کہ محامد ذات قدسی آں

(۱) آتنے ہیں (ن خ) (۲) خواب ہی میں (ن خ)

مہر درخشانِ آسمانِ جلالت و ماہِ فروزانِ برجِ ابہت از تحریر و تقریرِ اقلام و السنۂ فصحا و بلغا مافوق است چوں بفضلِ الٰہی در جمیع فنون دانشمندی یگانۂ روزگار اند بمقتضائے موزونی طبع کہ بادشاہان سلف را نیز بودہ است اکثر رخش خیال را در میدانِ فصاحت می تازند و شعر خوب را از ہر کہ باشد دوست میدارند در ایامیکہ حکم ترتیب مجلس مشاعرہ شدہ بود اکثرے از کار دانانِ ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند۔ ایں فقیر حقیر ہم چوں نسبتِ دیگراں باوصفِ گوشہ نشینی دریں کار زیادہ رسوائی داشت بگفتۂ میر انشاء اللہ خاں حسب الطلب حضور باوصف کم بغلی و شکستہ حالی شریک مجلسِ یاران شدہ بود چنانچہ در ہماں[1] تاریخ بہ حلقۂ[2] ملازمانِ حضور در آمد و بعد چندے از کلامِ فقیر محظوظ شدہ در جائزۂ قصائد مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیتِ عیدین بودند بانعام تبریک مکرر سر احقر را از حضیض خاک باوج افلاک رسانیدند۔ و ہمچنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعد سہ چہار ماہ دولتِ ملازمتِ حضور حاصل نمودہ[3] بہ نوازشِ خسروانہ در آمدہ و نیز نوکر شدہ و میر سوز کہ کسوتِ درویشی بہ قامتِ حالِ خود راست داشت در اوائلِ مشاعرہ بانعامِ یک دو شالہ و یک ٹو سرفرازی یافتہ راہِ خود پیش گرفت و میر انشاء اللہ خاں کہ بنائب و مختارِ حضور یعنی خاں صاحب و قبلہ خان زاد خان بہادر کہ ایشاں در شعر فہمی و نثر نویسی نظیر خود ندارند صیغۂ اخوت خواندہ اند ہمیشہ موردِ گوناگوں الطاف خسروی می باشند و چند بار بانعامِ لائقہ قبا و گوشوارۂ سر مباہات برافراختہ اند حق تعالیٰ ایں قدر شناس شعرا را کہ دریں زمانہ دول قدرِ سخن با خاک یکساں شدہ بر تختِ سلطنت و جہانبانی زود مسلط گرداناد و مرادِ دلِ دولت خواہانِ حضور کہ شب و روز دست بردعا دارند زود بر آرد۔ آں زمان بیانِ داد و دہشِ ہمت عالی کردہ خواہد شد۔ حالا کلامِ معجز نظام حضرت نوشتہ می شود و آں ایں است۔

---

(۱) از ہماں دن خ، (۲) در حلقہ دن خ، (۳) کردہ دن خ،

ہم تو کب آپ تلک آپ سے آسکتے ہیں — آپ چاہیں تو ہمیں پل میں بلا سکتے ہیں
جبہ سائی کا نشاں جائے جبیں سے کیونکر — کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں
دھار ہے بحر محبت کی سروہی کی سی — بوالہوس اس میں کوئی آکے نہا سکتے ہیں
اپنے مکھڑے پہ دوشالہ وہ رکھیں گے تا چند — کوئی خورشید کو پردے میں چھپا سکتے ہیں
تاج و تخت اپنے سلیماں کو یا شاہِ نجف — آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں

دل اُس کے سینہ سے یوں لگ رہا ہے — جڑا جوں دُھکدُکی پہ نگ رہا ہے
سلامِ شوق کہیو نجد میں جا — صبا وہاں اِک مرا ہم تگ رہا ہے
ستاتی ہے مجھے وہاں ناتوانی — جہاں سے اُس کا گھر دو ڈگ رہا ہے
یہ طفلِ اشک آنکھوں سے نکل کر — مری چھاتی سے پہروں لگ رہا ہے
ہمیں (۱) خاتم نمط اُس کی سلیماں — تلاشِ پائے بوسِ سگ رہا ہے

ساقیا ہے یہ جام کا عالم — جیسے ماہِ تمام کا عالم
کبک رفتار اپنی بھول گئے — دیکھ اُس کے خرام کا عالم
اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے — شبِ ہجراں کی شام کا عالم
تجھ پہ ہے ان دنوں میں نام خدا — کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

اوروں کی طرح سے اب نہ ٹالو — ہم کو اپنے گلے لگا لو
گالی نہ دیا کرو کسی کو — بس بس اپنی زباں سنبھالو
غرفہ میں سے جھانک یار اپنے — غیروں کو ہنسی خوشی بلا لو

---

(۱) خاتم (ن خ)

اور ہم سے ہزار حیف پیارے — منہ کو شرما کے یوں چھپا لو
ہے قافلہ عمر کا روانہ — رخت اپنا مسافرو سنبھالو
بت خانہ کی راہ کو سلیماںؔ — چھوڑ دو تم اور رہِ خدا لو

گھر سے برقع جو الٹ وہ مہِ تاباں نکلا — چونک اٹھی خلق کہ ایں مہرِ درخشاں نکلا
مہ کو اور تجھکو جو میزانِ خرد میں تولا — اس سے تو حسن میں اے یار دو چنداں نکلا
رہ گئے ہوش و حواس و خرد و طاقت سب — یوں ترے کوچہ سے میں بے سر و ساماں نکلا
یہاں تلک تیر قضا کھائے ہیں میں(۱) نے اس کے — جائے سبزہ مرے مرقد پہ نیستاں نکلا
تیرے بیمار کی سنتے ہیں یہ حالت ہے کہ اب — جو گیا اُس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا
واہ کیا توڑ تری تیر نگہ کا ہے کہ یار — جس کے سینہ میں لگا پشت سے پیکاں نکلا
سوزشِ دل کو بھی میرے نہ بجھایا تم نے — کام اتنا بھی نہ اے دیدۂ گریاں نکلا
فتح دیکھو تو اسے یا شہِ مرداں کہ ترا — ملک گیری کو جو ہے اب یہ سلیماںؔ نکلا

وہاں جو غیر سے وہ رات کو ہم کنار رہا — ہمارے دل کو یہاں سخت اضطرار رہا
نشہ میں رات یہ ساقی کا انتظار رہا — کہ صبح تک مجھے دردِ سر خمار رہا
قمارِ عشق میں اُس بت سے میں نہ کچھ جیتا — دل اک بساط میں تھا سو لے بھی ہار رہا
یہ کس کے دستِ حنا بستہ یاد آئے تھے رات — کہ تا بہ صبح مرے دل کو اک فشار رہا
نہ اس نے شرم کے مارے مری طرف دیکھا — میں اس سے رات کو ہر چند آنکھ مار رہا
کسی کے موتیوں کا ہار شب جو یاد آیا — تو تارِ اشک سحر تک گلے کا ہار رہا
تری جو زلف کو سونگھا کیا تو ساری رات — زبانِ شانہ سے سنتا میں بار بار رہا

---

(۱) اُس کی میں نے (ن خ)

شب فراق میں ہیں کیا کہوں سلیماںؔ آہ
کہ کس(۱) طرح سے دل اپنا یہ بے قرار رہا

جب تیغ کو پکڑ وہ خونخواہ گھر سے نکلا
تب میں بھی جان سے ہو بیزار گھر سے نکلا

ہر مو کمر کے سو سو بل پڑ گئے کمر میں
ٹپکا جو باندھ کر وہ بلدار گھر سے نکلا

کشتہ کو تیرے، در سے افسوس لے گئے کل
اور تو نہ اک قدم بھی اے یار گھر سے نکلا

چھوڑا نہ جب گریباں دست جنوں نے میرا
تب جبر کر میں اس کو ناچار گھر سے نکلا

روزن سے اس نے اوپر مجھکو گھڑی جو دیکھا
کھنکھار کر وہیں وہ عیار گھر سے نکلا

اس بت کے دیکھنے کو کر ترک دین و ایماں
میں ڈال کر گلے میں زنار گھر سے نکلا

چہروں پہ عاشقوں کے زردی سی پھر گئی تب
جب باندھ وہ بسنتی دستار گھر سے نکلا

لوگوں کے خوف سے پھر کل شب کو میری خاطر
لاچار پھاند کر وہ دیوار گھر سے نکلا

وہ شاہ حسن میرے اس ملک دل پہ یارو
جس دم کہ دوڑنے کو یلغار گھر سے نکلا

ق

کھول آہ(۲) کا علم اور لے اشک کے تشوں کو
یوں میں بھی ہو کے اس دم تیار گھر سے نکلا

کچھ تو اثر کیا ہے دل کی ترے کشش نے
پڑھتا جو وہ سلیماںؔ اشعار گھر سے نکلا

شب دل سے مری آہ کا شعلہ جو اٹھا گرم
منقل کی طرح تا بہ سحر سینہ رہا گرم

سج گرم، ہنسی گرم، نگہ گرم، ادا گرم
نتھنے کی پھڑک اس کے ہے ان سب سے اگر گرم

ہوں سوختہ میں آتش الفت کا طبیبو
لکھیو نہ مرے نسخہ میں تم کوئی دوا گرم

گرمی کا یہ موسم ہے تو خس خانہ سے اپنے
باہر نہ نکلنا کہ نہایت ہے ہوا گرم

جب کہ دیکھے ہی ترے طرۂ دستار کے پھول
توڑ ڈالے ہی صبا باغ میں گلزار کے پھول

(۱) کہ جس طرح سے ۔ (ن خ)، (۲) کے (ن خ)،

نرگستان میں تو کیا سیر کناں پھرتا ہے
کون کہتا ہے یہ ہے عقد ثریا۔ مہ نے (۱)
میرے گلدستہ کو مت دے تو چھڑی سی تشبیہ
گالیاں سینکڑوں ہر بات میں اب دینے لگا
گر لگاوٹ نہیں منظور تو کیوں پھینکتے ہو
رات چوٹی کے ترے دیکھتے ہی پھندنے کو
چشم بد دور ادھر دیکھ ان آنکھوں پر سے
کس طرح لوں میں بلائیں کروں کیونکر تعظیم
ہاتھ آیا ہی میں سلیمان وہ پری مجھ سے رکی (۲)

ہو گئے آج ترے کشتۂ دیدار کے پھول
نقرئی پھینکے ہیں تجھ پر سے کئی وار کے پھول
کہ یہ الفت کے ہیں گل اور وہ بازار کے پھول
دیکھیو جھڑتے ہیں کیا منہ سے مرے یار کے پھول
متصل بیٹھ کے تم رخنۂ دیوار کے پھول
چونک اٹھا میں کہ ہیں یہ منہ میں سیہ مار کے پھول
صدقے کر ڈالے تھے سو نرگس بیمار کے پھول
دست و پا اپنے گئے دیکھتے ہی یار کے پھول
میں نے بکھرا دیئے توڑ کئی ہار کے پھول

(۸) سوداؔ

شیر بیشۂ سخندانی مرد میدان پہلوانی مرزا محمد رفیع المتخلص بہ سوداؔ پسر مرزا محمد شفیع کابلی کہ در عصر خویش سر آمد شعرائے ریختہ گو گزشتہ۔ بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند۔ بعضی بہ سبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند، غرض ہر چہ بود در روانی طبع نظیر خود نداشت۔ غزلہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و ہجوہا و مثنویہائے متعدد و غیرہم نگاشتہ۔ خامۂ خیالش بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ دیوانش بہ فرنگ و صفاہان رسیدہ، دیگرے ایں شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در مثال بندی اشعار غزل صائب و قتش گویم بجا است و اگر در علو مراتب معانی ابیات قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست، حالا ہر کہ گوید پیرو و متبعش خواہد بود۔ فقیر در عہد

(۱) یہ شعر ندارد۔ (ن خ) (۲) لڑی (ن خ)

نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدنِ ایں بزرگ بخانہ اش رسیدہ بود بہ پرورش سگان ابریشم پشم شوق تمام داشت۔ و بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ وسلام کہ گفتہ پرسوز نہادنِ آنہا نیز قادر۔ غرضکہ شخص جامع الکمالات بود ہر جاکہ می رفت عزت وحرمت تمام می یافت۔ نواب مرحوم ومغفور نیز بودن او را در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند۔ وفاتش در لکھنؤ و مرقدش در امام باڑۂ آقا باقر۔ روزے در ماہِ محرم فقیر آنجا رفتہ بود کہ بہ ایمائے بزرگے[1] اتفاق زیارتش افتاد و نظر بر کتابہ فرش کردم درہماں تاریخ وفاتش گفتۂ میر فخر الدین ماہر کہ ہمدم وہم نشیں او بود کندہ دید۔ تاریخ اینست ؎

خلد کو جب حضرتِ سوداؔ گئے | فکر میں تاریخ کے ماہر ہوئے
بولے منصف دور کر پائے عناد | شاعرانِ ہند کا سر در گیا

چوں تعمیۂ ایں تاریخ خلافِ قانونِ مورخان بود در خیال فقیر گزشت کہ چنیں شخص را تاریخ گوئے بایست آخر ہماں روز از تائید فیض ربانی تاریخ وفات آں مرحوم ومغفور بے کم وکاست از خامۂ خیال سحر کارِ مولف بیروں تراویدہ واز غایت انبساط وسرور کہ از موزونی ایں مصرعہ فصیحہ مادہ تاریخ کہ کاملانِ ایں فن را بدشواری دست دہد خود طبیعت خود را ہزار آفریں گفتہ، آرے تاریخ چنیں شخص چنیں می باید۔ تاریخ۔

مرزا رفیع آنکہ زاشعار ہندیش | ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان غلو
تاگہ چو در نوشت بساطِ حیات را | گردید مدفنش زقضا خاک لکھنؤ
تاریخ رحلتش بدر آورد مصحفیؔ | سوداؔ کجا و آں سخن دلفریب او

من کلامہ۔ غزل سر دیوان اوست۔

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا | جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

---

(۱) عزیزے دن خ)

پردے کو یقیں کے درِ دل سیتے اٹھا دیکھ
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا
اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہی خزاں کا
دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں حسن[۱] گراں کا
سودا جو کبھو گوش سی ہمت کے سنے تو
مضموں ہی[۲] یہی ہی جرس دل کی فغاں کا

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں
جس سی پوچھا میں دل خوش ہی کہیں دنیا میں
رو دیا اس نے اور اتنا ہی کہا کہتے ہیں

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
میری طرح فریفتہ ہووے خدا کرے
ظالم ہماری نعش کو تشہیر ہے ضرور
آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے

عجب بیداد مجھ پر یہ مرا صیاد کرتا ہے
دکھاتا ہے اسے مجھکو جسے آزاد کرتا ہی

اے دیدہ خانماں تو مرا ہی ڈبو سکا
لیکن غبار یار کے دل کا نہ ہو سکا
سودا قمار عشق میں شیریں سی کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہی عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تصور میں ترے کہیو صبا اس لاابالی سی
گلے لگ لگ میں رو دیا رات تصویر نہالی سے

---

(۱) حسن گراں دن خ میں بجنسہ "جنس گراں" ہونا چاہیئے۔ (۲) مضموں یہی ہی دن خ،

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا — کچھ آگ بچ رہی تھی کہ عاشق کا دل بنا

جو گذری مجھ پہ مت اُسے کہو ہوا سو ہوا — بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر — مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا
پہنچ چکا ہے سرِ زخم دل تلک یارو — کوئی سیو کوئی مرہم رکھو ہوا سو ہوا
کہے ہے سن کے مری سرگذشت وہ بے رحم — یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا
خدا کے واسطے آ در گذر گنہ سے میرے — نہ ہوگا پھر کبھو اے تندخو ہوا سو ہوا
دیا اُسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا — پھر آگے دیکھیے جو ہو سو ہو ہوا سو ہوا

حالِ دل سے مرے جب تک وہ خبردار نہ تھا — جز دمِ سرد کوئی محرمِ اسرار نہ تھا
جو عمل چاہیے کیجے مرے دکھ دینے کا — وہ نہ کیجے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا
پیار و اشفاق و وفا مہر و محبت الطاف — دل کو جس روز لیا کون سا اقرار نہ تھا
صحبتوں کا نہ کرو غیر کی مجھ سے اخفا — کونسی شب تھی کہ میں واں پسِ دیوار نہ تھا
شب تری بزم میں سودا کو میں دیکھا جب تک — کچھ خموشی کے سوا اس کو سروکار نہ تھا

میں دشمنِ جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا — سو حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ
کہتا ہے نگہ سے یہ ترا گوشۂ ابرو — دیکھے جو کوئی خون گرفتہ تو لگا لا
اتنا ہے تو یوسف سے مشابہ کہ عدم کے — پردہ میں چھپا اُس کے تئیں تجکو نکالا

سودا گرفتہ دل کو نہ لاؤ سخن کے بیچ — جوں غنچہ سو زباں ہیں اُس کے دہن کے بیچ
پانی ہو بہہ گئے مرے اعضا بدن کی راہ — باقی ہے جوں حباب نفس پیرہن کے بیچ

جس نے نہ دیکھی ہو شفقِ صبح کی بہار — آ کر ترے شہید کو دیکھے کفن کے بیچ
کل رخصتِ بہار تھی شبنم صفت میں زور — رویا ہر ایک گل کے گلے لگ چمن کے بیچ
سودا ہیں اپنے یار سے چاہا کہ کچھ کہوں — ایسی کی اک نگہ کہ رہی من کی من کے بیچ

یہ ہاتھ ہو سکے زلف اُس کی سے کہاں گستاخ — نسیم و شانہ اگر ہو تو ہووے دہاں گستاخ
ضرور ہے ادبِ خفتگانِ خاک اے یار — قدم زمیں پہ نہ رکھ زیرِ آسماں گستاخ

شبنم کرے ہے دامنِ گل شست و شو ہنوز — بلبل کے خون کا نہ گیا رنگ و بو ہنوز
ہمرہ صبا کے خاک بھی میری ہے دربدر — جاتی نہیں ہے مجھ سے تری جستجو ہنوز

قد کو ترے جس جگہ مشقِ خرامِ ناز ہے — اُس جگہ شورِ قیامت فرشِ پا انداز ہے
خط کے آتے ہی چلے اکثر غلامی سے نکل — بندہ پرور دیکھئے آگے ہنوز آغاز ہے
شاعرانِ ہند کا تو گو کہ پیغمبر نہیں — پر سخن تجھنے میں اے سودا تجھے اعجاز ہے

کیا جانئے کس کس سے نگہ اس کی لڑی ہے — جس کوچہ میں جا دیکھو تو اک لوتھ پڑی ہے
ٹھہرا ہے تری چال میں اور زلف میں جھگڑا — ہر ایک یہ کہتی ہے کہ اٹک مجھ میں بڑی ہے
گو پیر ہوئی شاعری سودا کی جوانو — تم سے نہ کھنچے گی یہ کماں سخت کڑی ہے

سودا جوں شمع نہیں گرمیٔ بازار مجھے — ہوں میں وہ جنس کہ آتش دے خریدار مجھے
ہے قسم تجھ کو فلک دے تو جہاں تک چاہے — جلوۂ حسن اُسے حسرتِ دیدار مجھے
ہوں تصدق ترے اے عالمِ فانوسِ خیال — گو تحیر نے کیا صورتِ دیوار مجھے

اے غمِ یار مرا خون جگر کتنا کچھ
نظر آتی ہے فرا خورتری دشوار مجھے
نہ پھرا ملکِ عدم سے کوئی یار لے سودا
جانا اب اُن کی خبر لینے کو لاچار[1] مجھے

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

نہ بھول اے آرسی گر یار سے تجھ کو محبت ہے
بھروسا کچھ نہیں اس کا یہ منہ دیکھی کی الفت ہے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے خدا جانے مجھ ساتھ وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

اس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آوے
بجلی کو دمِ سرد سے جس کی حذر آوے
ٹک داغ سے چھاتی کے سرک جائے جو پھاہا
آتش کے تئیں قدرتِ خالق نظر آوے
دے شکوہ کی رخصت جو ہمیں شرمِ محبت
غنچہ کی طرح ٹکڑے ہو منہ تک جگر آوے
افعی کی یہ طاقت ہے کہ اُس سے بسر آوے
وہ زلف سیہ اپنی اگر لہر پر آوے
سب کام نکلتے ہیں فلک تجھ سے ولیکن
میرے دلِ ناشاد کی امید بر آوے
نامہ کا جواب آنا تو معلوم ہے اے کاش
قاصد کے بد و نیک کی مجھ تک خبر آوے
دیتا ہے کوئی مرغِ دل اُس شوخ کو سودا
کیا قہر کیا تو نے غضب تیرے پر آوے
اب لے تو گیا ہے یہ اسے دیکھیو نادان
پل میں وہ اڑا تا نہ اگر بال و پر آوے

اے آہ تیری قدر اثر نے تو نہ جانی
گو تجھ کو لقب ہم نے دیا عرش مکانی

---

(۱) ناچار (ن خ)

کیا کیا ملے لیلیٰ نشان خاک میں سودا
گو اپنے تھی محبوب کی دیکھی نہ جوانی
جس سمت نظر موجِ سراب آوے تو یہ جان
ہووے گی کسو زلفِ چلیپا کی نشانی

بھر نظر تجھکو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

نہیں معلوم کیا اس سینہ میں جوں شمع جلتا ہے
دھواں نوک زباں سے بات کرنے میں نکلتا ہے
مجھے تشنیع گو کرتا ہے ناصح، یہ جو آنکھیں ہیں
بس ان خانہ خرابوں سے کسو کا کچھ بھی چلتا ہے
خبر لے جلد سودا کی وگرنہ میں یہ دیکھوں ہوں
سرہانے اس کے بیٹھا ہاتھ سے تو ہاتھ ملتا ہے

صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے
اک وضع ہے کہ وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے
دشنام تو دینے کی قسم کھائی ہے لیکن
جب دیکھے ہے مجھکو وہ تو اک جنبش لب ہے
یعقوب ترے عہد میں یوسف کو جو روتا
کہتا میں کہ یہ فہم پیمبر سے عجب ہے
کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سودا
جوں ذات خدا جس کا حسب ہے نہ نسب ہے

جب اپنے بندِ قبا تم نے جان کھول دیے
صبا نے باغ میں جا گل کے کان کھول دیے

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے
اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

عارض پہ حسن خط سے دمک کیا ہے نور کی
یہ دود لڑ رہا ہے تجلی سے طور کی
طوفان طرازیِ مژۂ عاشقاں نہ پوچھ
کچھ آبرو رہی ہے نہ چشم تنور کی

یاس اب ہمارے نکہتِ گل کو نہ لا نسیم
دل سے ہوس چمن کی اسیری نے دور کی
سودا کو عاشقی سے رکھا چاہتا ہے باز
ناصح نصیحت اپنی سے ، خوبی شعور کی

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لیکے بولتا ہے جو تو اب یہ بولیاں
ہر بات میں کنایہ و ہر یک سخن میں رمز
ہر آن میں کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں
حیرت نے مثل آئینہ مند نے نہ دیں کبھو
آنکھیں کسی نے دید کو تیری جو کھولیاں
کس نے کیا خرام چمن میں کہ اب صبا
لاتی ہے بوئے ناز سی بھر بھر کے جھولیاں
اندامِ گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سی چاک
جوں خوش قدوں کے بر میں مسکتی ہیں چولیاں
کیا جاہیئے تجھے سرِ انگشت رچنا
جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں
سودا کے ساتھ صاف نہ رہتی تھی زلفِ یار[1]
شانہ نے پیچ پڑ کے گرہ اُس کی کھولیاں

(۹) سبقت

مرزا مغل سبقت تخلص خلف مرزا علی اکبر۔ بزرگانش اہل خطہ فارس بودہ اند واز چند پشت در شاہجہاں آباد سکونت داشتند۔ بعد از وقوع ہنگامہ شاہ بہ لکھنؤ رسیدہ دریں جا توطن اختیار کردند۔ مشارٌ الیہ جوان قریب بہ فضیلت است و ہمیں جا نشو و نما یافتہ در خوش اخلاقی و آداب صحبت و طریق تواضع و خندہ روئی و شگفتہ دلی باغ و بہار دیدنش۔ بمقتضائے موزونی طبع فکرِ شعرِ ہندی موافقِ رواج زمانہ کردہ واز نظر قلندر بخش جرأت گذرانیدہ۔ اما چوں نیک نگاہ کنی بہ سبب معلوماتِ فن و آگاہیٔ نظم و نثر و تصنیفِ قصیدہ غرا رتبۂ شاعریش در نظمِ قصیدہ از ادستاد در گذشتہ۔ از وست۔

عرقِ شرم رکھے کیونکہ نہ پیشانیٔ شمع
ہے خجل منہ سے ترے چہرۂ نورانیٔ شمع

---

(۱) یار سے (ن خ)

کچھ بھی پروانہ کی رمز اُس پہ نہ مفہوم ہوئی
جھوٹ نکلا سبھی دعوائے زباندانی شمع
سوزِ پروانہ ہویدا ہے سبھوں پر سبقت
پر کسو پر نہیں ظاہر غمِ نہانی شمع

غم نہیں کچھ شیشۂ دل گر بنے اور ٹوٹ جائے
ہے الم اُس کا جو شئے بہتر بنے اور ٹوٹ جائے
قصد مجھ بے بیگنہ کے قتل کا جب دل میں ہو
کیوں نہ پھر قاتل کا نت خنجر بنے اور ٹوٹ جائے
سوچ میں رہیئے نہ کیونکر قالبِ انساں کو دیکھ
خاک کے پتلے کا یوں پیکر بنے اور ٹوٹ جائے

کیا کہوں اے ہمدمو میرا کہاں دل لگ گیا
لگ نہیں سکتا کسو کے جو وہاں دل لگ گیا
جائیں اب کیونکر کہیں ہم میکدہ کو چھوڑ کر
آتے ہی اپنا تو اے ساقی یہاں دل لگ گیا
ناقۂ لیلیٰ جو ٹھیرا وادیِ مجنوں میں آہ
بولے کیا تیرا بھی یہاں اے ساربان دل لگ گیا

رباعی

بن تیرے میں کیا کہوں جو مجھ پر گذرا
جو کچھ کہ کہا کسو نے سب کر گذرا
یہاں تک کہ گذر گیا میں اپنے جی سے
لیکن نہ ستم سے اپنے تو در گذرا

دیگر

مت یاد دلاؤ وصل کی راتوں کو
پوچھو کوئی نہ اُن ملاقاتوں کو
پھرون نہیں بات پھر نکلتی منہ سے
کرتا ہوں جب اُس کی یاد میں باتوں کو

دیگر

شور و فغاں مدام ہم کرتے ہیں
فرقت میں کسی کے آہ دُکھ بھرتے ہیں
افسوس ہے اپنی زندگانی افسوس
ہیں نزع میں جیتے ہیں نہ ہم مرتے ہیں

---

(۱) پتھر (ن خ)

دیگر

سبقت اتنا تو کس لئے روتا ہے | اور جان توانی کیوں عبث کھوتا ہے
کہتے نہ تھے ہم کہ عاشقی مت کرنا | عاشق ہونے میں بس یہی ہوتا ہے

دیگر

بیداد و ستم اگرچہ ہے فن تیرا | لیکن میں دوست کیا کہ دشمن تیرا
ترسا ترسا جو تونے مارا مجھکو | اب ہاتھ مرا ہے اور دامن تیرا

دیگر

الفت نے ہے جس کی ہم کو مارا افسوس | وہ کر گیا صاف اب کنارا افسوس
سبقت دل و جان سے ہو گئے ہم جس کے | افسوس ہوا نہ وہ ہمارا افسوس

دیگر

اُس آفتِ جاں کو جب سے دیکھا دل نے | بس تب سے کیا ہے حشر برپا دل نے
شکوہ کریں کس کا اور شکایت کس کی | ہم کو تو کیا خراب و رسوا دل نے

ٹھنی ہے اب یہی دل میں کہ کم کسی سے ملیں | نہ کوئی ہم سے ملے اور نہ ہم کسی سے ملیں

اُٹھا دیتی ہے بیتابی ترے بن ہم جہاں بیٹھیں | کہیں لگتا نہیں ہے جی کدھر جاویں کہاں بیٹھیں
قیامت ہو ابھی برپا اُٹھے ہنگامۂ محشر | سر اپنا رکھ کے زانو پر جو ہم کر کے فغاں بیٹھیں

حرف الشین

(۱) شیدا

شاگرد میر محمدی بیدار، جوان ظریف الطبع بود۔ معاش بہ علاقہ بندی میکرد

وپیوستہ در ہم چشمان باعزت وحرمت بسر می برد۔ از مدتے در شاہجہاں ور گذشتہ۔ دیوانش در شہر موجود است۔ ازوست۔

لیکے دل لے دلرباؤ کیوں قسم کھاتے ہو تم
ہم نظر بازوں سے آگے سے کہاں جاتے ہو تم
اک نرالے شہر میں بانکے تمہیں پیدا ہوئے
ہر گھڑی تیغ و سپر لیلے کے دھمکاتے ہو تم
آگے تم سے کیا توقع ہو گی شیدا کو میاں
ایک بوسہ پر چھری تلوار تبلاتے ہو تم

شیدا سنبھل کے جانا کوچہ میں آج اس کے
پتھر لئے کھڑے ہیں ہاتھوں سے بیچ لڑکے

(۲) شگفتہ

مرزا سیف علی شگفتہ خلف نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم ومغفور جوان خوش خلق و باعلم وحیا۔ پیشتر بیان تخلص مے فرمود[۱]۔ شعر خود را بہ مرزا کاظم علی جوان می نمود۔ از چندے تبدیل تخلص نمودہ[۲] بجائے بیاں شگفتہ قرار دادہ۔ فکر سخن بعمدگی وصفائی تمام می کند و قصیدہ[۳] ہائے آبدار در سلک نظم کشیدہ اند۔ فقیر ایشاں را در لکھنؤ دیدہ بسیار بخوبی پیش می آیند۔ من اشعارہ۔

حکم اتنا نہیں کہ در کو دیکھ
میرے نالہ کے ٹک اثر کو دیکھ

پاس سے میرے وہ بت اٹھنے نہ پایا ہوتا
ایسا اسباب کوئی جمع خدایا ہوتا

بوسہ لیتے ہوئے ہم دیکھو ادب کرتے ہیں
گالیاں دیتے ہیں یہ آپ غضب کرتے ہیں

---

(۱) فرمودند ان نخ (۲) نمودند ان نخ (۳) کردہ ان نخ (۴) قصیدہ بجائے قصیدہ ہائے ان نخ

خرام ناز ترا بس مری نظر میں رہا   تمام عمر ہی بیٹھا میں رہ گذر میں رہا

آنکھیں چرا کے شب وہ بہانے سے اُٹھ گیا   حرف مروت آہ زمانے سے اُٹھ گیا

دل و جگر نہیں سینہ کے داغ کے نیچے   جلے پڑے ہیں پتنگے چراغ کے نیچے

سوز ہجراں سے ساز کرتا ہوں   تو نے جانا کہ اس کو صبر آیا

غم نہ کھا اے دل اگر شب زلف کی تاریک ہے   پاس ہی رُخ اُس کا یعنی صبح بھی نزدیک ہے

(۳) شرر

مرزا ابراہیم بیگ شرر تخلص کہ احوال ایشاں در تذکرۂ فارسی بہ شرح و بسط مرقوم است گاہ گاہے خیالِ شعر ہندی ہم می کرد دو سہ شعر از و بخاطر است۔

تمام عالم سے وہ پری وا اگر کبھی ہم کلام ہووے   کلام سنتے ہی اُس کے منہ سے تمام عالم تمام ہووے

سامعان کا نہ فقط سننے سے دم رُکتا ہے   سرگذشت اپنی جو لکھئے تو قلم رُکتا ہے

اسیروں کی زبانی اے صبا یہ اُس سے کہنی ہے   مگر گردن کا ڈورا کم ہے جو زنجیر پہنی ہے

(۴) شکوہ

محمد رضائی شکوہ از آشنایانِ مرزا قتیل جوانِ خوش خلق است۔ اگرچہ در شعر شہرت

نذارد اما بہ سبب موزونیٔ طبعِ سلیم انچہ گفتہ درست بستہ است۔ ازوست۔

تجھکو دلدار میں سمجھتا ہوں　　کیا غلط یار میں سمجھتا ہوں
گرچہ کہتے ہو پھر بھی آؤں گا　　ہے یہ انکار میں سمجھتا ہوں

مت مل تجھے کہتا تھا میں مل اُس سے زیادہ　　پائی نہ سزا اور بھی مل اس سے زیادہ

"ملے ہے شب و روز وہ شوخ سب سے　　مگر ایک اے آہ مجھ جاں بلب سے

نہ اس کا وصل ہے ممکن نہ تاب ہے دل کو　　عجب طرح کا الٰہی عذاب ہے دل کو

تھوڑی بھی نیک و بد کی گر وہ تمیز رکھے　　کافر ہو پھر جو اُس سے دل کو عزیز رکھے

عجب دن وہ ہوگا جو یہ بات ہوگی　　کہ اس سے ہماری ملاقات ہوگی

(۵) شایق

میاں پیر محمد شایق جوانِ صلاحیت شعار است۔ بیشترِ شعرِ خود را از نظرِ میاں ہاشمی کہ ذکر ایشاں در ردیف ہا خواہد آمد میگذرانید۔ حالا از چندے بہ حلقۂ شاگردیٔ قلندر بخش جرأت در آمدہ ازوست۔

کہ شیخ و برہمن دیر اور کعبہ کو[۲] کہتے ہیں　　رہِ دل سے ہیں غافل ورنہ اس میں دو نو رستے ہیں
تماشا دیکھ کر جراح کے مرہم لگانے کا　　ہمارے زخم ٹانکے توڑ کر کھل کھل کے ہنستے ہیں

---

(۱) یہ شعر ندارد۔ (ن خ) (۲) کے بجائے کر۔ (ن خ)

ذرا تو پٹ کی اوجھل سے دکھا مکھڑا کہ جی جاویں — یہ تیرے طالبِ دیدار مدت سے ترستے ہیں
جو لیکر جان عاشق سے ملیں خوبان ہندوستان — سمجھنا مت گراں شایق انھیں یہ تو بھی سستے ہیں

ظلم کا شیوہ کچھ اُس ظالم کو ایسا یاد ہے — ہر گھڑی ہر لحظہ اک تازہ ستم ایجاد ہے
نچلے ہو کر بیٹھتے یکدم نہیں یہ طفل اشک — چشم گریاں کی بھی کتنی ناخلف اولاد ہے
جائیے کعبہ کو یا کیجے صنم خانہ کا طوف — حضرتِ دل آپ کا اب کیا ہمیں ارشاد ہے
ہاشمی کی وضع پر تو گفتگو کر اختیار — ورنہ فن شعر میں شایق ہر اک استاد ہے

(۶) شہید

از دورۂ میر و مرزا است - پختہ گو معلوم می شود - دو شعر از و از عالم مکتب نشینی یاد دارم از وست -

گئے برباد اپنے نالہ و فریاد یا قسمت — بہار آخر ہوئی تب ہم ہوئے آزاد یا قسمت
شہید آخر مقدر تھا ہمیں حسرت میں جی دینا — ہمارے سر یہ آکر پھر گیا جلاد یا قسمت

(۷) شہرت

شاگرد جرأت است - از وست -

نامہ جوں ہاتھ میں لیا میں نے — دیکھ قاصد کو رو دیا میں نے

دل ڈھونڈتے ہو پاس مرے دل تو کہاں ہے — اک شعلۂ آتش ہے کہ پہلو میں نہاں ہے

دو دن کی ہے یہ بات کہ پھرتے تھے جن کے ساتھ — اب قبر پہ ہماری جو اُن کا گذار ہے

آپس میں یوں وہ کہتے ہیں سب پڑھ کے فاتحہ شہرت تھا جس کا نام یہ اُس کا مزار ہے

(۸) شوق

شاگرد مرزا رفیع - از وست -

شمعِ سنگِ لحدِ بادہ کشاں ہے شیشہ مصرعہ آہِ دلِ غمزدگان ہے شیشہ
حال ساقی سے مرا کچھ نہ کہا اور چلا میں جو دیکھا تو عجب پنبہ دہاں ہی شیشہ

دامن سے تیرے خون نہ رہے بن بھرے ہوئے چھوٹے نہ اپنا عشق تو قاتل مرے ہوئے
غارت گروں کے ہاتھ سے مانندِ طفلِ اشک جاتا ہوں نقدِ دل کو میں آگے دھرے ہوئے

شوق گو عشق میں رسوائے دو عالم ہی دلے شکر صد شکر ترے پیچھے تو بدنام نہیں

سرشکِ گرم سے ہے دل کباب درتہِ آب ہوا ہے چشم کا خانہ خراب درتہِ آب
عرق ڈھلک کے جبیں سے جو ذقن پہ گرا صفائی حسن سے پہنچا یہ آب درتہ آب
گئی ہی نیند سرشکوں کے شوق طوفاں سے محال عقل ہی آنکھوں کو خواب درتہ آب

حرف الصّاد

(۱) صفدری

از زمرۂ سلف است - از وست -

سبز جامہ بر میں لے کے رنگ بھینا ہی دیکھو شمعِ کافوری کو یہ فانوس مینا ہی دیکھو

موتیا رابیل پھولی ہی گلابی باغ میں
منہ پہ اُس گلرو کے جوں شبنم پسینا ہی دیکھو
حسن کے مہماں کی خاطر کی ہی حاضر حاضری
سبز خط لب کے نمکداں پر پودینا ہی دیکھو
خاتم دستِ سلیماں ہے پریرو کا دہن
لعل لب کا جس پہ یاقوتی نگینہ ہی دیکھو
گر رقیب ہاتھی ہی گھس کر بیٹ میں کرتا ہی کام
صفدری حکمت میں یار و شیخ پھینا ہی دیکھو

(۲) صفا

کہ ہیچ از نام و نشانش خبر نہ دارم مطلع ازو بہ سمع رسیدہ ایں است۔

محتسب جھوٹ ہی مے کس نی بھری شیشہ میں
رہ گئی ہی کہیں آنسو کی تری شیشہ میں

(۳) صادق

میر صادق علی صادق تخلص، فوجدار[1] خانِ حضرت شاہ عالم بہادر شاہ غازی جوان سعادتمند است و خود بہ فوجداریِ پیلانِ مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر عز و امتیاز دارد۔ گاہ گاہے بہ مقتضائے موزونیِ طبع و تبعتِ حضور فکرِ شعر کردہ و میکند و از نظرِ میر انشاء اللہ خاں می گذارند۔ ازوست۔

دے ملا خاک میں جب گردشِ افلاک ہوس
اس کے ملنے کی نکالے کوئی کیا خاک ہوس
صادق اب اور سرو کار نہیں اُس سے مگر
ایک بوسہ کی رکھے ہی دلِ غمناک ہوس

دوستی کیونکہ نبھے دیکھئے اب یار کے ساتھ
دیکھتا ہوں اُسے ہر وقت میں اغیار کے ساتھ

نصیب[2] اپنے کہاں ایسے جو اُس رخسار کو ملئے
زہے قسمت اگر مہندی ہی پائے یار کو ملئے

(۱) پسر فوجدار خاں۔ (ن خ) (۲) دوسرا مصرعہ غائب۔ (ن خ)

عرق⁽¹⁾ آلودہ گر اس کا انگرکھا ہاتھ آجاوے تو اس سے صادق اپنے سینۂ افگار کو ملئے

نہ آفتاب سے ہر ذرہ یہ چمکتا ہے وہ ایک نور ہے جو سب میں آ جھلکتا ہے
صبا لے آئی تھی بو باس کس کے کاکل کی کہ جس کی بو سے دماغ اب تلک مہکتا ہے
خدا ہی جانے اسے کیا ہوا ہے اے صادق کچھ آپ ہی آپ جو سینہ میں دل سلگتا ہے

جس نے دیکھا ہے تری جلوہ گری کا نقشا اس کو بھاتا ہے کب اے یار پری کا نقشا
تھی ہی چھب تختی غضب ایک تو اُس کافر کی تسپہ ہے قہر یہ پوشاک زری کا نقشا
جلد آ جلد دمِ بازپسیں ہیں میرے نظر آتا ہے چراغِ سحری کا نقشا
کوئی دیکھے جو مرا زخمِ جگر اے صادق تیر⁽²⁾ی بیداد کے ہے صاف سری کا نقشا

ہو نامِ خدا تجھ میں کیونکر نہ خود آرائی انداز سخن یہ کچھ چہرے کی وہ رعنائی
تھی ایک تو کُرتی ہی لاہی کی غضب تس پر ہے آفتِ جاں کافرا ایگنا کی یہ سگھڑائی
کچھ اُس سے اشاروں میں کہتا ہوں تو کہتا ہے دانتوں میں دبا انگلی اے لڑے یہ سوائی

(۴) صبا

لالہ کانجی مل صبا تخلص قوم کایستھ سکسینہ۔ وطن بزرگانش فیروزآباد و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ فقیر در ایامیکہ وارد ایں شہر بود چندے حسب اتفاق بر مکان⁽³⁾ اُ⁽⁴⁾ قیاں اقامت داشت۔ مشارٌ الیہ در آں ایام بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ

---

(۱) ن خ میں پہلا مصرعہ غائب۔ یہ دونوں مصرعے یعنی پہلے شعر کا پہلا اور دوسرے شعر کا دوسرا مل کر ایک شعر بنتا ہے۔ (۲) ن خ تیری بیداد کے ہے صاف سری کا نقشہ۔ (۳) دکان۔ (ن خ)

چیزے کہ بہ زبان خود می گفت آنرا از نظرِ فقیر باعتقاد تمام میگذرانید۔ تا انیکہ در عرصہ قلیل دیوان مختصرے درست ساخت طبعش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عمرش وفا میکرد زیادہ ازیں قدم برجادۂ ترقی می نہاد واحیف کہ بہ عمر بست و پنج سالگی در عین جوانی مدقوق شدہ درگزشت(۱)۔ ازوست۔

عبث ہے یہ تمھارا پاس میرے بار بار آنا
جدائی میں مجھے مشکل ہے اے یار و قرار آنا
یہی شغل اُس کے کوچہ میں ہے اب آٹھوں پہر اپنا
بصد امید جانا دن کو شب کو شرمسار آنا
ترے دردِ جدائی میں ترا عاشق گیا جی سے
صبا اُس گل کے دروازہ پہ یہ جا کر پکار آنا

جس روز ترے در پہ گذر ہم نے کیا تھا
اُس دن ہی تری خو سے حذر ہم نے کیا تھا
افسوس وہ آرام عدم میں بھی نہ پایا
جس کے لئے دنیا سے سفر ہم نے کیا تھا

سحر جب بسترِ راحت سے وہ رشکِ قمر اُٹھا
غلامی اُس کی میں خورشید لے تیغ و سپر اٹھا
ابھی تسکیں ہوئی تھی اک ذرا فریاد و زاری سے
لگا دل مضطرب ہونے کہ پھر درد جگر اٹھا
گلے پر میرے خنجر پھیر تا وہ اور بھی لیکن
ہوئی مجھ سے خطا اتنی کہ میں فریاد کر اٹھا
نہیں معلوم اے یارو صبا کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکایک آہ کر اٹھا

فنا ہیں ایک دن سب یہاں عمارت اور گھر کس کا
یہ دنیا و ہم ہے یار و پدر کس کا پسر کس کا
مجھے آتا ہے تجھ پر رحم اُس قاتل کے کوچہ میں
لئے جاتا ہے نامہ آج تو اے نامہ بر کس کا

دن عید کے جو مجھ سے وہ ناآشنا ملا
روٹھا تو تھا میں لیک گلے اُس کے جا ملا

---

(۱) "و داغ حسرت بر دل باقی ماندگان نہاد" درگزشت کے بعد دن خ۔

اس خاکدان سے جھاڑ کے دامن کو جوں صبا
ایسا گیا کہ پھر نہ سراغِ صبا ملا

چلے دامن اٹھا کر یہ کہو اُس شوخ قاتل سے
کہ یہ مدفن نظر آتا ہے رنگیں خونِ بسمل سے
تغیر رنگ میں تاب و تواں نے سمر ہی چھوڑی
رعیت جس طرح پھر جائے ہے معزول عامل سے
کہے تھا عاشقِ لیلیٰ کہ میں اب چل نہیں سکتا
مجھے لے ساربان تو باندھ لے دوڑا کی محمل سے
صبا ہم نے تو ہرگز کچھ نہ دیکھا جذبِ الفت میں
غلط یہ بات کہتے ہیں کہ دل کو راہ ہے دل سے

مجلس سے اُٹھ کے جب وہ رشکِ قمر گیا ہے
اپنا تو روتے روتے نورِ نظر گیا ہے
کیا سحر ہے کہ جاکر وہاں کا ہی ہو رہا ہے
اُس کی گلی میں یہاں سے جو نامہ بر گیا ہے
بھٹکا پھرے ہے مجنوں لیلیٰ کے قافلہ میں
یہ پوچھتا کہ یارو محمل کدھر گیا ہے
کیا تو نے کچھ صبا سے اے تندخو کہا تھا
روتا ہوا ادھر سے با چشمِ تر گیا ہے

ازل سے سوز تیرے عشق کا جو سر میں تھا میرے
گیا میں جی سے اپنے پر وہ سر سے گیا میرے
نہ آیا وہ مسیحا لب دمِ آخر بھی بالیں پر
موا تو میں ولے ارمان دِل میں رہا میرے

عاشقِ مضطر کا سوزِ دل نہاں کیونکر رہے
شمع کے شعلہ کی لے یا روزباں کیونکر رہے
اے صبا سچ ہے جدائی میں بقولِ مصحفی
دردمندِ دوست بے آہ و فغاں کیونکر رہے

ہاتھوں میں تیرے پیارے یہ طائرِ حنا ہے
یا مرغِ دل کسی کا بسمل ابھی کیا ہے

کبھی گلرو مرا جاکر جو دریا میں نہاتا ہے
فروغِ حسن سے گلزار پانی میں دکھاتا ہے

مصور جب کہ مارِ زلف کی تصویر کھینچے ہی   تو ہاتھ اپنا وہ دہشت سی دمِ تحریر کھینچے ہی

حرف الضاد

(۱) ضیا

میر ضیاء الدین ضیا تخلص گویند استفادۂ شعر در ابتدا از میر محمد تقی میر کردہ بطرف پورب آوارہ شدہ۔ رفتہ رفتہ[1] چند شعرش از زبانِ بعضے آشنایان بہ سمع رسیدہ۔ میر حسن مصنف مثنوی سحر البیان نسبت شاگردی خود بہ مشارٌ الیہ می رسانید[2] و بسیار ثناخوان و معتقد او بود۔ بندہ او را ندیدہ چند شعر کہ از و بہم رسیدہ ایں است۔

گھر ہی کو اس کے بھولا یا راہ پھیر گی ہی   یا رب تو خیر کیجو قاصد نے دیر کی ہے

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا   آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کمھلانے لگا
کل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگِ خلق   اس کے کوچہ میں ضیا پھر آج تو جانے لگا

کہا کیا جانے کیا میری طرف سی تجھ سی بدگو نے   کہ رفتہ رفتہ یہ احوال پہنچایا مرا تو نے

پلادے آب خنجر ہم کو قاتل تشنہ جاتے ہیں   جو کوئی مرتا ہی اس کے حلق میں پانی چواتے ہیں
ہی ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں   کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اڑاتے ہیں
ضیا رکھ ہاتھ سینہ پر خبر دل کی بھی لے ظالم   کہ آج آنسو ترے آنکھوں میں کچھ لوہو سے آتے ہیں

---

(۱) ن خ مکرر نہیں ہے   (۲) میرسانند بودند ن خ

حرف ط

طپش (۱)

محمد اسمٰعیل طپش تخلص عرف مرزا جان کہ مولد والدش بخارا است ۔ قوم مغل ، ہندوستان زا ازاولاد سید جلال بخاری ، جوانے است سپاہی پیشہ ، ادا بندو ادا پسند ، درسنِ شانزدہ سالگی طبعِ موزوں بہم رسانیدہ چندے بخدمتِ مرزا محمد یار بیگ سائل کہ ذکر ایشاں بر صدر گزشت مشقِ سخن نمودہ و بعد ازاں رجوع بہ خواجہ میر درد صاحب کردہ ۔ شعر را بشستگی و پاکیزگی تمام می گوید و ماسوائے ایں انچہ گویند وا لہ شعر است و خط صرافی (۱) و شاشتری ہر دو بخوبی تمام می نویسد و در خوش اختلاطی و آدمیت و وضعِ ملاقات و صحبت داری بسیار بے نظیر ۔ با فقیر از چند سال رابطۂ آشنائی درست دارد ۔ ازوست ۔

ساقی ہے دور مے ہے شبِ ماہتاب ہے، لیکن یہی غضب ہے کہ تو مستِ خواب ہے،

رشک سے تیرے لعلِ گلگوں کے غنچے پیاسے ہیں اپنے ہی خوں کے

دل کچھ اس وقت تلملاتا ہے آہ کون اس کو یاد آتا ہے

اس گلشنِ جہاں میں جو آیا سو داغ ہے گلچینِ روزگار سے کس کو فراغ ہے

---

(۱) صیرافی و شاشتری ۔ (ن خ نجیبہ)

نہ شہر بھاوے نہ صحرا لگے بھلا مجھکو — الٰہی بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوا مجھکو

ہرگز نہ سلاسل سے ہو تسخیر ہماری — جوں زلفِ بتاں چاہیئے زنجیر ہماری
کچھ تیرے سلیقہ سے پھنسے ہم نہیں صیاد — لائی ہے ہمیں دام میں تقدیر ہماری

دشنام کا نہیں کبھی انعام کا نہیں — خود کام وہ مِرا تو کسی کام کا نہیں
دینے لگا طپش جو دل اُن کو تو بول اُٹھے — رہنے دو اپنے پاس مُئے کام کا نہیں

خاک سے جام کیا جام کو پھر خاک کیا — تو نے کیا کیا نہ کچھ اے گردشِ افلاک کیا

کس کی طرف سے آج طپش تجھکو یاس ہے — سچ کہہ ہمارے سر کی قسم کیوں اُداس ہے
میں نے کہا کہ کہتا ہوں کچھ تم سے التماس — کہنے لگے کہ سمجھے ہیں جو التماس ہے

ناز ہے انداز ہے ہر دم نئی اک آن ہے — دلربائی کا غرض تیار سب سامان ہے۔
شاعر اکثر آئینہ رو کہتے ہیں معشوق کو — لیکن آئینہ کو بھی دیکھا تو یہاں حیران ہے

آئے تو ہو کہیں سے آخر ملے دلے تم — کیا ہو جو پھر مرے بھی لگ جاؤ اب گلے تم
آواز میری سُن کر غرفہ سے جھک کے بولا — کس واسطے کھڑے ہو دیوار کے تلے تم

کیسے ہی بیٹھوں ہوں محفل میں اس کی دور — اکل کھرا ہے کہ بیٹھا کرے ہے سب سے دور
خدا کسی کو نہ آزارِ عشق دیوے یار — کبھی ہمیں بھی یہی عارضہ تھا اب سے دور

کبھی تو پاؤں کی ٹھوکر سے تیری آشنا ہوتے — اگر خوابیدہ کوچہ میں ترے جوں نقشِ پا ہوتے

کیا جانیئے کس نے تجھے محبوب بنایا — پر جس نے بنایا ہے بہت خوب بنایا

جوں کہا میں دل کو میرا تجھ سوا کوئی نہیں — سنتے ہی بولا کہ ہاں سچ ہے ترا کوئی نہیں

ہماری شمع نے دیکھی جو اشکباری رات — کٹی بچاری کو روتے ہی روتے ساری رات
سرک سرک کے پلنگ پر مچل مچل جانا — یہی ادا ہمیں بس بھا گئی تمہاری رات

ترا وہ نامہ جو تھا ہم نے کر رکھا تعویذ — سو بعد مرگ ہوا وہ ہی قبر کا تعویذ
نہ تیغ چل سکی مجھ پہ تو منفعل ہو کر — لگا یہ کہنے کوئی اس کے ہے بندھا تعویذ

آپ کچھ نہ کورپر میرے ہی ہوتے ہیں خفا — میں یہ حیران ہوں کہ یارب میں نے کیا تقصیر کی

نہ گرا جب تنِ لاغر سے مرے قطرۂ خوں — کیا ہی جلاد پشیماں ہوا تلوار لگا

تو ہی لطفِ سخن مرا سمجھے — ورنہ کوئی یہ پہیلی کیا سمجھے
میں تو ناحق یہ قصہ کہہ کہہ کر — تم سے کہتا ہوں مدعا سمجھے
رفتہ رفتہ کبھی سمجھ لو گے — ابھی تو آپ کی بلا سمجھے

ترے شہید کے اسبابِ غم نظر آئے — شبِ فراق کے کالے علم نظر آئے

(۲) طالب

طالب حسین خاں طالب تخلص پسر میاں عسکری جوانِ رعنا و کشیدہ قامت و خوش خلق و خوش تقریر کہ داروغگیٔ خاصۂ مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر امتیاز تمام دارد۔ پیش ازیں بہ اقتضائے صحبتِ مشاعرہ و شرکت جلسۂ یارانِ موزوں الطبع برائے خوشیٔ مزاج اقدس در غزلہائے طرحیٔ حضور چیزے کہ موزوں کردہ بود آں را بہ نظرِ میر انشاء اللہ خاں کہ مرتبۂ دوستیش باایشاں بہ مرتبۂ برادری کشیدہ گذرانده۔ چوں بہ فقیر ہم باعتقادِ تمام پیش می آید چند شعرش کہ بہم رسیدہ می نویسد۔ از وست۔

مجھ سے جب آنکھ وہ ملاتا ہے — دل ہی سینہ میں لوٹ جاتا ہے
غیر سے مل کے شعلہ خو ناحق — کیوں جلوں کے تئیں جلاتا ہے
مژدہ اے قیس تیری وادی میں — ناقۂ لیلیٰ کا آج آتا ہے
غیر سے کر کے بخت و پرانی — سخت تو جی مرا پکاتا ہے
آج طالب کا عشق میں تیرے — جلد آ ورنہ جی ہی جاتا ہے

اشک یوں جم گئے ہیں اپنی بھی مژگاں سے لپٹ — اوس جیسی کہ رہے خار مغیلاں سے لپٹ
دشت میں آہِ شرر بار جو طالب نے بھری — ایک شعلہ گیا خاشاکِ بیاباں سے لپٹ

حرف العین

(۱) عارف

محمد عارف رفوگر کہ عارف تخلص مے کرد اصلش از کشمیر است و خودش در شاہجہاں آباد

نشو ونما یافتہ (۱) و جوانِ و پیر شدہ ۔ معاصرِ میر و مرزا است ۔ شعر را بہ تلاشِ تمام می گفت و گاہ گاہے بطورِ غنی خیالِ شعر فارسی ہم کردہ ۔ دیوانش بعد فوتش بہ تدبیرِ یکے از آشنایان صورت تدوین گرفتہ ۔ فقیر ہر گاہ بہ دوکانش میرفت بسیار بہ دل گرمی پیش می آمد ۔ ازوست ۔

اس ابر میں بے ساقی دمے جی یہ بنی ہے ہر بوند کا کھانا مجھے ہیرے کی کنی ہے

ہمیشہ دل میں خیالِ نگار گذرے ہے اسی خیال میں لیل و نہار گذرے ہے
نگاہ یوں دلِ عارف سے یار گزرے ہے کہ جس طرح سے کہ صابن سے تار گذرے ہے
چڑھا ہے خونِ شہیدانِ عشق بر سرِ چرخ شفق نہیں ہے یہ لوہو کی دھار گذرے ہے

طفلِ ہولی باز کے ہاتھوں سے بچنا ہے محال موٹھ سے چلتی ہے جو چلتی ہے یہاں مشتِ گلال

کوئی چھپتی ہیں پیار کی آنکھیں اُن سے ہوتا ہے آشکارا خلوص

دخترِ رز سے جا کہو کہ ملے ورنہ عارف افیم کھاتا ہے

عظیم
(۲)

مرزا عظیم بیگ عظیم تخلص اگرچہ شہرت بہ شاگردی مرزا رفیع سودا دارد اما در ابتدا چندی از شاہ حاتم استفادہ کردہ (۲) گویند چند روز در فرخ آباد کسوتِ قلندری بر خود (۳) داشت ۔ حالا باز در لباس دنیائی آمدہ ۔ فقیر او را در شاہجہان آباد دیدہ جوانِ چیچک رو بود اکثر در مشاعرہا می آمد و بر صدرِ مجلس می نشست ۔ دعوائے شاعری خیلے در دماغش جا داشت

(۱) "و" ندارد (ن خ) (ن) میں ۔ (خ ۔ ر) (۲) گرفتہ ۔ (ن خ) (۳) بر خود راست کردہ بود (ن خ)

ہیچ کس را بہ خاطر نمی آورد و خود را از ہمہ ممتاز میدانست با آنکہ ہیچ علم و فن ندارد، مردِ سپاہی پیشہ است۔ در شعر تلاشہائے نمایاں می کند۔ یک دو قصیدہ ہم بقوتِ تمام گفتہ۔ دیوانش بلا تشبیہہ بہ شکلِ حمائل واقع شدہ۔ از وست۔

گل چشمِ خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ اک تختۂ چمن تھا

کیجو عظیمؔ کو بھی یارب غریقِ رحمت
آوارۂ جنوں "تھا"(۱) اک صاحبِ سخن تھا

اور معنی بند ایسا ہندی زباں کا صائب
ہندوستاں سے لے کر مشہور تا دکن تھا

اک دن جو گھر سے نکلا خطِ شعاعی صورت
بکھرا ہوا بدن پر پیرتار پیرہن تھا

اور ماسوائے اس کے کہتے ہیں مرتے مرتے
عریاں تنی سوا اُس کا خو گر زبس بدن تھا

دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

یہاں عذر پذیرا ہو بُرے سو نہ بھلے سو
جوں غنچہ زباں نکلے ہی تنگ لب کے ہلے سے

ابھرے ہی تو اے شیشہ تبھی اپنے دموں پر
نکلا ہے ترا ہاتھ جو پتھر کے ستلے سے

کہتے تھے دلا شیریں لبوں سو نہ مل اتنا
اب شل مگس فائدہ کیا ہاتھ ملے سے

چھپتا ہے کوئی شمع صفت سوزِ دل اپنا
سر کاٹو اگر تو ہو نمودار گلے سے

گلریز کی مانند جز آتش کے عظیمؔ اب
لائے نہ کبھی بیل مری پھول پھلے سے

پاسِ سخن پھبے ہی یہاں اس کی شان پر
مانندِ خامہ شے ہے جو سر اپنا زبان پر

تقریرِ سرگذشت نہ پوچھو کہ خامہ وار
آتا ہے گریہ ہر سرِ حرفِ بیان پر

گھر میں بھی اپنے آئینہ ساں منتظرِ ترا
حیراں(۲) کھڑا رہوں ہوں سدا آستان پر

نام آوری جہان میں ہے باعثِ کلنک
نازاں نہ جوں نگیں ہو تو نام و نشان پر

---

(۱) تھا دن نخ (۲) حیراں سا کھڑا رہوں الخ دن نخ بجنسہ

دل کے بھی غم سے ٹکڑے ہوئے اپنے قال پر
جوں غنچہ تب زبان کھلی عرضِ حال پر
فارغ ہیں کشمکش سے جہاں کے شکستہ دل
پہنچے نہ ہاتھ شانہ کا چینی کے بال پر

غنیمت ہے عظیم اس جا جو نفریں سن نہ تو اُٹھے
پڑے تحسین چوٹھے بھاڑ میں اور آفریں ڈوبے

(۳) عاقل

عاقل شاہ عاقل تخلص جوانے بود سیاح در شاہجہاں آباد اکثر بہ بندہ خانہ برائے شنیدنِ اشعارِ فقیر می آمد و بسیار محظوظ می شد خود ہم چیزے موزوں می کرد۔ ازوست[1]

دیکھتے ہیں جو کوئی شہر جہاں آباد کو
وے تو کب کہتے ہیں ویران رسم نو ایجاد کو
قید بھی یہاں کچھ نہیں اور چھوٹ بھی سکتے نہیں
واہ واہ اس دام کو اور آفریں صیاد کو
دیکھیں سب کچھ اور نہ دیکھیں کیا نظر بندی ہے یہ
دیکھئے اس کام کو اور کام کے اُستاد کو
اپنے ہاتھوں آپ ہی کرتے ہیں سر تن سے جدا
ورنہ کیا طاقت ہے آوے اس جگہ جلاد کو
یاد ہے اس کی تو عاقل کوئی بھی غافل نہیں
پر بڑی یہ یاد ہے جو بھولے اپنی یاد کو

(۴) عیش

مرزا حسین رضا عیش تخلص شاگردِ میر سوز صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ جوانِ خندہ روے و خوش خلق و متواضع و خوب میں دیدمش۔ ازوست۔

وہ اگر آوے پشتِ بام کہیں
میں بھی کرلوں اُسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ دے ساقی
ایک بار ہی تو بھر کے جام کہیں
یہ غزل عیش ہے تصدقِ سوز
مجھ سے ہوتی تھی انصرام کہیں

---

(۱) ایں غزل یادگار اوست۔ (ان خ)

(۵) عشقی

مراد آبادی فقیر او را در آنوله دیده بود شعرے ازو بہ خاطر است۔

کوئی تو ہے گلچہرہ کوئی سرو رواں ہے
دیکھا تو یہاں ایک سے ایک آفتِ جاں ہے

(۶) عظیم

جوانے بود سپاہی پیشہ یک غزل خود در آنولہ پیشِ فقیر خواندہ بود۔ سہ شعر ازو انتخاب افتاد اینست[1]۔

کارواں اشک کا ہوتا ہے رواں آنکھوں سے
تم کو بھی آہ و فغاں ہم یہ خبر کرتے ہیں

کوئی اگر تم میں سے چلتا ہے تو آجائے شتاب
ورنہ اب یار تو کوئی دم میں سفر کرتے ہیں

کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار
جبکہ ہم دل میں عظیمؔ اپنے نظر کرتے ہیں

(۷) عشق

شاہ گھسیٹائی عشق کہ در عظیم آباد بسیار بہ عزت و حرمت بسر می بردازوست۔

روز و شب تجھ سے گو ملا کیجے
چین اس پر نہ ہو تو کیا کیجے

جتنے جور و ستم ہوں تو کر دیکھ
یہ نہ ہوگا کبھی گلا کیجے

دل نے مجھکو بہت ستایا ہے
کسی کافرسے آشنا کیجے

ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
نہ دیکھا سو دیکھا جو دیکھا نہ دیکھا

وہ آیا نظر بار ہا پر کسی نے
یہ حیرت ہے اس کا سراپا نہ دیکھا

---

(۱) ازدست بجائے اینست (ن خ)

تری چینِ ابرو مرا غنچۂ دل — یہ عقدے ہیں وہ جن کو کُھلتا نہ دیکھا
خدا کی خدائی ہے قائم پہ تجھ سا — نہ دیکھا نہ دیکھا، نہ دیکھا نہ دیکھا
میں رو رو کے اشکوں سے کی شیشہ بازی — یہ ہنس ہنس کے تو نے تماشا نہ دیکھا
خدا جانے کیا منہ بھر آئی ہے اس کو — لبِ زخمِ دل جو کبھی وا نہ دیکھا
سبھی دعوئِ عشق رکھتے ہیں یارو — پہ کوئی عشق سا ہم نے رسوا نہ دیکھا

سو رات بجرِ غم میں فلک تو ڈبو سکا — پر ایک دن وصال کا تجھ سے نہ ہو سکا
کس رو سے طعنہ زن ہو خراباتیوں کو شیخ — خرقہ کو اپنے وہ تو ریا سے نہ دھو سکا

دمبدم دل کو مر نہیں آتا — اس پہ بھی اُس سے بر نہیں آتا
خانماں کر چکا ہوں میں برباد — اس پہ میرے وہ گھر نہیں آتا
تو جو اتنا ہمیں ستاتا ہے — کیا خدا کا بھی ڈر نہیں آتا
خاک جو شہر میں لگی اُڑنے — عشق کیا یہ چشم تر نہیں آتا

کہنے کو اِدھر اُدھر گئے ہم — تھے تیری طرف جدھر گئے ہم
تا جان نہ ہو عدو ل حکمی — تو نے کہا مر تو مر گئے ہم

ہم نے تو خاک بھی دیکھا نہ اثر رونے میں — عمر کیوں کھوتے ہو اے دیدۂ تر رونے میں
رات کب آئے تھے اور کب گئے معلوم نہیں — جان اتنی نہ رہی ہم کو خبر رونے میں
جب تلک اشک تھمیں بیٹھ اگر آیا ہے — تیری صورت نہیں آتی ہے نظر رونے میں
تجھکو اے دیدۂ تر شغل ہے رونا لیکن — ڈوبا جاتا ہے یہاں دل کا نگر رونے میں

جب تلک اشک تھے آنکھوں سے بہانے نکلے — اب نکلتے ہیں پڑے لختِ جگر رونے میں
عالمِ عشق میں مجنوں بھی بڑا گاڑھا تھا — یار مجنوں سے بھی ہم گاڑھے ہیں رونے میں

کوئی بت کہتے ہیں اور کوئی خدا کہتے ہیں — ہم سے جو پوچھو تو دونوں سے جدا کہتے ہیں
دل کے دینے کے برابر کوئی تقصیر نہیں — جو مجھے کہتے ہیں سو یارو بجا کہتے ہیں

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں — عشق رخصت دے تو شورِ حشر اب برپا کروں

جوں آفتابِ تاباں گو نام کو نہاں ہوں — یہ پرتوا ہی تیرا اٹک دیکھ میں کہاں ہوں
گو نام اور نشاں ہے ظاہر میں یارو میرا — جو دیکھو فی الحقیقت ہوں وہم یا گماں ہوں
باتیں نہ سُن تو میری جل جائے گا دوانے — میں برقِ آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

دل غم سے خوں ہو بہہ گیا اور آنسو تھم چلے — آتا ہی جان ابھی کوئی دم میں ہم چلے

جاتے ہوئے دم کو کوئی روکے بھلا کب تک — آتا ہے تو آجا کہ نفس باقی ہے اب تک
پہنچی ہے میاں ضعف سے یہ عشق کی حالت — جو سانس یکایک نہیں آسکتی ہے لب تک

دل سا جگر جو رکھے سو اس سے دو بدو ہو — منہ دیکھیو آئینہ کا جو اُس کے روبرو ہو
حسرت کو دل میں مت رکھ شمشیر آزمالے — ہم مر گئے بلا سے دنیا ہو اور تو ہو
حالت کو دیکھ میری کہتے ہیں گبر و مومن — ہو مشکل اس کی آساں یارب یا یک سو ہو

مری آنکھوں میں بستا اک جہاں تھا — ڈبایا آہ اشکوں نے جو یہاں تھا
خیالِ غیر واں آنے نہ پایا — نفس کوچہ میں دل کے پاسباں تھا

نہو مغرور اتنا بلبلو تم ہمارا بھی کبھی یہاں آشیاں تھا
مگر نعرہ کیا تھا عشق تو نے زباں پر برق کی جو اُلہ[1] یہاں تھا

کیا کیا جفائیں ظالم ہم نے تری سہیں ہیں لیکن شکایتوں سے لب آشنا نہیں ہیں
کہہ بعد قتل مجھکو کس طرح چین آوے جو حسرتیں تھیں دل میں سب جوں کی توں وہیں ہیں

اوروں کا جگر یار جو تیروں سے سئے ہے یہ عاشقِ جاں باختہ کس دن کے لئے ہے

نے دردِ دل ہے باقی نے آہ نے فغاں ہے اے سوزِ عشق سچ کہہ تو ان دنوں کہاں ہے

دیکھنے[2] بن اُس کے اکدم چین سے رہتا نہیں اس دلِ کافر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم

لے آسماں اپنا اور یہ زمیں دو نو عاشق تو چھوڑ بیٹھے دنیا و دیں دو نو

رباعی

کعبہ میں بہت خاک اڑائی ہم نے بت خانہ میں صورت بھی نہ پائی ہم نے
آخر کو کہا عشق نے ہم سے کچھ اور دیکھا تو یونہیں عمر گنوائی ہم نے

دیگر

دنیا کے لئے نہ ترک تازی کیجے ہر طرح سے عشق حیلہ سازی کیجے
ٹک دل میں سمجھ کے اپنے انصاف تو کر کس زیست پہ اتنی ٹہ بازی کیجے

---

(۱) جو الا یہاں تھا (ن خ) (۲) دیکھے (ن خ)

دیگر

مت پوچھ کہ تجھ بغیر کیونکر گذری — دل ہی جانے ہے آہ جونکر گذری
فریاد و فغان و آہ کرتے ہی رہے — اپنی تو تمام عمر یونکر گذری

حرف غین

(۱) غضنفر

غضنفر علی خاں غضنفر تخلص عرف میاں کھلو[۱]. نبیرۂ پسری غلام حسین خاں کردرہ که در اصل ایشاں کھتری بودہ اند و از مال دنیا نیز بہرۂ وافی داشتند. جوانِ خلیق و خوش وضع است و بہ شاگردیٔ قلندر بخش جرأت امتیاز تمام دارد۔ ازوست۔

تصور میں ہوا اس سے دو بدو ہم — کیا کرتے ہیں پہروں گفتگو ہم
گیا اب وہ گریباں ہی کہ جس کے — سدا رہتے تھے مشتاقِ رفو ہم
کھنچی دیکھی جو کل تصویرِ مجنوں — تو گویا بیٹھے تھے بس ہو بہو ہم
کفن دے ہم کو دو آنسو بہانا — کہ بعد از مرگ پاویں آبرو ہم
نہ آیا مرتے دم بھی وہ غضنفر — چلے دنیا سے کیا پر آرزو ہم

(۲) غیرت

شاگردِ جرأت ۔ ازوست۔

یا کسی ڈھب سے آپ آجاؤ جی — یا ہمیں کو کہیں بلاؤ جی
جان آنکھوں میں آ رہی ہے جان — اب تو صورت ہمیں دکھاؤ جی

---

(۱) کھیلو۔ (ر)

زندگی سے تنگ آیا ہوں ۔۔۔ بس اب آگے تو مت ستاؤ جی
وہ بگاڑے ہزار تم غیرت ۔۔۔ اب اُسی سے بنائے جاؤ جی

(۳) غلامی

تخلص شاہ غلام محمد از قدما است۔ با شاہ حاتم دوستی داشت و اکثر مثل ایشاں بر تکیہ شاہ تسلیم می نشست۔ شعرے از دست۔

کل جس کی نگہ تیر سی براں ہوئی دل پر ۔۔۔ پھر آج وہی دور سے قاتل نظر آیا

حرف الفا

(۱) فراق

تخلص ثناء اللہ خاں برادر زادۂ ہدایت خاں ہدایت جوانِ حلیم و سلیم و خوش فکر و شیریں گفتار استفادۂ شعر از خواجہ میر درد کردہ بلکہ ذات شریفش را ہمیشہ از کاملانِ ایں فن قیاس میکرد آخر آخر پیشِ چشم فقیر تحصیلِ طب کردہ نام بہ طبابت برآوردہ چنانچہ حالا بہ حکیم ثناء اللہ خاں شہرت دارد۔ دیوانِ ریختہ اش شستہ و رُفتہ است۔ فقیر تا در شاہجہاں آباد بود رابطۂ دوستی روز بروز رو در ترقی داشت و اکثر بانیٔ صحبتِ مشاعرہ ہا او بود۔ حق تعالیٰ آں عزیز را ہر جا کہ باشد سلامت دارد۔"[۱] از دست

خنجر تو ہاتھ میں نہ میاں تم کٹار لو ۔۔۔ اس صید ناتواں کو نگاہوں میں مار لو

یارانِ عدم سے کوئی کہہ دو کہ سدھاریں ۔۔۔ ہم پیچھے چلے آتے ہیں ہم کو نہ پکاریں

(۱) از ابکار افکار او دست (ن خ)

گل کا یہ منہ ہو کہ ہو اُس کفِ پا کے نزدیک — آئینہ ہو نہ سکے جس کی صفا کے نزدیک

کس زلف کا شیدا ہی مرا دل نہیں معلوم — کس چشم کا زخمی ہے یہ بسمل نہیں معلوم
ہر غنچہ میں بو ہی تری ہر گل میں ترا رنگ — جس پر بھی تری شکل و شمائل نہیں معلوم
کیا جانے کدھر کشتی لگے لختِ جگر کی — دریائے سرشک اپنے کا ساحل نہیں معلوم
سمجھائے کسی کے بھی سمجھتے ہیں دوانے — کیوں پاؤں میں پڑتی ہی سلاسل نہیں معلوم
مجنوں سے سوا دیکھے اب دشتِ جنوں میں — ہو کون فراق اپنے مقابل نہیں معلوم

غیر کے دل میں نہ جا کیجیے گا — میری آنکھوں میں رہا کیجیے گا
کاسۂ چشم کو لے در پہ ترے — بے نوایانہ صدا کیجیے گا
زائرانِ حرم و دیر کبھو — میرے حق میں بھی دعا کیجیے گا
ولے اس اپنی سیہ بختی پر — خواہشِ زلفِ رسا کیجیے گا

کروں کیا وصف میں صیاد تیری خوش نگاہی کا — ہر اک دامِ نگہ میں جال ہی کیا پشت ماہی کا
متاعِ دل فراق ارزاں ہی یوں بازارِ خوباں میں — کہ جیسے مال بکتا ہے کسی مفلس سپاہی کا

آنکھوں ہی نے اُس شوخ سے یہاں راہ نکالی — ساتھ اپنے ڈبویا مجھے کیا جاہ نکالی
گو جان سے جائے تو فراق اُس کے الم میں — پر دیکھیو تو نے جو کبھو آہ نکالی

فیض (۲)

میر فیض علی فیض تخلص پسر میر محمد تقی میر جوانِ صلاحیت شعار است بمقتضائے

موزونی طبع کہ موروثی است، گاہ گاہے بروضعِ خاندانِ خود لب بزمزمۂ ریختہ می کشاید و اندکی حصہ[1] از پدر ہم دارد۔ از وست۔

نہ مانی تو نے میری اپنی ہی ضد ہو فار کھی
کہیں اب کس سے ہم جا کر ہماری تو نے کیا رکھی
شبِ وصل آئی تھی یار و سو اس بد لطفی سے کاٹی
ہمارے اپنے اُس نے درمیاں تلوار لا رکھی
کدورت جب بتا انداز سے نکلا ہی کی تیری
ہماری خاک اُس کوچہ میں تو نے کب صبا رکھی
بنا کے صانعِ قدرت نے کیا کیا پھول گل یوں تو
مرے اس گلبدن میں کچھ ادا سب سے جدا رکھی

دور میں ساقی ترے آنکلے ہیں مے نوش ہم
جام خالی دے ہی کیا تو نے نہیں بیہوش ہم
سر فرو لاتے نہیں ژولیدہ مویاں عشق کے
سایۂ بال ہما رہا رہے ہیں پاپوش ہم
بے زبانی کی نہ پوچھو وجہ ہم سے کوفت میں
چوٹ کچھ ایسی لگی دل پر کہ ہیں خاموش ہم
شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحرِ حسن
موج کے مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم
دل نہیں رہتا کہ چھپ کر دیکھ لیویں[2] ورنہ فیض
عمر گذری نا کسی سے اپنی ہیں روپوش ہم

گل کھا موئے جنھوں کے لئے جسم زار پر
وو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر
یاری کی مت امید رکھا کر رقیب سے
میں ایک ناتوان ہوں بھاری ہزار پر
کیا کیا طیور آکے سرِ تیر پھر گئے
گھات ان دنوں نہیں ہے ترا دل شکار پر
یہ فیض ساری صورتیں ہیں مٹنے والیاں
مت بھول آہ یہاں کے تو نقش و نگار پر

(۳) فغاں

اشرف علی خاں فغاں عرف کوکہ خاں یعنی کوکۂ احمد شاہ بادشاہ از دورۂ سابقین

(۱) حصہ از عجب پدر ہم دارد۔ (ن خ) (۲) دیکھ لوں میں ورنہ فیض (ن خ)

است۔ شعر را بہ صفائی تمام می گوید و نسبت شاگردی بہ ندیم می رساند چنانچہ خود گفتہ ؎

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاںؔ دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہوئے گا

در ایامیکہ بہ سبب تفرقہ شاہ از شاہجہاں آباد بر آمدہ بہ طرف پورب گذر افگند و معرفتِ میر محمد نعیم خاں کہ ہم مکتبِ ایشاں بود بہ ملازمتِ نواب شجاع الدولہ بہادر رسیدہ یکے از مقرباں گردید۔ در ہماں نزدے روزے نواب وزیر دستش را در عالم اختلاط بہ فلس سوختند آب در دیدہ گردانید و ہیچ نگفت و آخر برہمیں حرکت آزردہ شدہ بہ طرفِ عظیم آباد رفت و در سرکار راجہ شتاب رائے بہ ندامت یکسنگی پیش آمدہ اقتدارِ کلی بہم رسانیدہ بود چند سال است کہ ہماں جا زندگانی را جواب دادہ۔ از وست۔

مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا
کرتا ہے وصل میں در و دیوار پر نظر تجھکو مزا پڑا ہے فغاں انتظار کا

عالم کو جلاتی ہے تری گرمیٔ بازار مرتے ہم اگر سایۂ دیوار نہ ہوتا

رفتہ رفتہ بہت خوش قدم آفت ہوگا قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا
کیا سبب ہے کہ نہ آیا مرے نامہ کا جواب خیر ہو یار کی قاصد تو سلامت ہوگا

ایسی نگاہ کی کہ مرا جی نکل گیا قصّہ مٹا، عذاب سے چھوٹے خلل گیا
آئی بہار پھر تو یہ سن لیجیو فغاںؔ زنجیر کو تُڑا(۱) کے دِوانا نکل گیا

آنا ہمارے گھر میں تجھے عار ہوگیا ایسا فغاںؔ کے نام سے بیزار ہوگیا

---

(۱) توڑا کے ۔ دن خ)

آنکھوں نے بے سفینۂ الفت ڈبو دیا کچھ بس نہ چل سکا تو مری جان رو دیا
کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سُنا[1] نہیں خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
اُس کے وصال و ہجر میں یونہی گذر گئی دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

دلبستگی قفس سے یہانتک ہوئی مجھے گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

تجھکو روزی ہو مری جان دُعائیں لینا مجھکو ہر شب تری زلفوں کی بلائیں لینا

فغاں نکہۂ[2] تری کہنے کی احتیاج نہیں یہ عشق ایسا ہی ظالم ہے ہاں مرے صاحب

تڑپے ہی دست بھیر کسی آرزو کے بیچ ناصح نہ دیر کیجیو ہر گز رفو کے بیچ
قاتل کا دادخواہ میں کیونکر ہوں روز حشر لو ہو مرا[3] بہا ہی پاشست و شو کے بیچ

لکھنا اے نامہ بر در و دیوارِ یار پر گزرا جو کچھ الم دلِ امیدوار پر
ممکن نہیں کہ غیر نہ ہووے رکاب میں تجھکو خدا نہ لائے ہمارے مزار پر
کیا تو شبِ فراق میں جیتا رہا فغاں یہانتک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار پر

کبھی نہ گل سے محبت نہ بو سے ہی اخلاص تجھے بھی دہر میں ظالم کسو سے ہی اخلاص

دیکھئے خاک میں مجنوں کی اثر ہے کہ نہیں دشت میں ناقۂ لیلیٰ کا گذر ہے کہ نہیں

---

(۱) سے - (ن خ) (۲) نکہہ (ن خ) (۳) مرا (ن خ)

توشۂ راہ سبھی ہم سفراں رکھتے ہیں
تیرے دامن میں فغاں لختِ جگر ہی کہ نہیں

عاجز ہوں ترے ہاتھ سے کیا کام کروں میں
کر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں

گر روزِ جزا داغِ شبِ ہجر دکھاؤں
تو صبحِ قیامت کے تئیں شام کروں میں

تا حشر نہ کم ہووے گی ظالم تپشِ دل
کافر ہوں اگر گور میں آرام کروں میں

جاتا ہے فغاں قافلۂ ہم نفساں کل
کچھ راہ کے چلنے کا سرانجام کروں میں

ہو کر ترے قفس سے میں آزاد کیا کروں
بے بال و پر ہوں اے مرے صیاد کیا کروں

نے زندگی میں وصل میسر نہ بعدِ مرگ
عاجز ہوا ہوں اے دلِ ناشاد کیا کروں

مبتلائے عشق کو اے ہمدماں شادی کہاں
آ گئے اب تو گرفتاری میں آزادی کہاں

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

بادِ صبا تو عقدہ کشا اُس کی ہو جیو
مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہ رکھ
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے تو ڈر کہیں

رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا
مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں

باور اگر نہیں تجھے آتا تو دیکھ لے
آنسو کہیں ڈھلک گئے لختِ جگر کہیں

نہ دل چمن میں لگے ہے نہ کوہ و صحرا میں
کوئی مکان بھی میرے لئے ہے دنیا میں

کیا تجھ سے خوش رہے ہے دلِ ناشادِ زندگاں
اتنا بھی تو نہیں کہ کرے یادِ زندگاں

واماندگانِ راہِ عدم گوش کیجیو
بانگِ جرس نہیں یہ ہی فریادِ رفتگاں

رکھتا ہے دوست چرخ مرے دودِ آہ کو
زلفِ سیہ سے ربط ہی بختِ سیاہ کو
مہرِ علی ہی دل میں نہ کر خوفِ روزِ حشر
تو لے چلا ہے ساتھ فغاںؔ زادِ راہ کو

صیاد راہِ باغ فراموش ہو گئی
کُنجِ قفس سے مت مجھے آزاد کیجیو

تقویت ہی داغ سے میرے دلِ بیمار کو
اے فلاطوں کیا مرض کہتے ہیں اس آزار کو
نقدِ دل لے کر فغاںؔ کا چھوڑ دینا ہی عبث
گرم کرتی ہی خریداری ترے بازار کو

مجھ مبتلا کی چشم کہاں تک پُر آب ہو
اے دل خدا کرے ترا خانہ خراب ہو
جم جم پلائے دوست مجھے روز جامِ مے
تو مست رہ فغاںؔ ترا دشمن خراب ہو

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گذر گئی
اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی
شکوہ تو کیوں کرے ہی مرے اشکِ سرخ کا
تیری کب آستین مرے لو ہو سے بھر گئی
تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں
انصاف تو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گذر گئی مری وہ ں بھی گذر گئی
آخر فغاںؔ وہی ہی اُسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی

ڈرتا ہوں محبت میں مرا نام نہ ہووے
دنیا میں الٰہی کوئی بدنام نہ ہووے
شمشیر کوئی تیز سی لینا مرے قاتل
ایسی نہ لگانا کہ مرا کام نہ ہووے

آتا ہو مری خاک پہ ہمراہِ رقیباں — یعنی اُسے تربت میں بھی آرام نہ ہووے
جی دیتا ہے بوسہ کی توقع پہ فغاں تو — ٹک دیکھیو سودا یہ ترا خام نہ ہووے

صنم نامہرباں ہی اس قدر وجہ غضب کیا ہی — مری تقصیر کچھ ثابت نہیں اے میری رب کیا ہی
قدم پر ہاتھ جب رکھتا ہوں یوں کہتا ہی جھنجلا کر — یہ گستاخی مجھے بھاتی نہیں اے بے ادب کیا ہی
صبا ہر ایک گل سے پوچھیو گلشن میں تو جا کر — گریباں چاک رہتا ہی فغاں اس کا سبب کیا ہی

دل زلف میں الجھے مجھے آرام یہی ہی — میں صیدِ بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے
کر چاک گریباں تجھے ہر صبح دکھاؤں — میں عاشقِ صادق ہوں مرا کام یہی ہے
بھر لیجیو دامن میں فغاں لختِ جگر کو — ہم خانہ بدوشوں کا سرانجام یہی ہے

قاصد تو نا امید پھرا کوئے یار سے — خفت ہوئی مجھے دلِ امیدوار سے
کل دیکھتا ہوں کیا کہ سرِ راہ ایک شخص — کہنے لگا فغاں نہیں شاکی تو یار سے
میں نے دیا جواب کہ سنتا ہے اے عزیز — ہے دور مرتبہ مرے صبر و قرار سے

یہ فن کسے نہیں آتا کہ دل میں راہ کرے — فغاں میں اُس کے تصدق ہوں جو نباہ کرے

وہ چاہے یا نہ چاہے فغاں آپ چاہیے — اپنی طرف سے ہاں[1] مرے صاحب نباہیے
مرجائیے کسی کو نہ دنیا میں چاہیے — کیا کیا ستم سہے مری چھاتی سراہیے

---

(۱) اے مرے صاحب۔ (ن خ)

ظالم تجھے قسم ہے جو اُس کو جلانہ دے — یہ دل بھی دل نہ ہووے جو تجھکو دعا نہ دے
قاتل کے کیوں قدم سے تڑپ کر پڑا ہے دُو — بسمل تو اپنے ہاتھ سے شرطِ وفا نہ دے
بے طرح جوشِ گل نے لگائی چمن میں آگ — ڈرتا ہوں آشیانہ کو کافر جلانہ دے
تیرے ہی دل سے پوچھیئے اس غم کو ہاں فغاں — الفت بُری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

اثر کرتی نہیں اُس بت کے دل میں آہ کیا کیجے — عجب حالت ہے میری لے مرے اللہ کیا کیجے

یارا اگر جفا کرے چاہیئے دل وفا کرے — یہ نہ کرے تو کیا کرے وہ نہ کرے تو کیا کرے

میں اپنے دردِ دل کہنے کے صدقے — ترے سُن سُن کے چپ رہنے کے صدقے

نہ کھولئے ترے بندِ قبا تو کیا کیجے — دلِ گرفتہ کو ظالم کبھی تو وا کیجے

نے ہمیں گل سے غرض ہے نہ تمنائے چمن — کیا اسیرانِ قفس کے تئیں پروائے چمن

ترے فراق میں کیونکر یہ دردناک جیے — مرے تو مر نہیں سکتا جیے تو خاک جیے

(۴) فدوی

محمد محسن فدوی تخلص ولد میر غلام مصطفےٰ خان قوم سید حسینی بہ لاہور تولد یافتہ و شانزدہ سالہ در سنِ آمدِ فرخ سیر از میلادِ خود بہ شاہجہاں آباد آمدہ۔ فدوی قدیم ہمیں است در شعر شاگردِ شاہ مبارک آبرو بودہ۔ طرز شعر بطور رقدما اکثر منتظم بایہام است و از بسکہ

بزرگانش درویش بوده اند خود ہم اوقات بہ درویشی گزرانیدہ وہرگز نوکری نہ کردہ۔ ستار را بخوبی می نوازد۔ تا فقیر در شاہجہاں آباد بود گاہ گاہے بر سرِ کوچہ دراہے ملاقات می شد۔ از وست۔

یار جو ہم سے سدا چیں بجبیں رہتا ہے نہیں معلوم بلا کونسی پیش آنی ہے

(۵) فدوی عظیم آبادی

از نامش اطلاع نہ دارم۔ از وست

وہ کافر ہماری شب تار ہے جسے دیکھنا صبح کا عار ہے

ہو ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم[1] سے نکلے عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

قطعہ

شب ہجراں کی اور تو فدوی ہم سے تقریر کر نہیں آتی
پر یہ وہ رات ہے کہ جس کی ہیں صبح ہوتی نظر نہیں آتی

(۶) فدوی لاہوری

شاگرد صابر علی شاہ صابر تخلص گویند بقال پسری بود نو مسلمان شدہ وبہ غلامی مرزائی نام برآوردہ و تربیت یافتہ۔ مرزا محمد رفیع در ہجو او کہ مذکور بقال د بوم آوردہ ایں کنایہ دلیلِ ساطع بر مقولہ مؤلف است۔ الحاصل چوں ازاں طرف آوردہ شدہ بہ ملک ہندوستان رسید دعوائے شاعری[2] در دماغش جا داشت د زیادہ از مرتبہ شاعری قدم در راہِ امرد پرستی می گزاشت چند جا خانہ جنگی ہم کردہ وبہ کودکانِ حسین

---

(۱) ن خ میں "محروم" ہے لیکن حاشیہ پر "مرحوم"۔ (۲) شاعری خیلے در دماغش۔ (ن خ)

تعلق رزیدہ۔ اکثر اعضایش دیدم کہ مجروح بودند۔ در ایامیکہ از شاہجہان آباد در کٹھیر(۱) آمد درآں روزہا فقیر در آنولہ بود کہ شورش او بہ سمع رسیدہ آخر روزے براے دیدنش رفتم اوباشِ چند گرد او نشستہ دیدم صحبتِ شعر میان آمد بعد چند روزے شنیدم کہ بسرکارِ نواب محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گذشت نوکر شد ہر گاہ بعد دو سہ ماہ میاں محمد قائم وغیرہ و فقیر ہم باریابِ مجلسِ ایشاں شدند بسبب برہم زدگیٔ مزاجِ نواب کہ بیانِ آں موجب تطویل است برخاستہ رفت و بعد شکستِ ضابطہ خان در سکرتال از مرہٹہ ہا باجل طبعی در قصبہ مراد آباد درگذشت۔ عمرش از پنجاہ متجاوز خواہد بود در گفتنِ قطعہ طویل در ہر غزل یدِ طولیٰ داشت و نازشِ شاعریِ او اکثر برہمیں بود۔ حسب الفرمایش نواب ضابطہ خاں کہ پیش ازیں چندے رفیقِ ایشاں نیز بودہ است مثنویٔ زلیخا را بزبانِ ہندی نظم میکرد چنانچہ او ناتمام ماندہ۔ کلامش بر زبانِ بازاریان بسیار دائر و سائر است۔ از کلام او چند اشعار کہ بہم رسید ایں است۔

ابرو کی تیرے تیغ سی سورج ڈرے ہوئے   پھرتا ہے اپنے منہ پہ سپر کو دھرے ہوئے

قامت کو تیرے دیکھ مصور نے بافسوس   کھینچی قلمِ آہ سے تصویر ہوا پر

ٹلتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے   ہم دادخواہ ساتھ ہیں اُس کے جہاں چلے
کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیرِ آہ سے   یہ(ن) ہی تیر ہے کہ سدا بے کماں چلے
سر پر تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار   ہر اک قدم پہ روتے ہوئے خونفشاں چلے
لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں   بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے
یاروں نے اپنی راہ لی فدوی کہیں رہے   وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

---

(۱) کٹھیر: (ن خ) (ن) یہ ہی ہے تیر ایک (ر)

یہ سرو نہیں باغ میں، ہے آہ کسی کی | نرگس نہیں تکتا ہے چمن راہ کسی کی

دیکھ کر ناقہ لیلیٰ کو پکارا مجنوں | مر گئے مشقِ جنوں دشت میں کرتے کرتے
ایک دن اس نے دکھائی تھی مجھے گردشِ چشم | وہ ادا یاد رہی یار کی مرتے مرتے
نہ ہیں تابِ خموشی ہے نہ یارائے سخن | بات بھی تجھ سے جو کہتے ہیں سو ڈرتے ڈرتے
کس کو جینے کی توقع ہے بقولِ فدوی | عمر آخر ہوئی پیمانہ ہی بھرتے بھرتے

آنسو نہیں یہ دیدۂ تر میں بھرے ہوئے | موتی ہیں آبدار صدف میں دھرے ہوئے
خالی کرا ان کو دل کے نشانہ پہ ایک بار | ترکش ترے مژہ کے ہیں جاویں بھرے ہوئے
فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے | اشجار کوہ و دشت کے یکسر ہرے ہوئے

تماشا ہو اگر آئینہ بے زنگار ہو پیدا | تحیر کے مکاں سے عکس روئے یار ہو پیدا
کھلے بالوں میں یوں چمکے ہے تیرا عارضِ رخشاں | کہ جوں ابرِ سیہ میں برق سو سو بار ہو پیدا
جسے کچھ نکتۂ تحقیق سے پہنچے خبر فدوی | اُسی کے دل میں عشقِ حیدرِ کرار ہو پیدا

سب اہلِ جہاں پھرتے ہیں غمناک زمیں پر | اوقات کوئی کاٹے گا کیا خاک زمیں پر

(۷) فدوی

مرزا عظیم بیگ سوداگر کہ او ہم فدوی تخلص میکرد۔ چند شعر از و بہم رسیدہ انیست۔

یار گوشہ میں ہے اور عیش سے مایوسی ہے | نقشِ پا تک بھی مرے درپئے جاسوسی ہے

مجھ پہ یہ ظلم یہ جفا باعث | کچھ تو میں بھی سنوں بھلا باعث
ایک تقصیر بھی تو ثابت ہو | بے جہت رہتے ہو خفا باعث

(۸) فدا (۱)

مرزا فدائی(ن) حسین خاں فدا تخلص ولد آقا مرزا نبیرۂ نواب حاتم خاں در اولاد سلطان قرا نوالہ مشارٌ الیہ در علم رمل بے نظیر و در فنِ طبابت وغیرہ دستگاہ نیز دارد جوان شائستہ، عمرش دریں زمانہ بست و دو سالہ باشد کہ از ابتدا اشعارِ خود را بہ پسرِ قمرالدین منت و والداو ہم می نمود و از چندے بہ سبب قرب جوار غزلہائے خود بہ فقیر

(۱) فدا کے حالات کے متعلق نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے لہذا اختلافی عبارتیں رامپور اور خدا بخش کے نسخوں کی بجنسہ ذیل میں نقل کر دی جاتی ہیں ۔

(نسخہ رام پور) مرزا فدا حسین فدا تخلص قوم مغل اللہ وردی خانی ولد آقا مرزا کہ ایشاں در فنِ رمل نظیرِ خود ندارند۔ جوان شائستہ عمرش دریں زمانہ بست سالہ خواہد بود کہ از ابتدا اشعارِ خود را بہ پسر میر قمرالدین منت یعنی میر نظام الدین می نماید و از چندے بسبب قرب و جوار رجوعِ ایں امر بہ فقیر ہم دارد، و غزل درست بستہ بہ سرانجام می رساند۔

(نسخہ خدا بخش) مرزا فدا حسین خاں فدا تخلص نبیرۂ نواب حاتم خاں ابن نواب غضنفر خاں در اولاد سلطان قرا لوالہ شاہزادۂ دشت قبچاق بود جوان شائستہ عمرش دریں زمانہ بست سالہ خواہد بود کہ از ابتدائے اشعار خود را بہ پسر میر قمرالدین یعنی میر نظام الدین می نماید و از چندے بہ سبب قرب و جوار رجوعِ ایں امر بہ فقیر ہم دارد و غزل درست بستہ بہ سرانجام می رساند۔ از دست ۔

(ن) فدا حسین (ر)

می نماید چنانچہ در فن شعر ہم بدرستی سلیقہ دارد - از وست -

خفا ہم آپ ہیں اس سے یہ دم رہے نہ رہے ترے فراق میں اے یار ہم رہے نہ رہے

چاہت سے بے خبر ہے ہماری تو یار حیف ہم چاہیں اور نہیں تو نہ چاہے ہزار حیف

جو ادھر کو گذر تیرا کبھی باد صبا ہو گا تو کہیو جاں کنی میں تھا فدا اب مر چکا ہو گا

نہیں کھاتا وہ قسم غیر کے گھر جانے کی سچ جو پوچھو تو یہی بات ہے مر جانے کی

کس طرح عمر بسر کیجئے دلدار بغیر زندگانی (۱) نظر آتی ہے نہیں یار بغیر
تیرے بیمار کو کیا شربت عیسیٰ سے ہو (۲) کچھ دوا اس کی نہیں شربت دیدار بغیر
کر علاج اے لب جاں بخش شتابی اپنا (۳) ہم تو بیمار ہیں اس نرگس بیمار بغیر
ہوں فدا جب سے میں دیوانہ گیسوئے بتاں (۴) چین آتا نہیں زنجیر کی جھنکار بغیر

لے تو ہی کچھ عشوہ نہیں تجھ سی یار دل قربان تیری جان پہ ایسے ہزار دل

ناکام کیا رہیں گے کچھ کام کر رہیں گے بدنام ہوں گے تو بھی اک نام کر رہیں گے
دل تو دیا ہے جان بھی دیں گے فدا آخر آغاز عشق کا کچھ انجام کر رہیں گے

طاقت تو اب کہاں ہے اک دم رہا ہے باقی اس ناتواں میں تیرے لے دیکھ کیا ہے باقی

(۱) زندگی تو نظر آتی ہی نہیں یار بغیر (ن خ) (۲) اشعار از ۲ تا ۴ ن خ میں نہیں ہیں۔

بیمارِ غم کا تیرے سب کر چکے ہیں چارا — دیدار یار تیرا اب دیکھنا ہے باقی
گو چھوڑ کر فدا کو پہلے ہی تم سدھارے — اس کے بھی ہمرہوں کا اک قافلا ہی باقی

قسم تو کھائی ہی بولنے کی پہ مجھکو دیجے جواب اتنا — کیا ہی کیا جرم ہم نے ایسا ہوا ہی جس پر عتاب اتنا

نہیں[1] ہی باقی کوئی تمنا ہمیں تو ہر طور یاس ہیگی — نہ اپنے جینے کا ہی بھروسا نہ اسکے ملنے کی آس ہیگی

غیر کی تم نے کی خوشی اور ہمیں خفا کیا — خوب کیا بھلا کیا خیر بہت بجا کیا

کچھ اپنے تو نزدیک خطا ہم نہیں کرتے (۲) — آپہی ہو خفا تم کو خفا ہم نہیں کرتے
میں بھی جو کسی بات میں بولا کہ کرو یوں (۳) — تو کہنے لگے تیرا کہا ہم نہیں کرتے
میں نے جو کہا عفو کر اب مری تقصیر (۴) — یوں سر کو ہلا ہنس کے کہا ہم نہیں کرتے
مختار ہمارا ہی وہی ہم تو ہیں بے بس (۵) — واللہ جو کرتے ہیں فدا ہم نہیں کرتے

تیروں کا ان بتوں کی دل آماجگاہ ہے — یہاں آہ آہ کرتے ہیں واں واہ واہ ہی
وہاں ہمکنار غیر سے وہ رشکِ ماہ ہے — یہاں کنجِ غم میں شکوۂ بخت سیاہ ہی
ظالم یہ جرم دل ہی کہ عاشق ترا ہوا — قتلِ فدا عبث ہے کہ یہ بے گناہ ہی

دل تو اب آکے لگا تجھ سے ستمگار کے ساتھ (۶) — دل لگے تو ہی بتا کون سے دلدار کے ساتھ
دشتِ مشاطہ نہ یوں کھینچ تو بیدردی سے (۷) — جاں ہے وابستہ مری طرۂ طرار کے ساتھ

---

(۱) یہ شعر اصل کتاب میں نہیں ہی۔ (۲) ن خ میں اشعار ۲ تا ۷ بھی فاضل ہیں۔

مبتلا عشق کا اِک شخص فدا نام جو تھا (۱) مر گیا سر کو ٹپک کر کسی دیوار کے ساتھ

ہوش و حواس گم ہیں بیخود ہیں بیخبر ہیں (۲) کیا جانے کون ہیں ہم کس جا ہیں اور کدھر ہیں

دولت سے عشق کی ہم سلطانِ بحر و بر ہیں (۳) سینہ ہوا ہے بے غم آنکھیں تمام تر ہیں

اے آہ نیزہ بازی سینہ میں بچ کے کیجو (۴) لبریز آبلوں سے اپنے دل و جگر ہیں

شفا پاوے ابھی بیمار تیرا جو دیکھے اک نظر دیدار تیرا

یہ مرض قابلِ شفا ہی نہیں (۵) درد میرے کی کچھ دوا ہی نہیں

مجھکو اب تجھ سے کچھ گلا ہی نہیں (۶) تو تو وہ آشنا رہا ہی نہیں

ساتھ غیروں کے ہے نظر بازی (۷) کبھی ادھر کو دیکھتا ہی نہیں

تاب و طاقت نے سب جواب دیا (۸) کیا رہا اب تو کچھ رہا ہی نہیں

سیکڑوں کشتۂ تغافل ہیں (۹) کہتے ہو میں نے کچھ کیا ہی نہیں

کیا کوئی سر جھکا کے ہووے ذلیل (۱۰) ہاتھ تیرا کبھی اُٹھا ہی نہیں

خونِ دل اب تو بیٹھے پیتے ہیں (۱۱) زندگانی کا کچھ مزا ہی نہیں

اور ہی اُس کی ہو گئی ہیئت (۱۲) کل جو دیکھا تو وہ فدا ہی نہیں

جویائے وصالِ یار ہیں ہم (۱۳) رسوا و ذلیل و خوار ہیں ہم

تیری جو نگاہ میں ٹیک ہیں (۱۴) ہر ایک کے جی پہ بار ہیں ہم

دل کو نہ قرار ہے نہ ہے صبر (۱۵) بے صبر ہیں بے قرار ہیں ہم

---

(۱) اشعار ۱ تا ۱۵ ان نسخ میں ندارد

کہو اُس بیوفا سے یہ تو تم سے دوستاں ہوگا — کہ اے نامہرباں پھر بھی کسو پر مہرباں ہوگا
رہائی(۱) دام سے صیاد کے دشوار ہی ہم کو — چمن میں دیکھئے پھر بھی ہمارا آشیاں ہوگا
چلوں کیا بہر طوف کعبہ باندہ احرام میں زاہد — کہ کافر دل مرا واں بھی پرستار بتاں ہوگا

کیا کروں جاؤں کہاں کہہ اے بتِ خودکام میں — عشق میں تیرے ہوا ہوں جابجا بدنام میں
ناکوئی قاصد نہ مرغِ نامہ(۲) بر نا ہے صبا — کس طرح سے یار کو بھیجوں فدا پیغام میں

موئے افسوس ہم دردِ نہاں کس سے عیاں کرتے — یہ حسرت رہ گئی کچھ دردِ دل اُس سے بیاں کرتے
اگر قیدِ قفس سے چھوٹتے جیتے تو ہم کیا — چمن میں پھر گلوں کے پاس اپنے آشیاں کرتے
اگر جیتے جنوں میں اب کے ہم تو اشک خونیں سے — ہر اک جنگل فدا آر رو کے مثلِ گلستاں کرتے

دوستاں(۳) دور کرو دردِ نہانی کو مرے — مجھ تلک لاؤ کسی طرح سے جانی کو مرے
روز خواہش میں ترے وصل کی میں مرتا ہوں — نامہ بر کہیو یہ پیغام زبانی کو مرے
سالہا جس کے لئے گریۂ یعقوب کیا — کوئی لاتا نہیں اُس یوسفِ ثانی کو مرے
باغ میں گل کی ادا دیکھ جو میں مرہی گیا — بلبلیں آئیں فدا مرثیہ خوانی کو مرے

جب تلک تو ہی مرے درد کا چارا نہ کرے — زندگانی ہی کو دل اپنا گوارا نہ کرے
بیوفا یار کو کس طرح سے میں سمجھاؤں — تا مرے روبرو غیروں سے اشارا نہ کرے

---

(۱) ن خ میں یہ شعر ندارد اس کی جگہ یہ شعر ہے ؎
بہار آئی ہے اب کے خوب سا دیوانپن کریں — کہ یہ شور جنوں اور موسم گل پھر کہاں ہوگا
(۲) مرغ نامہ بر ہے نے صبا۔ (ن خ) (۳) یہاں سے فدا کے باقی تمام اشعار ن خ میں نہیں ہیں

کون پہنچائے مرا نامہ و پیغام اُسے
جس کے کوچہ میں کبوتر بھی گذارا نہ کرے
میں تو اُس سے نہ ملوں ہائے کروں اسکو کیا
اُس کی اُلفت جو مرے دل سے کنارا نہ کرے

اُس جفاکار کی جس وقت مجھے یاد آئی
آہ لب پر وہیں کرتے ہوئے فریاد آئی
تیرا سایہ طرفِ آبِ رواں دیکھا تھا
ہر شناور کو نظر شکلِ پریزاد آئی
باغ میں چاک گریباں ہر اک گل نے کیا
جبکہ بلبل بہ گرفتاریِ صیاد آئی
قتل پر میرے تو انگشت بدنداں جو ملو
آج کیا جی میں ترے اے مرے جلاد آئی
شب جو اک موئے مژہ اس کا میں لے آیا تھا
اک پری خواب میں لے خنجرِ فولاد آئی
اک بگولا سا گلستاں کی طرف اُٹھتا تھا
کل صبا خاک مری کر کے جو برباد آئی
آگے اُس بت کے فدا طاقتِ گفتار رہی کب
بات کہنی مجھے اُس وقت خدا داد آئی

موئے مژگانِ بتاں خنجرِ فولاد ہیں سب
خوبرو جتنے ہیں حق میں مرے جلاد ہیں سب
اب پسینے کی جگہ خوں ہے بدن سے جاری
بال گویا کہ مرے نشترِ فصاد ہیں سب
شاعری چھٹ ہی گئی میں نے کئے علم حصول
لیکن اُس کے بھی جو ہیں قاعدے وہ یاد ہیں سب
لکھنؤ ہی یہ برا شہر جہاں مجھ سا شخص
یوں ہے برباد بلا سے اگر آباد ہیں سب
میں نہ دیکھوں گا فدا شکل پریرویوں کی
طائرِ دل کے لئے میرے یہ صیاد ہیں سب

قفس میں جیسے ہو مرغِ قفس تہ و بالا
کرے ہے دل کو یہ بانگِ جرس تہ و بالا
کسے ہے چین کشاکش میں بحرِ ہستی کی
حباب وار ہیں سب ہم نفس تہ و بالا
سحر کو فکرِ معاش اور شب کو عشقِ بتاں
ہمیشہ دل کو رکھے ہے ہوس تہ و بالا
ہماری آنکھوں نے ابکے جو خشک سالی کی
تو لوگ کیسے ہوئے اس برس تہ و بالا

جو مسجدیں بھی بناؤ تو نیک نیت سے — کرے نہ زلزلہ جن کے کلس تہ و بالا
فدا یہ آہ تھی کیسی ابھی جو کی تو نے — جگر کی ہو گئی ہر ایک نس تہ و بالا

شق جو قبریں ہیں انھیں سمجھو نہ گل کا اضطراب — مر مٹے پر بھی نہیں مٹتا ہے دل کا اضطراب
رہ گیا آتش یہ جم کر کس طرح سے یہ سپند — کھو دیا کس نے ترے عارض کے تل کا اضطراب

حرف قاف

(۱) قدرت[1]

مولوی قدرت اللہ قدرت تخلص در عربی وطبابت مہارتِ تام دارد، بندہ اورا تا در شاہجہاں آباد بود اکثر میدید۔ بمیان ثناء اللہ خاں فراق ماسوائے شاگردی و اُستادی دوستی تمام داشت۔ ازوست۔

زلفوں میں اگر دل یہ گرفتار نہ ہوتا — یوں روز مرا آہ شب تار نہ ہوتا
ہم دام میں پھنستے ترے صیاد تب آکر — رہنا جو قفس میں ہمیں دشوار نہ ہوتا

(۲) قدرت

مولوی قدرت اللہ قدرت تخلص مولف تذکرہ ہندی گویان کہ بالفعل در رامپور استقامت دارد۔ فقیر اورا در ایامیکہ بہ رفاقتِ نواب محمد یار خاں عز و امتیاز داشت پیش محمد قائم روزے دیدہ بود ازوست۔

لاکھوں جِلا دے مردۂ صد سالہ آن میں — فیضِ دمِ مسیح ہے اس کی زبان میں

---

(۱) قدرت کی جگہ ن ح میں قاسم ہے۔

نکلی تھی رات دل سے مرے بیدریغ آہ | ہنگامہ ایک پڑ گیا ہفت آسمان میں
انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا | لاکھوں کے گھر تو جاتے رہے امتحان میں

(۳) قیس

مرزا احمد علی بیگ عرف مدارا بیگ قیس تخلص ولد مرزا مراد علی بیگ ابن داؤد بیگ کہ سوداگرِ متمول بود، نبیرۂ مرزا عاقل بیگ کلیددارِ روضۂ امام موسیٰ رضاؑ۔ وطن بزرگانش مشہدِ مقدس وخودش بہ لکھنؤ و فیض آباد تولد ونشو ونما یافتہ۔ بمقتضائے موزونی طبع ہرچہ کہ موزوں کردہ از نظرِ جعفر علی حسرت گذرانیدہ۔ از وست۔

میں کہوں کچھ اور تیری گفتگو کچھ اور ہے | ہو گیا کچھ اور میں یا آج تو کچھ اور ہے
ایک دن اس دل کے ہاتھوں آ بنے گی جان پر | واں ارادہ اور کچھ یہاں آرزو کچھ اور ہے
دل تو ہم سے لے چکا ہے وہ کہے گا ہم نشیں | اب تلاشِ دل نہیں یہ جستجو کچھ اور ہے
شاید اس گل سے کیا ہے تو نے شب بوس وکنار | آج تو اے قیس تیرا رنگِ رو کچھ اور ہے

بات گئی ہاتھ پھر آتی نہیں | یار گیا جان تو جاتی نہیں
باغ میں کس گل کی ہے آمد کہ جو | نکہتِ گل پھولی سماتی نہیں
جب سے ہوا غیر کا واں بندوبست | خیر وخبر دل کی کچھ آتی نہیں
جب سے لگی اُس بتِ کافر سے آنکھ | موت تو کیا نیند بھی آتی نہیں
داغ یہ تو داغ جو کھاتا ہے قیس | کیا تری تھر کی تو چھاتی نہیں

وصیت ہے مرا احوال گر نوعِ دگر ہووے | تو مجھکو دفن واں کیجو جہاں اُس کا گذر ہووے

چاہت کی لذتوں سے جو لوگ بیخبر ہیں　　صد حیف اُن کا جینا وہ کون سے بشر ہیں

دلِ مضطرب کا دیکھا عجب اضطراب اُلٹا　　ہوا اور مضطر اُس نے جو ذرا نقاب اُلٹا

ہو آنا تیرے کوچہ میں اپنا شعار رہے　　ملنا نہ ملنا آگے ترا اختیار رہے

سنگِ جفا سے شیشۂ دل توڑ تاڑ کر　　بس اُٹھ چلے نہ کھیل کو پیارے بگاڑ کر

تن پر مرے زخموں سے جا گہ نہیں خالی ہو　　اور ہائے ستم اُس نے پھر تیغ سنبھالی ہو

وہاں وہی ناز کی اک آن چلی جاتی ہو　　شدتِ شوق سے یہاں جان چلی جاتی ہو
کونسا رشکِ چمن باغ سے کرتا ہے سفر　　جو صبا بے سر و سامان چلی جاتی ہو
کوئی جھڑکی ہمیں دے ہے کوئی دے ہے دشنام　　عشق میں اپنی بھی گذران چلی جاتی ہو

رہی تن من کی سدھ ہم کو نہ جن کی یادگاری میں　　بھلائیں وہ ہمیں تھپڑ پڑیں پھر ایسی یاری میں

شبِ فراق میں بر ہم جو مجھ سے یار رہا　　تو میں فراق نصیب اپنے من کو مار رہا

(۴) قدرت

شاہ قدرت اللہ قدرت تخلص کہ بہ طرفِ عظیم آباد قیام دارد شخصِ کہنہ مشق و باقوت و قدرت است۔ اما فقیر او را ندیدہ۔ یک غزلش کہ بر السنۂ صغیر و کبیر جاریست و شہرت تمام

یافتہ (۱) با چند شعر دیگر بہ قلم آوردہ - از دست -

کس کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے | جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یہاں سے کر گئے | اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
حسن کو اپنے ہواداروں سے کاوش ہے مدام | ہر طپش یہاں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے | کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی | اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام ہوتا ہو مئے گلگوں کا دور | شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے | چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف | جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے | یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنتِ دنیا سے آج | کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے
ایک ہی پردے کے یہ سب بھیجے تو ہیں الاپ | گر صدائے بانگ ہے ور نغمۂ ناقوس ہے
کل تو قدرت پائے خم (۲) رکھتی تھی تسبیحِ ریا | آج رہنِ جامِ مے یہ خرقۂ سالوس ہے

آہستہ رو رفیقوں نے منزل کو طے کیا | رفتارِ تیز نے مرے (۳) ناقہ کو پے کیا

حسرت اے صبحِ طرب ہم سے وطن چھوٹے ہے | مژدہ اے شامِ غریبی کہ وطن چھوٹے ہے
اب تلک تیرے شہیدوں کے بنِ ہر مو سے | لاکھ فوارۂ خوں زیرِ کفن چھوٹے ہے

ہم پر ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا | یار گھر جانے لگا اے دل اے گھر جانے لگا

---

(۱) سہ شعر دیگر۔ (ن خ) (۲) رکھتے تھے (ن خ) (۳) تری (ن خ)

سینہ اُس کا ہی دل اُس کا ہی جگر اُس کا ہی   تیرِ بیداد جدھر رو کرے گھر اُس کا ہے

تپک دی مری آہ پہلے قدم میں   میں قوت تری اے اثر آزمائی

(۵) قایم

قیام الدین علی[1] قایم تخلص اگرچہ وطنش قصبۂ چاندپور است اما بہ سبب توسل نوکری بادشاہی اکثر در شاہجہاں آباد می بود و در آں روزہا در توپخانہ ہم اسامی داشت بمقتضائے موزونی طبع و استعدادِ درست انچہ کہ موزوں می کرد از نظر مرزا رفیع می گزرانید و بہ خواجہ میر درد نیز اعتقاد داشتہ[2]۔ فقیر او را در ایام خردمؤئی[3] بہ لباسِ درویشی در سرکار نواب محمد یار خاں کہ در آں روزہا تازہ وارد بود دیدہ۔ در پختگی کلام و چستی مصراع غزل و رویۂ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافقِ رواجِ زمانہ دوش بدوشِ استادِ راہ میرود و بلکہ در بعض مقام غلبہ[4] میجوید۔ در آں ایام باعثِ قصیدہ خواندن و نوکر شدنِ مؤلف در سرکارِ نوابِ موصوف ایں بزرگ شدہ بود، با فقیر در عرصۂ قلیل بہ سبب سلیم مزاجی و نسبتِ تامِ شاعری رابطۂ شدید بہم رسانیدہ۔ کاغذہائے مسودۂ اشعارِ نواب را کہ برائے اصلاح پیشِ او می آمد از کم دماغی بدست مشورۂ فقیر می داد چنانچہ سہ ماہ بہمیں طور یکجا گزرانیدہ ام و شام و چاشت بیک سفرہ کردہ، واللہ کہ یادِ آں صحبتِ گذشتہ داغِ ناکامی بر دلِ دردمند می گذارد۔ الحاصل بعد برہم خوردنِ آبادی کہیر[5] و صورت گرفتنِ کارِ فیض اللہ خاں اسموِ والہ بہ سرکار نواب احمد یار خاں پسرِ نوابِ موصوف دخیل شدہ چیزے موافقِ زمانہ تقرر داشت۔ اما اوقاتش در آں بہ فراغت نمی گذشت لہذا برائے رہا کردنِ دیہاتِ قدیم ملک دیومیہ وغیرہ قصبہ مذکور سو رلکھنؤ گذر افگندہ و از راجہ ٹکیت رائے بہادر تنقیحات

---

(۱) قیام الدین علی عرف محمد قائم قائم تخلص (ن خ) (۲) موی (ن خ) الخلیفہ (۳) رجحان میجوید (ن خ) (۴) کیتھیرون کے

و پروانہ جات بنام عاملِ آنجا درست کنانیدہ بردہ بود کہ بعد فائز شدن بر مطلب اجلش در رام پور رسید و خبر وفاتش شہر بہ شہر انتشار یافت ۔ از دست ۔

پڑھ کے قاصد خط مرا اُس بدزبان نے کیا کہا — کیا کہا پھر کہہ بتِ نامہربان نے کیا کہا
غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے — پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہان نے کیا کہا
قائم اُس کوچہ سے شب غمگیں نہ آتا تھا تمہیں — کیا کہوں تجھکو کہ اُس کو پاسبان نے کیا کہا

جلوہ چاہے ہے اُسے اُس بت ہرجائی کا — نہ پریشان نظری جرم ہے بینائی کا
چھوڑ تنہا مجھے یارب انہیں کیونکر گذرے — غم جنہیں آٹھ پہر تھا مری تنہائی کا
عار ہے ننگ کو مجھ نام سے سبحان اللہ — کام پہنچا ہے کہاں تک مری رسوائی کا
صحن صحرا کو سدا اشک سے رکھنا چھڑکاؤ — بس دوانا ہوں میں قائم تری مزرائی کا

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کبھو نام کسی کا
اب تک بھی میں جیتا ہوں جو آنا ہو تجھے آ — پھر فائدہ جب ہو ہی چکا کام کسی کا

نہ وعدہ اُس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں — پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا
قائم جو کچھ کہ ہوگی سمجھ لیجو بعد مرگ — اب جیتے جی تو دیدہ اُڑا اُس دیار کا

جو کوہکن تجھے قوت ہی آزمانا تھا — عوض پہاڑ کے شیریں سے دل اٹھانا تھا
معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا وہ کیا — پیامبر کے نہیں ساتھ آپ جانا تھا
کہو کہ گورِ غریباں میں رکھیں قائم کو — کہ اُس کا جیتے بھی اکثر وہیں ٹھکانا تھا

عیش و طرب کہاں ہے غمِ دل کدھر گیا
صدقہ میں اس گذشت کے کیا کیا گذر گیا

کیا کہئے ناتوانی غم کی خرابیاں
گر شب میں دل کو جمع کیا جی بکھر گیا

اک ڈھب پہ کبھو وہ بتِ خود کام نہ پایا
دیکھا ہیں جو کچھ صبح اُسے شام نہ پایا

فہرست میں خوبانِ وفادار کی پیارے
دیکھی تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا

اک شب وہ کہیں گود میں سویا تھا سو قائم
پھر بالشِ مخمل سے میں آرام نہ پایا

ہو گر ایسے ہی مری تسکیں سے بیزار بہت
تم سلامت رہو بندہ کے خریدار بہت

ہمدگر جب خفگی آئی تو جھگڑا کیا ہے
تم کو خواہندہ بہت ہم کو طرحدار بہت

سچ کہو قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہے
ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات
ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات

خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے
ورنہ آئے تھے ایک عذاب میں رات

لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل
دل گرا شاید اضطراب میں رات

چاہے ہیں یہ ہم بھی کہ رہے پاک محبت
پر جس میں یہ دوری ہو وہ کیا خاک محبت

گو کرے ہم کو کسی طرح تو در سے باہر
جیتے جی جائیں کوئی ہم ترے گھر سے باہر

تم کو کیا قدر رہے اے دیدہ مرے رونے کی
ایک بوند آئی ہے سو خونِ جگر سے باہر

تھی تو اک بات یہ کیا کہئے کہ یہاں تو پیارے
نکلی ہی پڑتی ہے تلوار کمر سے باہر

دیکھے وہ ہے مجھے ہر وقت نکل جاتے تھے
دل میں اب آئے ہو، جاؤ گے کدھر سے باہر

ایک سودا کی تو قایم نہ کہوں میں ورنہ
ہے ترا طورِ سخن حدِ بشر سے باہر

پی کے مے غیر کے رہے شب باش
واہ وا رحمت، آفریں، شاباش

سینہ کاوی ہی کام ہے کچھ اور
کوہکن بود مردِ سنگ تراش

ہے نکلنا تری گلی سے محال
بس کہ ہر سو پڑی ہے لاش پہ لاش

خوبرو ہیں سو نزر طلب قایم
وائے بر عاشقی کہ ہو قلاش

رکھتا ہے جو تو صفائے عارض
موتی نے کہاں یہ پائے عارض

اک صافیِ تن ہی گل میں بھی لیک
ایسا وہ کہاں سے لائے عارض

اس سینہ سے منہ رگڑ نہ اے داغ
اُس کی تھی کبھو یہ جائے عارض

پیمانہ میں مہر و ماہ دیکھے
تیرا ہو جہان بہائے عارض

کس سے کہوں اُس کے منہ کا نقشہ
اے وائے جبین و ہائے عارض

کیا دور جو حشر ہو وے قایم
مکھ ماٹ جو وہ دکھائے عارض

آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسف
اشفاق و عنایات کرم مہر تلطف

اے گریہ یہیں قافلہ دل نام ہے اک یار
یہ خستہ بھی نبھ جائے جو یک دم ہو توقف

خاموشی بھی کچھ طرفہ لطیفہ ہے کہ قایم
کرنا پڑے جس میں نہ تصنع نہ تکلف

اے محنت آزمائے عاشق
جب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق

سو دیکھی جفا پہ منہ نہ موڑا
رحمت ہے تجھے وفائے عاشق

شرمندہ نہ ہو نکل جگر سے ‏ ‏ ‏ ‏ اے نالۂ نارسائے عاشق
ہجراں میں بھی مرگیا نہ قایم ‏ ‏ ‏ ‏ اس منہ سے تو اور کہائے عاشق

دل دیکے دیا میں تجھکو جان تک ‏ ‏ ‏ ‏ کوئی اور جگر کرے کہاں تک
آمادۂ سوختن ہوں یک بار ‏ ‏ ‏ ‏ اے برق مرے بھی آشیاں تک
ہاں نالہ کہ ہے یہ وقتِ امداد ‏ ‏ ‏ ‏ پہنچی تو ہے آہ آسماں تک
آہستہ ہوائے نسیم یک دم ‏ ‏ ‏ ‏ ہمراہ ہیں ہم بھی گلستاں تک
قایم جو ہے شمعِ بزمِ معنی ‏ ‏ ‏ ‏ میں رات گیا تھا اس جواں تک
پایا تو میں ڈھیر آنسوؤں کا ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھا تو گداز استخواں تک

کل لے آشوبِ نالہ آج نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ آج ہنگامہ پر مزاج نہیں
غیر اس کے کہ خوبرو ہو اور ‏ ‏ ‏ ‏ غمِ دل کا کوئی علاج نہیں

لے چکو دل جو نگہ کو تو یہ دشوار نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ لیک تم دیکھتے پھرتے ہو خریدار نہیں
تنگ تو ہم کو تو اے جیب کری ہی لیکن ‏ ‏ ‏ ‏ اٹھ گیا ہاتھ گر اپنا تو پھر اک تار نہیں
مے کی توبہ کی تو مدت ہوئی قایم لیکن ‏ ‏ ‏ ‏ بے طلب اب بھی جو ملجائے تو انکار نہیں

تا کجا مستی میں ناخوش دلِ احباب کریں ‏ ‏ ‏ ‏ یک دو جام اور بھی ساقی کہ بس اجتناب کریں
ہر طرف ظرفِ وضو بھرتے ہیں زاہد ہوئی صبح ‏ ‏ ‏ ‏ ساقی اٹھ ہم بھی صراحی میں مئے ناب کریں

یہاں سے اٹھ غیر کے گھر شب تو گیا کہتے ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ بارے اے ننگِ مروت اسے کیا کہتے ہیں

کیا ہوگیا کہ نالہ اثر سے قریں نہیں ‏ ‏ کیا آفت آئی آج کہ آہ آتشیں نہیں
کیوں ہم کو جرمِ نیم نگہ سے کر د ہو قتل ‏ ‏ اک خلق دیکھتی ہے تمھیں کچھ ہمیں نہیں
قایم جو اعتبار سے رتبہ کے دیکھئے ‏ ‏ کم آسماں سے شعر کی تیرے زمیں نہیں

جوں شمع دمِ صبح میں یہاں سے سفری ہوں ‏ ‏ ٹک منتظرِ جنبشِ بادِ سحری ہوں

کب اُن آنکھوں کی ہمچشمی کریں تصویر کی آنکھیں ‏ ‏ وہ مانی نے لکھیں اور حق نے یہ تحریر کی آنکھیں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں ‏ ‏ یہاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات ‏ ‏ ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں ‏ ‏ کبھی ہم اعتبار کرتے ہیں
سی تو لینے دو جیب ناصح کو ‏ ‏ اب کے ہم تار تار کرتے ہیں
چلیئے قایم کہ رفتگاں اپنا ‏ ‏ دیر سے انتظار کرتے ہیں

آوے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کروں ‏ ‏ غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کروں
کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور ‏ ‏ باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں
قایم یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ کے ‏ ‏ اب کے جو میں نماز کروں بے وضو کروں

لائق وفا کے خلق و سزائے جفا ہوں میں ‏ ‏ جتنے ہیں یہاں سو نیک ہیں جو کچھ برا ہوں میں
آگے مرے نہ غیر سے گو تو نے بات کی ‏ ‏ سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

جورِ سپہر دوریِ یاران و روئے غیر — جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

یونہیں رنجش ہو اور گلا یونہیں — ہو سے ہر بات پر خفا یونہیں
کچھ نہ ہم کو ہی بھا گیا ہے یہ طور — واقعی ہے کہ ہے مزا یونہیں
یہ کہاں اور وہ گل کدھر قایمؔ — اِک ہوا باندھے ہے صبا یونہیں

جب نہ تب مجھ سے جو تم دل کی طلب کرتے ہو — دل یونہیں مفت دیا جائے غضب کرتے ہو
ایک مدت سے میاں وہ تو موا پھرتا تھا — آج تم مرنے کا عاشق کے عجب کرتے ہو
قایمؔ اک بات میں جیتا ہے تمھاری لیکن — پرسشِ حال تم اس خستہ کی کب کرتے ہو

قبولِ عذر تو واں ہے جہاں ملال بھی ہو — بجانِ پاکِ صفا یہاں کچھ خیال بھی ہو
قصورِ خدمتِ احباب اس قدر قایمؔ — کچھ آدمی کو ہے لازم کہ انفعال بھی ہو

گردش شبانہ روز نہیں یہ سپہر کو — صدقہ کرے ہے کچھ پہ ترے ماہ و مہر کو

شمع ساں جلنے کو صانع نے بنایا مجھکو — جس کے میں ہاتھ پڑا اُس نے جلایا مجھکو
تھا بد و نیکِ جہاں سے میں عدم میں آزاد — آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھکو
کچھ تو تھی بات خلل کی کہ شب اُس نے محرم — غیر کے آتے ہی مجلس سے اٹھایا مجھکو
میں تو اس بات پہ مرتا ہوں کہ اُس نے قایمؔ — کس طرح پردہ سے کل بول سنایا مجھکو

کیجے گا صلح پھر دلِ بے مدعا کے ساتھ — ان بن ہے کچھ قبول کو اپنی دعا کے ساتھ

خونابِ دل سے ہاتھ ملا ہو تو جانئے | نیچے کئے ہیں آپ نے اکثر حنا کے ساتھ
اُس حسنِ نیرنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ | ہلکی سی ایک شوخی کی تہہ ہو حیا کے ساتھ
موتی صدف سے نکلے ہی قائم کب اس طرح | ڈھلتی ہو بات منہ سے ترے جس صفا کے ساتھ

نہ ہم فلک کے کبھو ریو و رنگ سے چھوٹے | پڑے بھنور میں جو کامِ نہنگ سے چھوٹے
شتاب ہم کو رہا کر کہ فصلِ گل صیاد | خزاں ہو اُس میں جو ہم ٹک ورنگ سے چھوٹے
تھے نام و ننگ جہاں میں ہزار بے ننگی | بھلا ہوا کہ ہم اس نام و ننگ سے چھوٹے
نہ اُس کی زلف سے چھٹنے کا قصد کر قائم | کوئی سنا ہے کہ قیدِ فرنگ سے چھوٹے

خوگرِ درد ہوں میں کرتے ہیں درماں میرے | آہ کیوں درپئے جاں ہیں یہ عزیزاں میرے
ہر گلی کوچہ ہے بستی کا پراچہ کی دکان | دھجیاں ہو کے اڑے بسکہ گریباں میرے

جب میں دیکھا ہے تو اس دل کو غمیں دیکھا ہے | یہ نیا چاؤ محبت کا یہیں دیکھا ہے
حسرتِ دل کو مری سمجھے ہو وہ خستہ جسے | یار نے آ کے دمِ بازپسیں دیکھا ہے

ہنوز شوقِ دلِ بے قرار باقی ہے | بجھی ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے
گیا تھا آج میں قائم کے دیکھنے کے لئے | کوئی دم اور نفس کی شمار باقی ہے

یارب کوئی اُس چشم کا بیمار نہ ہووے | دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے
صورت میں تری گر نظر آوے ملک الموت | جی دنیا کسو طرح سے دشوار نہ ہووے

کیا کیا عدم میں ہم پر ظلم و ستم نہ ہوں گے — چرچے یہی رہیں گے اور ہائے ہم نہ ہوں گے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے — کسی کے پھرنے نہ پھرنے سی کیا خدا نہ پھرے

کس دل پہ داغ غم نے یہ میرے بہار کی — اللہ رے دھوم اب کے برس لالہ زار کی
شاید وہ بھول کر کبھی یہاں بھی رکھے قدم — یکساں کرو زمین ہمارے مزار کی

وہ بھی کیا دن تھی کہ جی کو لاگ اُس کے سات تھی — میں تھا اور کوچہ تھا اُس کا اور اندھیری رات تھی

دامانِ گل تلک ہی کہاں دسترس مجھے — تکلیف سیر باغ نہ کرائے ہوس مجھے
بھٹکا میں وہ نہیں کہ ملوں قافلہ سے پھر — کیوں بے دماغ کرتی ہی بانگِ جرس مجھے
قائم میں عندلیب خوش آہنگ تھا پہ حیف — زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہی — اِک ڈھیر ہے یہاں راکھ کا اور آگ دبی ہی

شکوہ نا غیر سے نا یار کی بیزاری سے — جو ہوا ہم پہ سو اس کی گرفتاری سے

(۶) قسمت

نواب شمس الدولہ قسمت تخلص پسر کلاں نواب بارگاہ قلی خاں کہ سیادت و شجاعت وعمدۂ خاندانی ایشاں از قدیم شہرت دارد۔ جوان صاحب منش است۔ در ایامیکہ ایشاں معہ والد بزرگوار خود بحضور مرزا جہاندار شاہ مختاری کلی داشتند مقرب ملازمت ایشاں

خاکسارِ بے مقدار بجناب مرشدزادۂ آفاق زبانِ سحر بیان ایشاں شدہ بود و وعدہ بروز عید داشتند چوں بسبب کثرتِ ازدحام صغیر و کبیر موقع خواندنِ قصیدہ ندید برائے پاس خاطرِ من کہ قطعۂ مختصر تہنیتِ عید نیز در آستین داشتم آنرا گرفتہ وصف امراو غیرہ ہم شگافتہ بدست شاہزادہ دادند و مرا روبرو کردند غرضکہ محسنِ فقیر اند. واصلاحِ شعراز میاں جعفر علی حسرت می گرفتند و در حین حیاتِ او ہم بافقیراز تہِ دل اعتقادے و رجوعے داشتند حالاکہ حسرت نماندہ بالکل خیالِ مشورہ بہ مؤلف دارند و در گفتنِ سلام و مرثیہ بیشتر از شعر ہمت می گمارند و از عہدۂ آں نسبتِ دیگر مرثیہ گویانِ حال بخوبی می برآیند۔ ایں کلام ایشاں است۔

گروہِ کافر شب مہ بام پر آوے
ایک ماہ دو ہم ماہ فلک کو نظر آوے

مژگان ترے دل میں مرے بیری کی گنی ہیں
ناسفتہ نہ دیکھا کوئی لختِ جگر آوے

مقدور رہی کس کا جو ترے حکم کو ٹالے
رستم جو نہ آوے تو وہیں اس کا سر آوے

تو بر سرِ بازار جہاں جلوہ نما ہو
خورشیدِ فلک بیچنے اپنی سپر آوے

جوں ماہِ منور ہو شبِ تار ہماری
قسمت وہ اگر چاند کی صورت نظر آوے

دیکھا ہیں جنسِ دل کے طلبگار تم نہیں
پھرتے ہو بوالہوس سے خریدار تم نہیں

کہتا ہے اُن کو دیکھ کے چیں بر جبیں رقیب
کیا ماجرا ہے مجھ سے تو بیزار تم نہیں

آنکھیں نکالتے ہو عبث مجھ غریب پر
کہتا ہے کون یہ کہ طرحدار تم نہیں

کہتے ہیں یوں چمن میں پھر آئی بہارِ گل
شکرِ خدا کیا تھا بہت انتظارِ گل

اے نالہ اُس کے دل میں اک دم اثر تو کر جا
اُس شوخ بے خبر کو بارے خبر تو کر جا

مژگانِ تر ہیں تیرے ابرِ بہار قسمت
دامانِ کوہ و صحرا اکبار تر تو کر جا

الٰہی یا تو میرے دامنِ دلدار ہاتھ آوے
نہیں تو ہاتھ کے اس کی جو تیغِ تلوار ہاتھ آوے
اُدھر سے میں کھڑا ہوں کھینچ لینے کی تمنا پر
ادھر سے کاش کے تیرا ہی تا دیوار ہاتھ آوے
اگر تسبیح ہاتھ آتی نہیں ہے تیرے اے قسمت
تو دانے توڑ ڈال اُسکے کہ پھر زنّار ہاتھ آوے

امیدوار بوسۂ لب ہے کھڑا کوئی
دیتا ہے تجھ کو دیر سے پیارے دعا کوئی
میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ پھر کیا کرے اگر
مرجائے دیکھ کر ترا رنگِ حنا کوئی
تو ہے وہ اے صنم کہ تری چھب کو دیکھ کر
کہتا ہے واچھڑے کوئی، نام خدا کوئی
قاصد اگر گذر ہو ترا کوئے یار میں
کہیو کہ آرزو میں تری مر گیا کوئی
قسمت جو سیکھتا ہے فرنگی زبان کو
شاید نظر پڑا ہے فرنگی بچا کوئی

پھر مجھکو کیا جو غیر کے تم جا کے گھر رہے
میرے تو ساتھ وعدے ہی شام و سحر رہے
آتی نہیں کسی کی جواب تک صدائے پا
واماندگانِ قافلہ یا رب کدھر رہے

آتا نہیں شب کو خواب تجھ بن
بیداری ہے عذاب تجھ بن
اے ماہِ سپہرِ خوبروئی
سرگشتہ ہے آفتاب تجھ بن
سینہ سے نکل پڑے گا گویا
ہے دل کو یہ اضطراب تجھ بن
قسمت کی بھی تجھکو کچھ خبر ہے
دیکھا میں اُسے خراب تجھ بن

جو دل لیکر ہمارا دشمنِ جاں یارِ جانی ہے
تو اس سے موت ہی بہتر ہے پھر کیا زندگانی ہے
مرے اس خستہ دل کو پاس اپنے یار رہنے دے
کوئی پوچھے تو کہنا میرے عاشق کی نشانی ہے
شبِ ہجراں ہے اور میں ہوں آنکھیں اور آنسو ہیں
اذیت ہے مصیبت ہے نہایت ناتوانی ہے

نہیں کوئی زیست کی صورت بقولِ مصحفیؔ قیمت
نہ قاصد ہے نہ نامہ ہے نہ پیغامِ زبانی ہے

(۷) قبول

کہ از احوالش خبر ندارم۔ از وست۔

دل یوں خیالِ زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن
تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

حرفِ کاف

(۱) کمال[۱]

شاہ کمال الدین حسین کمال تخلص، وطنِ بزرگانش کٹرہ مانک پور وازچندے والدِ قبلہ گاہِ ایشاں در صوبۂ بہار نیز توطن کرفتند وایشاں ہمہ در زمانہ خویش منصبدارِ بادشاہی بودہ

---

(۱) کمال کے حالات نسخہ رامپور میں زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ تمام عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

کمال تخلص معروف بہ شاہ کمال چشتیہ ولد قادر نواز خاں وطنِ بزرگانش شاہجہاں آباد و در زمانہ خویش منصبدار بادشاہی بودہ اند۔ از چندے والدِ ایشاں در موضع محی الدین پور کہ متصلِ صوبۂ بہار است کہ بطریقِ ایمہ وخارج جمع بنام ایشاں مقرر است توطن گزیدہ۔ چنانچہ تولدِ شاہ مذکور درہماں موضع واقع شدہ لیکن نشو و نما در عظیم آباد یافتہ۔ بعد انتقالِ والدِ ماجدِ خود در سنِ شانزدہ سالگی ترکِ لباس اختیار کردہ وبیعت در قصبہ سلون در حضورِ پیر شاہ کریم عطا صاحب کہ فرزندِ جانشین حضرت پیر شاہ اشرف قدس اللہ سرہ اند نمودہ، درویشانہ قدم در وادئ سیاحت گزاشتہ درہماں عالم بہ لکھنؤ واردِ شدہ ازاں ایام درہمیں شہر اقامت درزیدہ۔ اوقاتش ہمیشہ

اند۔ شاہ مذکور در آغازِ شباب بہ خاندانِ اویسیہ(۱) بیعت کردہ ظاہرِ حالِ خود را بہ لباسِ درویشی آراستہ و سیرِ بنگالہ کردہ بہ لکھنؤ وارد شدہ۔ حالا بر مکانِ راجہ ہولاس رائے سکونت دارد و معونتش نیز از ہمانجا میرسد۔ شوقِ شعرِ ہندی از مدتِ مدید در دلش جا گرفتہ بود از یں جہت دواوینِ اساتذۂ سلف و حال را جمع نمود و قریب سی دیوان بہم رسانیدہ بفیضِ صحبتِ بزرگانش و سیرِ کلامِ ایشاں کلامِ خود را نیز بہ پایۂ اعتبار کشیدہ۔ پیشتر شاگردیش بیک جا تعین نداشت از چندے بحلقۂ تلامذۂ قلندر بخش جرأت داخل شدہ از کلام طبع زادِ اوست

شبِ وصال میں جب روزِ غم کی بات چلی
خروشِ مرغِ سحر نے کہا کہ رات چلی
کچھ اور لے نہ چلے ہم تو اس جہاں سے کمال
ہمارے ساتھ فقط اک خدا کی ذات چلی

میں بندہ کیوں نہوں اس کی ادا کا
عیاں اُس بت میں ہے جلوہ خدا کا
تو خواہی یا نخواہی گالیاں دے
ہمارا کام ہے دینا دعا کا

بہ توکل گذشتہ از ہفت سال راجہ ہولاس رائے بہادر بہ مکان خویش جا دادہ خدمتش را موجبِ سعادت می داند و بسیار رنجی پیش می آید و چوں بمقتضائے موزونی طبع شوقِ شعر از طفولیت دامنگیر بود ازیں جہت دواوینِ اساتذۂ سلف و حال را زیادہ از سی جمع نمودہ برکتِ سیرِ کلامِ ایشاں و فیضِ صحبتِ کاملاں ایں خود را نیز بپایہ اعتبار کشیدہ، پیشتر شعر خود از نظر محمد قایم می گذرانید حالا از چندے رجوع ایں امر بہ قلندر بخش جرأت دارد۔ ماسوا ایں در اخلاقِ درویشانہ باصاحبانِ متفی مزاجش بیک وتیرہ مرنج و مرنجان اکثر در مشاعرۂ فقیر حاضر شدہ با کلامِ ایں خاکسار از تہ دل دل دوستی دارد، ؟ چنانچہ ہر سہ دیوان را بدستِ خود نقل گرفتہ و تذکرہ را کہ تیار شدہ بخریداران تمام بردہ غرض کہ ذاتش چو نامِ خود کمال مجسم است، عمرش از سی سال متجاوز خواہد بود۔ (نسخۂ رامپور)

(۱) خاندان ویسیہ بغیر الف۔ (ن خ)

ہے بس ڈھپنے کو تن یہاں چادرِ خاک میں کیا خواہاں کسی سے ہوں ردا کا
ہیں اُس دیوار کے سایہ میں جو شخص کریں کیا لے کے وہ سایہ ہما کا
کمالؔ اُس کا جھکے سر کس کے آگے ہے جو بندہ علیؑ مرتضےٰ کا

جوں قدم یار نے گھر سے میرے در پر رکھا سر رکھا زانو پہ میں ہاتھ جگر پر رکھا
ہم کو صیاد نے رکھا جو قفس میں تو آہ دستِ شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پہ رکھا
سنگِ رہ اُس کی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا مثلِ گل میں نے اٹھا کر اُسے سر پہ رکھا
بیٹھے بیٹھے تجھے کون آ گیا یاد آج کمالؔ تو نے رومال جو لے دیدۂ تر پر رکھا

چشمِ خوں بستہ سے پھر اشک نمودار ہوا طفلِ خوابیدہ بہت دیر میں بیدار ہوا

جلوہ ترا تو ہم کو ہر ایک سو نظر پڑا دیکھا میں جس طرف کے تئیں تو نظر پڑا
پیارے صفائے حسن تری میں کہوں سو کیا ہر آئینہ سے صاف ترا رو نظر پڑا
قد کا ترے نہ آنکھوں میں میرے بسی خیال اکثر ہے یہ کہ سرو لبِ جو نظر پڑا
دیکھی کمالؔ غور سے اُس کی کمر جو میں کچھ اور تو نہ تھا مگر ایک مو نظر پڑا

مرے سینہ سے آنکھوں تک دلِ پُر آرزو پہنچا جو آنا ہے تو یہاں اپنے تئیں جلدی سے تو پہنچا
ابھی بازار اے مہ سرد تیرے حسن کا ہوگا اگر گرمی سے بیتابی پہ وہ خورشید رو پہنچا
مبادا کم نہووے بزمِ مے خواروں کی کیفیت شتابی اور یہاں پیرِ مغاں بھر کر سبو پہنچا
چلا حسرت بھرا میں کشتۂ تیغ ہستی سے ہے ظالم دمِ بسمل نہ میرا اُس کے دامن تک لہو پہنچا

کیوں تو پھرتا ہے دلا گرد اُس کے سودائی ہوا — لطف کیا ملنے کا ہر اُس سے جو ہرجائی ہوا
جز شکستِ شیشۂ دل کچھ نہ دیکھا اس کا کام — مرتفع جس دن یہاں یہ چرخ مینائی ہوا
قیس کو الفت میں میری مت برابر تو سمجھ — عشق کو کیا خاک سمجھے گا جو صحرائی ہوا

یہ زخمِ دل ہر اے جراح اُس ابروئے پرخم کا — کرے گا اس کو کیا چنگا تیرا پھاہا یہ مرہم کا
یہ ہی الماس کی کوئی گریباں یا کہ اے مہ رو — پس از خورشیدِ انور پھیر تارا صبح کا چمکا
کروں کیا اے کمال آنسو تھمے آنکھوں سے جو میرے — نہیں کچھ سوجھتا درماں مجھے اس چشم پرنم کا

دل کے ہر داغ کا ہے رنگ کچھ اے یار نیا — سیر کر تو بھی کہ پھولا ہے یہ گلزار نیا
جنسِ دل جس کی مانگی ہے قیمت اُس سے — واہ پیدا یہ ہوا از در خریدار نیا
کس طرح کہئے نہ پھر بوقلموں جلوہ اُسے — رنگ ہر لحظہ دکھاتا ہے وہ دلدار نیا
کہنہ مشاق طبیبوں نے کہا دیکھ مجھے — طرفہ آزار ہے یہ اس کو ہے بیمار نیا
جوں جوں کرتے ہیں دوا اور مرض بڑھتا ہے — یا الٰہی اسے کیسا ہے یہ آزار نیا
ایک نقشہ پہ زمانہ نہ رہے پھر کیونکہ کمال — رنگ اُس چہرۂ عالم کا ہے ہر بار نیا

گھر اپنے بلا لڑکے اُسی آن نکالا — جھگڑا تو مزے کا یہ مری جان نکالا
اُس صانعِ قدرت کے ہوں قربان بہر کل — اللہ یہ انسان سے انسان نکالا
میں کود کے دیوار گیا یار کے گھر اور — بیچارہ گیا مفت میں دربان نکالا

اپنی نظر کے آگے سے عالم گذر گیا — یہ قافلہ شتاب نہ جانے کدھر گیا

کیوں ہمیں تو دیکھ کر آزردہ جانا ہو گیا
کیا ہوا گر ہم فقیروں کا بھی آنا ہو گیا

مبتلا کس شہرۂ آفاق پر ہیں ہم کمالؔ
شہرۂ آفاق جو اپنا فسانا ہو گیا

رہ جا چمن میں تو کوئی دم اور عندلیب
تا ایک دو نالہ کر لیں بہم اور عندلیب

اس گل بغیر ایک تو سونا لگے ہے باغ
کرتی ہے بول بول ستم اور عندلیب

خط جو اُس حیلہ سے عاشق کا اُسے پہنچا پھر
پھر کبھو اُن نے نہ رستہ سے اٹھایا کاغذ

تیرہ بختی میں ہی جینے کی ضعیفوں کے بہار
ہوئی گلزار جہاں شب کو جلایا کاغذ

ٹکڑے کرے جگر کے میرے ٹوٹ ٹوٹ کر
رویا زبسکہ غم میں تیرے پھوٹ پھوٹ کر

ایک ہم رہے اسیرِ قفس اور ہم صفیر
پہنچے چمن میں قید سے سب چھوٹ چھوٹ کر

ہم گدا دیکھتے ہیں اُس بتِ گمراہ کی راہ
یعنی آ نکلے تو کچھ مانگ لیں اللہ کی راہ

ہاتھ میں اُس بت کی جو نازک کلائی آ گئی
گویا قبضہ میں مرے ساری خدائی آ گئی

وہ بتِ مغرور کل ہم سے ہوا جو ہیں دو چار
سامنے ہو کر مجسم کبریائی آ گئی

لیچلا صحرا میں کیوں کھو دلِ وحشی تو کھینچ
میٹھے بیٹھے جی میں یہ کیا تیرے بھائی آ گئی

اگر دبالا بے طرح سے کر چکے تھے تم کو رند
شیخ صاحب آپ کے آڑے کمائی آ گئی

بعد مدت روزِ وصل اُس کا میسر جو ہوا
ڈھل گیا دن ناگہاں شامِ جدائی آ گئی

حرفِ مطلب جوں کمالؔ اُس سے کیا میں نے بیاں
سنتے ہی بس اُس کے چہرہ پر رکھائی آ گئی

نظر پڑتے ہی اُس پر یوں کوئی دلگیر کانپے ہے　　کہ جیسے دیکھ کر صیاد کو نخچیر کانپے ہے
نظر اُس شوخ کی پڑتے ہی بس دل تھرتھرا اُٹھا　　کلیجے پر کوئی جیسے کہ کھا کر تیر کانپے ہے
چلا وحشت سے ہوں میں لے کماں ابرو کے کوچہ میں　　کہ جوں جوں پانو رکھتا ہوں اُدھر زنجیر کانپے ہے

کیا غضب ہے دم ہے آنکھوں میں لبوں پر جان ہے　　دم کی فرصت اب نہیں اور دل میں سو ارمان ہے

کھولے آنکھیں وقتِ آخر بھی ترا بیمار ہے　　مرتے مرتے بھی اسے کیا حسرتِ دیدار ہے
اب جو اُٹھ آئے گلی سے یار کی تو کیا کہیں　　سامنے آنکھوں ہی کے ہر رخنۂ دیوار ہے
خوابِ غفلت میں ہے کیا بیدار ہو ہشیار ہو　　قافلہ راہِ عدم کا چلنے کو تیار ہے
سانس لے سکتے نہیں ہیں کیا کہیں ہم ای کمالؔ　　اب تو دردِ دل سے ہم کو زندگی دشوار ہے

اُٹھنا ہے اُس کے کوچہ سے بارِ گراں مجھے　　تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو دوستاں مجھے
تجھ بن نظر اٹھا کے میں دیکھوں ہوں جس طرف　　اودھر نظر پڑے ہے یہ سارا جہاں مجھے
اُٹھتا ہے دل سے نالہ بھی لے آہ کا عصا　　غم نے کیا ہے اس قدر اب ناتواں مجھے
آزادی قیدِ زلف سے آتی نہیں نظر　　بختِ سیہ نے لا کے پھنسایا کہاں مجھے
ازبس کمال اُنس ہے جی کو قفس کے ساتھ　　نے فکرِ باغ ہے نہ غمِ آشیاں مجھے

نہ سمجھو آپ سے تشریف یار لاتا ہے　　ہمارا جذبۂ دل یہ اُبھار لاتا ہے
گلوں کو جھانکوں ہوں کیا کیا چمن میں جوں صبا　　قفس اٹھا کے یہ فصلِ بہار لاتا ہے
نہ آتے ہم بخدا تیرے در پہ لے کافر　　یہ کیا کریں یہ دلِ بے قرار لاتا ہے
بلائیں لینے لگا میں، تو پیچھے ہٹ کے کہا　　سرک بھی یہاں سے کہاں کا پیار لاتا ہے

ہزار آئیں بہاریں یہ نخلِ تن اپنا
کبھی شگفتہ ہوا ہے نہ بار لاتا ہے

نثار ہونے کی تیری گلی کے خواہش ہے
یہ گرد باد جو اتنا غبار لاتا ہے

پس از فنا تو ذرا آ کہ یہ دلِ مضطر
قیامت ایک تہِ سنگِ مزار لاتا ہے

دلا نہ اُس سے الجھ تو کہ راہ چلنے میں
دکھا وہ زلف کئی مجھ سے مار لاتا ہے

چمن میں دیکھا جو اُس گل کو آنکھ اٹھا کے کمالؔ
تو آنکھوں میں وہ گڑونے کو خار لاتا ہے

کچھ ان دنوں دلِ پُر داغ اس بہار پہ ہے
کہ نہ سماں یہ گلوں پر نہ لالہ زار پہ ہے

چمن میں کانٹے پہ گل کو پڑے ہی جو کوئی
یہ عندلیب کا دل ہے جو نوکِ خار پہ ہے

گیا میں جی سے اُٹھا کر جو دردِ تنہائی
تو بیکسی مرے اب نوحہ گر مزار پہ ہے

نہ تن سی نکلے ہے جی اور نہ یار آتا ہے
عجب طرح کا عذاب اپنے جسمِ زار پہ ہے

نہیں ہے پوست تو سبزہ ہی کر، دیا معبود
نشہ کمالؔ فقیروں کا اب اُتار پہ ہے

آہ مسیحا جسے دیکھ کنارا کرے
اُس کے مرض کا بھلا کیا کوئی چارا کرے

تیغ سے اپنا گلا کاٹیں نہ پھر کیونکہ ہم
غیر کو ابرو سے کچھ جب وہ اشارا کرے

سیرِ چمن میں نہ آئے جس کو نظر اپنا گل
آہ گلوں کا وہ کیا خاک نظارا کرے

فرقۂ عشاق میں ہے وہی صاحب کمالؔ
ذلت و خواری کے تئیں جو کہ گوارا کرے

نہیں خورشیدِ فلک ہم جو چمکتے جاویں
سایہ ساں جائیں جدھر سر کو پٹکتے جاویں

بادکش آہ ہے اور دل میں بھری آتشِ غم
شعلہ پر شعلہ نہ پھر کیونکے بھڑکتے جاویں

زلفِ مشکیں میں جو ہو مثلِ صبا اپنا گذار
ہم بھی پھر جاویں جدھر کو تو مہکتے جاویں

ہم جدھر جاویں تو یہ دیدۂ پر اشک اپنے
جامِ لبریز کی مانند چھلکتے جاویں

یہ بھی کوئی بیٹھنے کا بزم میں اسلوب ہے واہ
جوں جوں ہم آگے بڑھیں آپ سرکتے جاویں
خاکِ رہ جن کی ہوا ہوں ہیں غضب یہ ہے گوہ
اُس طرف گذریں تو دامن کو جھٹکتے جاویں

میاں او جانے والے آنکھ اٹھا کر ٹک ادھر دیکھو
کوئی مضطر پکارے ہے ذرا منہ پھیر کر دیکھو
ابھی میں کیا کہوں ناچار ہوں کہتے ہو کیوں مجھ سے
نہ یوں حیران ہو کر مجکو تم دو دو پہر دیکھو
یقیں تم کو اگر آتا نہیں ہے میری حالت کا
تو آئینہ کو اپنے سامنے ٹک تم بھی دھر دیکھو
کمالِ خستہ کو یاں دیہاں قسمت لے آئی ہے
نہیں تو مجکو دیکھو اور یہ میرا سفر دیکھو

کبیر (۲)

حکیم کبیر سنبھلی شیخ انصاری بودہ و کبیر تخلص مے گذاشت۔ فقیر ایشاں را در سرکار نواب محمد یار خاں مرحوم کہ ذکرِ ایشاں گذشت دیدہ بود بسیار بخوبی پیش آمدہ بود بہ سبب تمادیٔ ایام یک شعر از ایشاں بخاطر است۔

ایک ہی یار سے جی ناک میں آیا ہے کبیر
زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار ملے

کلیم (۳)

محمد حسین کلیم تخلص و الدِ میاں حاجی تجلی صاحبِ تصانیف بسیار است چنانچہ ترجمۂ فصوص الحکم دوہ مجلس ہندی بہ سلک نظم کشیدہ۔ خامۂ خیالِ او بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ محمد قایم تعریفش در تذکرۂ خویش بمبالغہ نوشتہ۔ از وست۔

ہو چکی حشر گئی جنت و دوزخ کو خلق
رہ گیا میں ترے کوچہ میں گرفتار ہنوز

آتی ہے دل پہ قلقلِ مینا سے اب شکست
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

شور کر کہتی رہی بانگِ درا کیا کیا کچھ　　قافلے کتنے گئے کوئی نہ سمجھا کیا ہے

حرفِ گاف

(۱) گوہری

گوہری بدائونی دو شعرش کہ زبانیٔ عالم شاہ پیرزادہ در عالمِ طفولیت شنیدہ بودم بیاد است از وست[1]۔

روبرو پلکوں کے مت جا بس کے بانوں کو نہ چھیڑ　　آفت آوے گی تو ان زنبور خانوں کو نہ چھیڑ
آخرش مار اپڑا ہاتھوں سے اُن کے گوہری　　ہم نہ کہتے تھے کہ ان بانکے پٹھانوں کو نہ چھیڑ

(۲) گرم

مرزا حیدر علی گرم تخلص و لد نیاز علی بیگ ساکنِ شاہجہاں آباد جوانِ[2] صلاحیت شعار است۔ بمقتضائے موزونی طبع چیزے کہ موزوں می کند آں را بہ نظرِ اصلاحِ فقیر می گذراند۔ باوصفِ نو مشقی از ذکاوتِ طبعش معلوم می شود کہ بشرطِ مزاولت بجائے خواہد رسید چراکہ رسوخ و اعتقادش از تہِ دل بایں خاکسار نسبتِ دیگر شاگردان اولین روز بروز زرد در ترقی دار دبقولے کہ پیرِ من خس است و اعتقادِ من بس است۔ از وست۔

نالہ کی گرمیوں سے بھنتے دل و جگر ہیں　　لب خشک ہو رہے ہیں کانٹے زبان پر ہیں
تیغِ نگاہ کس کی دیکھی ہے ہم نے یارب　　جو زندگی سے اپنی بیزار اس قدر ہیں
یارانِ رفتگاں کا مت پوچھ مجھ سے قصہ　　اے ہمنشین میں بھی حیراں ہوں وہ کدھر ہیں
خورشید و ماہ کو میں پھرتے ہی دیکھتا ہوں　　یہ کس کی جستجو میں آوارہ دربدر ہیں

(۱) از وست ندارد۔ ن خ (۲) وجواں ن خ، ان، حیراں۔

سینہ کے داغ سوں ان آنکھوں کے اشک خونی
اس نخل عاشقی کے یہ گل ہیں وہ ثمر ہیں

کس شعلہ رو کے غم میں روتا ہی اس قدر تو
جو گرم اشک تیرے سوزندہ(۱) اس قدر ہیں

شب رخصت ہو رہو تم مرے گھر آج کی رات
جاں بلب چھوڑ کے جاتے ہو کدھر آج کی رات

کر دیا در کو اجابت کے خدایا کیا بند
نہیں کرتی جو دعا میری اثر آج کی رات

آگے آنکھوں کے اندھیرا سا ہے شام سی ہے
دیکھیے ہوتی ہے کس طرح سحر آج کی رات

حسرت سے دیکھتا ہوں میں جب یار کی طرف
لگتا ہے تب وہ دیکھنے دو چار کی طرف

تڑپے ہی تیرے کوچہ میں اک جاں بلب میاں
ٹک جھانکیو تو رخنۂ دیوار کی طرف

دونوں سے پھر گیا ہوں میں گرم ان دنوں
ہرگز نہیں ہوں کافر و دیندار کی طرف

تصویر کا عالم ہے ترے روئے حسیں پر
تجھ سا تو پری چہرہ نہیں روئے زمیں پر

اخلاص اُسے غیر سے ہے واسطے جس کے
گُھدوائی ہے میں سورۂ اخلاص نگیں پر

ہم جن کی محبت میں لہو پیتے ہیں اپنا
وہ باندھے ہوئے پھرتے ہیں تلوار ہمیں پر

رہتا تو ہوں گلشن میں پہ رہتی ہے نت آفت
فریاد سے بلبل کی مری جان حزیں پر

نالہ نے مرے گرم شب آتش جو لگائی
اک شور فرشتوں میں پڑا عرش بریں پر

یوں آپ جو کچھ جی میں ہو فرمائیے صاحب
گالی نہ مجھے غیر سے دلوائیے صاحب

ہرچند گنہ گار ہے کشتہ کا ٹک اپنے
لاشہ تو بھلا آن کے اٹھوائیے صاحب

تا دیر میں اُس بزم میں بیٹھوں تو کہیں یوں
اب رات بہت آئی ہے گھر جائیے صاحب

---

(۱) "سوزندہ جو شرر ہیں" (ن ح)

میں گرمؔ گیا ملنے کو اُن کے تو اُنھوں نے　　فی الفور ظرافت سے کہا آئیے صاحب

رات وہ درباں کے ڈر سے مجھ تک آ کر پھر گیو　　اپنے پاؤں کی صدا مجھ کو سنا کر پھر گئے
گرمؔ کل آئے جو وہ سننے مرا احوالِ دل　　سوچ کر کچھ جی میں اپنے مسکرا کر پھر گئے

سیلِ گریہ میں نہ ہم تا بہ کمر ڈوب گئے　　اس قدر روئے کہ ہمسایوں کے گھر ڈوب گئے
تجھکو دریا میں جو لے شوخ نہاتے دیکھا　　شرم کے مارے وہیں شمس و قمر ڈوب گئے
گرمؔ کیا خاک چلیں سیر کو ہم دریا کی　　تیرے رونے سے تو سب راہگذر ڈوب گئے

بلبل کے سر سے جاتی ہے کوئی ہوائے گل　　ہوتی ہے وہ قفس میں بھی پھر پھر فدائے گل
لوہو میں بھر رہے ہیں ترے ہاتھ سچ بتا　　تربت پہ کس شہید کی تو نے چڑھائے گل
گلچیں جو اُس کو توڑ کے ڈالی سمیت لے چلا　　سر دھن کے عندلیب پکاری کہ ہائے گل
گل خوردہ دست سے مرے نفرت رہی جسے　　بدھی کے اُس نے کیونکے گلے سے لگائے گل
جس رُخ کے آگے مہرِ درخشاں بھی گرد ہو　　عارض کو لگ سکے ہے کب اُس کے صفائے گل
ہم بھی تڑپ تڑپ کے وہیں آہ رہ گئے　　صیاد نے قفس میں جو ہم کو دکھائے گل
گلدستہ لا دیا جو کل اُس کو رقیب نے　　ہم نے بھی گرمؔ رشک سے ہاتھوں پہ کھائے گل

حرف لام

---

(۱) لطیف

میر شمس الدین لطیف تخلص متوطنِ سورت ساداتِ عالی تبار اند. بحکم موزونی طبع

از چند سال شوقِ گفتنِ شعرِ ہندی بہم رسانیدہ۔ عمرش تا الی الیوم سی و دو سالہ خواہد بود از وست
مژدۂ وصل اگر کوئی سناتا ہے مجھے — میں یہ سمجھوں ہوں کہ جی وان دلاتا ہے مجھے
ایسی الفت کو لگے آگ پڑے چولھے میں — جو ہے دلسوز مرا وو ہی جلاتا ہے مجھے
گھر میں جا بیٹھ رہا اُس سے خفا ہو تو لطیف — کیا ہی غصہ تری اس بات پہ آتا ہے مجھے

لطف (۲)

مرزا علی لطف تخلص جوانِ خوش فکر دیدمش طبیعتش نسبتِ دیگر شعرائے اینجا متانتی دارد۔ مثنوئ آبدار بہ سلکِ نظم کشیدۂ او حجت بر قولِ مولف است و ازیں جہت خود را بہ شاگردئ مرزا متہم می کند۔ واللہ اعلم بالصواب۔ از وست۔

ہے زلف دُیا قہر کی شب کچھ نہیں معلوم — مکھڑا ہے الٰہی کہ غضب کچھ نہیں معلوم
خاموشی ہماری کے تئیں سحر ہی سمجھو — گو ہم کو لگا لینے کا ڈھب کچھ نہیں معلوم

کھل گئی یہ اب کہ وصل اُس کا خیالِ خام ہے — آج امیدوں کا دل ہی دل میں قتلِ عام ہے

کوئی زخم اور بھی کہ اے قاتل — کب کے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں

رباعی

جو کوئی کہ آفتِ نہانی مانگے — اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلاوے اُسے تو اپنی یہ تیغِ نگاہ — جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے

حرف المیم

(۱) مجذوب

مرزا غلام حیدر مجذوب تخلص پسر خواندہ مرزا محمد رفیع شخصِ خوش خلق و باحیا است فقیراورا در لکھنؤ دیدہ بسیار بہ تپاک پیش آمدہ ۔ من کلامہ۔

وعدہ کی وفا اُس سے بہت دور پڑی ہے ۔۔۔ فہرستِ شبِ روزے باہر وہ گھڑی ہے
خاموش جو رہتا ہوں مجھے گنگ نہ سمجھو ۔۔۔ اِک عرضِ تمنا ہے کہ آ منہ پہ اڑی ہے
غفلت میں بسر کر نہ شبِ وصل کو مجذوبؔ ۔۔۔ ایامِ جدائی کی گھڑی سر پہ کھڑی ہے

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لئے ۔۔۔ میں بھی تو یار کم نہیں دو چار کے لئے
ہے دردِ سر ہی بلبلِ آزاد کی صفیر ۔۔۔ موزوں ہے نالہ مرغِ گرفتار کے لئے
طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے روؤں گا زار زار ۔۔۔ جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لئے
مجذوبؔ بہرِ سبحہ ہے منت بھی شیخ سے ۔۔۔ پھر برہمن سے عجز ہے زنار کے لئے

رکھئے لگائے اُس کو گر بس چلے ہمیشہ ۔۔۔ دینے پہ دل کے کیجے آرے بلے ہمیشہ
آتے ملے دلے ہو گھر سے کسی کے اس دم ۔۔۔ پھیرا کئے چھری ہو میرے گلے ہمیشہ
مجذوبؔ ان دنوں میں پھر روگ کچھ بسایا ۔۔۔ رہتے تھے پیشتر تو اچھے بھلے ہمیشہ

چشم دوری میں تری یار پہ گریاں تھی رات ۔۔۔ تھی شبِ ہجر مرے سر پہ کہ طوفاں تھی رات
نازِ اختر کو مرے تھا فلکِ ہفتم پر ۔۔۔ زلفِ سرکش جو تری تابعِ فرماں تھی رات

کسی دشمن پہ خدا دن وہ نہ ڈالے جوں گل سر پہ مجذوب کے اے گبر و مسلمان تھی رات

برباد نہ جائے گا یہ خسرو ٹک سوچ کہ خون کوہکن ہے

اے میر سمجھیو مت مجذوب کو اور دل سا ہے وہ خلفِ سودا اور اہلِ ہنر بھی ہے

مظہر (۲)

مرزا جان جاں[1] مظہر تخلص کہ یکے از مشایخ کبار گذشتہ۔ احوال و اشعارِ ایشاں مفصل در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام۔ در ابتدائے شوقِ شعر کہ ہنوز از میر و مرزا وغیرہ کسے در عرصہ نیامدہ بود در دورِ ایہام گویان اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ او ست چوں در آں روزہا بہ میر عبد الحی تاباں دوستی بسیار[2] داشت۔ چند غزلیاتِ متعددہ از خامۂ فکرش بر صفحۂ کاغذ ریختہ بودند کہ مشارٌ الیہ مانع آمدہ۔ آخر ایشاں قرار شعر گفتنِ خود بزبانِ فارسی دادند و بعد ازیں بہ ریختہ زبان نیالودند مگر ہماں قدر کہ باصلاحِ دو سہ شاگرد بکار آید چنانچہ بتربیت انعام اللہ خاں نسبت بہ محمد فقیہ درد مند کہ ساقی نامۂ ایشاں شہرت دارد بر متوجہ بودند۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغتِ زبانِ اُستاد جلوۂ ظہور می دہد فی الحقیقت نقاشِ اولِ زبانِ ریختہ بایں وتیرہ باعتقادِ فقیر مرزا است۔ بعدہ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ۔ از وست

اُس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ اس واسطے بکا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
برگِ حنا اوپر لکھو احوالِ دل مرا شاید کہ جا لگے وہ کسو میرزا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر سورج کے ہاتھ چو تری ونکھا صبا کے ہاتھ

---

(۱) جاناں۔ (ان خ) (۲) بہ شدت (ان خ)

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے کہاں اس کو دماغ اور دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بےکس افسوس کیا ہوا اُس کے تئیں اتنا تو بیمار نہ تھا

مت اختلاط کرلے نو بہار اب ہم سے (۱) چمن کے ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں
یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے (۲) قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

(۳) میر

میر محمد تقی میر تخلص کہ مفصل احوالِ ایشاں نیز در تذکرہ فارسی سمت تحریر یافتہ۔ شخص صاحب کمال است اکثرے در فنِ ریختہ اورا در پلۂ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند و اکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ بر و فضیلت می دہند غرض ہر چہ ہست استادیِٔ ریختہ بر و مسلم است۔ اگرچہ دیوانِ فارسی ہم دارد اما در فارسی گویان شمردہ نمی شود۔ ہمہ ریختہ گویانِ ہندستان از کلامش می آرند داد رادریں فن مستثنیٰ میدانند والحق کہ چنیں است۔ از چند سال کہ از شاہجہاں آباد بہ پورب رسیدہ در سرکارِ نواب آصف الدولہ بہادر اعتبار و امتیازِ تمام دارد۔ چہار دیوانِ ریختہ از خامۂ فکرش ریختہ و مثنویہائے متعددہ و شکار نامہ ہائے بےنظیر نگاشتۂ کلکِ ندرت طرازِ او بر صفحۂ زمانہ یادگار است۔ بر فقیر بسیار مہربانی می فرماید۔ عمرش تخمیناً قریب ہشتاد است[۳]۔ از وست۔

ترے کوچہ میں یہ جتنے کہ جسم زار بیٹھے ہیں میاں گم کردۂ دل ہیں جو یوں لاچار بیٹھے ہیں

---

(۱) یہ آخری دو شعر نسخہ رامپور میں زائد ہیں۔ (۳) رسیدہ باشد۔ (ن خ)

مدت سے لگ رہی ہیں آنکھیں درِ حرم سے — پردہ اُٹھا تو لڑیاں نظریں ہماری ہم سے

ناز چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے — ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخِ زعفراں ہے

عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا — یا اس آدے میں مرا دل نہ بنایا ہوتا
کم اُٹھانا تھا نقاب آہ کہ طاقت رہتی — کاش یکبار ہمیں منہ نہ دکھایا ہوتا
در کے آگے سے ترے نعش گئی عاشق کی — اپنے دروازہ تلک تو بھی تو آیا ہوتا

جدا جو پہلو سے وہ دلبرِ یگانہ ہوا — طپش کی یہاں تئیں دل نے کہ درد شانہ ہوا
کُھلا نشہ میں جو پگڑی کا پیچ اُس کی میرؔ — سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا

باغ میں جس شب گئے ہم ظلم کے مارے ہوئے — جان کو اپنی گلِ مہتاب انگارے ہوئے
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے
آستیں رکھتے ہی رکھتے دیدۂ خونبار پر — حلقِ بسمل کی طرح لوہو کے فوارے ہوئے
استخواں ہی رہ گئے تھے یہاں دمِ خونریز میرؔ — دلنتے پڑ پڑ نیچے اُس شوخ کے آرے ہوئے

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ — اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ — وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بس ہوا ناز ہو چکا اغماض — ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ

ہے رہی بیگانگی کبھی اُس نے   نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ
میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں   اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

دل عجب جنسِ گراں قدر ہے بازار نہیں   بے بہا سہل جو دیتے ہیں خریدار نہیں
کچھ تمھیں ملنے سے رُکتے ہو ہمارے ورنہ   دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں   وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں   طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
ایک نے صورت نہ پکڑی پیش یار   دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں
آ چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش   ناز تا کے چند بے پروائیاں
شوقِ قامت میں ترے اے نونہال   گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں
پاس مجھکو بھی نہیں ہے اب کے میرؔ   دور تک پہنچیں مری رسوائیاں

اعجاز منہ تکے ہے ترے لب کے کام کا   کیا ذکر یہاں مسیحِ علیہ السلام کا
رقعہ ہمیں جو آوے ہے سو تیر میں بندھا   کیا دیجئے جواب اجل کے پیام کا
صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم وگرنہ کچھ   جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا

سر پہ عاشق کے نہ یہ روز سیہ لایا کرو   جی الجھتا ہے بہت مت بال سلجھایا کرو
تابِ مہ کی تاب کب ہے نازکی سے یار کو   چاندنی میں آفتابی کا مگر سایا کرو
کب میسر اُس کے منہ کا دیکھنا آتا ہے میرؔ   پھول گل سے اپنے دل کو تم بھی بہلایا کرو

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

بھرے رہتے ہوں سارے پھول ہی جس کے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں

جہاں سے دیکھئے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

ہوائے ابر میں کیا میر ہنستا باغ میں وہ تھا
گری پڑتی تھی بجلی آج کچھ صحنِ گلستاں میں

رو چکا خونِ جگر سب اب جگر میں خوں کہاں
غم سے پانی ہو کے کب کا بہہ گیا میں ہوں کہاں

عاشق و معشوق یہاں آخر فسانہ ہو گئے
جائے گریہ ہے جہاں لیلیٰ کہاں مجنوں کہاں

حال کہنے کی کسے تاب ہے آزار کے بیچ
حال رہتا ہی نہیں عشق کے بیمار کے بیچ

آرزو مند ہے خورشید میسر ہے کہاں
کہ ذرا ٹھیرے ترے سایۂ دیوار کے بیچ

کیا کہیں ہم کہ گلے ڈالے پھرے مستی میں
دانۂ سبحہ پرو رشتۂ زنار کے بیچ

زلفوں کو میں چھوا سو غصہ ہوئے کھڑے ہو
یہ بات ایسی کیا ہے جس پر الجھ پڑے ہو

ہوتے ہیں خاک رہ بھی لیکن نہ میر ایسے
رستہ میں آدھے دھڑ تک مٹی میں تم گڑے ہو

جائیں تو جاویں کہاں جو گھر رہیں کیا گھر رہیں
یار بن لگتا نہیں جی کاش کے ہم مر رہیں

زندگی دو بھر ہوئی ہے میری آخر تا کجا
دل جگر جلتے رہیں آنکھیں ہماری تر رہیں

وہ نہیں جو تیغ سے اُس کے گلا کٹوائیے
تنگ آئے ہیں بہت اب آپ جوہر کر رہیں

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں
دل کلیجا نکال لیتے ہیں

پڑتی ہے آنکھ ہر دم جاکر صفائے تن پر　　سو جی گئے تھے صدقہ اس شوخ کے بدن پر
نام خدا نکالے کیا پانوں رفتہ رفتہ　　تلواریں چلتیاں ہیں اس کے تو اب چلن پر
درکار عاشقوں کو کیا ہے جواب نامہ　　اک نامِ یار بس ہے لکھا میرے کفن پر
کس طرح میر جیو کا ہم سم تو بہ کرنا مانیں　　کل تک بھی داغِ مے تھے سب اُن کے پیرہن پر

ہمارے آگے ترا اگر کسی نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یا پہلی وہ نگاہیں جن سے کہ جا ہ نکلے　　یا اب کی یہ ادائیں جو دل سے آہ نکلے

کبھی میر اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے　　خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجہ ٹوٹ جاتا ہے

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا　　وہاں کام ہی رہا تجھے یہاں کام ہو چکا

جو یہ دل ہے تو کیا سر انجام ہوگا　　تہہ خاک بھی خاک آرام ہوگا

جفا و جور سہے کج ادائیاں دیکھیں　　بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
تری گلی سے سدا اے کشندۂ عالم　　ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں
بنی نہ اپنی تو اُس جنگجو سے اک دم میر　　لڑائی جب سے ہیں آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا　　آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا
دیکھنے آئے دمِ نزع لئے منہ پہ نقاب　　آخری وقت مرے منہ کا چھپانا کیا تھا

جب نہ تب مرنے کو تیار رہے عشق میں ہم — جی کے تئیں اپنے کبھوں بھی نہ جانا کیا تھا

آزار دیکھے کیا کیا اُن پلکوں سے اٹک کر — جی لے گئے یہ کانٹے دل میں کھٹک کھٹک کر

تلوار غرقِ خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں — دیکھیں تو تیری کب تک یہ بد شرابیاں ہیں
چاہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر — دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں
دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں — اب ہم نے بھی کسی سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
ہم وے ہیں خوں گرفتہ ظالم جنھوں نے تیرے — ابرو کی جنبش اوپر تلواریں کھائیاں ہیں
کعبہ میں میرؔ ہم یہ ہے سرگراں یہ زاہد — اور بت کدہ میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں

غیروں سے وہ اشارے ہم سے چھپا چھپا کر — پھر دیکھتے ہو ادھر آنکھیں ملا ملا کر
ہم گام سدِ رہ تھی بت خانہ کی محبت — کعبہ تلک تو پہنچے لیکن خدا خدا کر

مانندِ شمع آتشِ غم سے پگھل گیا — بزمِ جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا
گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی — میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تو نے کہ یہاں دم نکل گیا

یہاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پر وہ نہ آ پھرا — دیکھا نہ بدگمان ہمارا بھلا پھرا
طالع پھرے سپہر پھرا قلب پھر گئے — چندے وہ رشکِ ماہ جو ہم سے جدا پھرا
خانہ خراب میرؔ بھی کتنا غیور تھا — مرتے موا پہ اُس کے کبھو گھر نہ جا پھرا

پھرتے کب تک شہر میں اب سوئے صحرا رو کیا — کام اپنا اس جنوں میں ہم نے بھی یکسو کیا
نکہتِ خوش اس کے پنڈے کی سی آتی ہے مجھے — اس سبب گل کو چمن میں دیر میں نے بو کیا
جانا اس آرام گہ سے ہے بعینہ بس یہی — جیسے سوتے سوتے ادھر سے ادھر پہلو کیا
ہاتھ پر رکھ ہاتھ اب وہ دو قدم چلتا نہیں — جس نے بالش خواب کا برسوں مرا بازو کیا
پھول نرگس کا لئے بھونچک کھڑا تھا راہ میں — کس کی چشمِ پرفسوں نے میر کو جادو کیا

کیا چال نکالی ہے کہ جو دیکھے سو مر جائے — بھونچک کوئی رہ جائے کوئی جی سے گذر جائے
بے طاقتیِ دل سے مری جان ہے لب پر — تم ٹھہرو کوئی دم تو مرا جی بھی ٹھہر جائے
تا چند یہ خمیازہ کشی تنگ ہوں یارب — آغوش مری ایک شب اُس شوخ سے بھر جائے

جنوں نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو — نکالا جائے مو سر سے ہمے خارِ مغیلاں کو

بے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا — بلبل نے کیا سمجھ کر یہاں آشیاں بنایا
اوڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں — کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا
سرگشتہ ایسی کس کی ہاتھ آگئی تھی مٹی — جو چرخ زن قضا نے یہ آسماں بنایا
نقشِ قدم سے اُس کے گلشن کی طرح ڈالی — گردِ رہ اس کی لے کر سرو رواں بنایا
اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت — معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا
وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر جیؤ کی(۱) — دو چار اینٹیں لے کر میں پھر نشاں بنایا

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجلا کے نہ ہم — اپنے دامن میں اگر آج گریباں ہوتا

---

(۱) جی ۔ دن ح)

تابوت پر بھی میرے نہ آیا وہ بے نقاب
میں اُٹھ گیا دلے نہ اُٹھا بیچ سے حجاب

آہ رو کوں جانے والے کس طرح گھر کے ترے
کاش مجھکو گاڑ دیویں بیچ میں در کے ترے

بہار آئی ہر غنچہ گل کے نکلے ہیں گلابی کر
نہال سبز جھومیں ہیں گلستاں میں شرابی سحر
مبادا کارواں جاتا رہے تو صبح سوتا ہو
بہت ڈرتا ہوں میں اے میرتری دیرخوابی سحر

ہر بات پر خشونت طرز جفا تو دیکھو
ہر لمحہ بے ادائی اُس کی ادا تو دیکھو
گلبرگ سے ہیں نازک خوبیٔ پا تو دیکھو
کیا ہے جھمک کفک کی رنگ حنا تو دیکھو
سایہ میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت
اُس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو

کاش کے دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں

باغ گو سبز ہوا پر سر گلزار کہاں
دل کہاں، وقت کہاں، عمر کہاں، یار کہاں
دل کی خواہش ہو کسو کو تو کمی دل کی نہیں
اب بھی یہ جنس بہت ہے پہ خریدار کہاں

ٹک جہاں مہر و وفا کی جنس تھی میرے کنے
لیکن اس کو پھیر ہی لایا جہاں میں سے گیا
ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر
جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

میرا ہی مقلّدِ عمل تھا
مجنوں کے دماغ میں خلل تھا
تھا نزع میں دستِ میر دل پر
شاید غم کا یہی محل تھا

نسیمِ مصر کب آئی سوادِ شہرِ کنعاں کو
کہ کھر جھولی نہ یہاں سے لے گئی گلہائے حرماں کو

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہو
گلِ گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

صدائے آہ جیسے تیر جی کے پار ہوتی ہو
کسو بیدرد نے کھینچا کسو نے دل سو پیکاں کو

کریں بال ملک فرشِ رہ اس ساعت کہ محشر میں
لہو ڈوبا کفن لادیں شہیدِ نازِ خوباں کو

کیا سیر اس خرابہ کا بہت اب چل کے سو رہیئے
کسو دیوار کے سایہ میں منہ پر لے کے داماں کو

تری ہی جستجو میں گم ہوا ہی کہہ کہاں کھویا
جگر خوں گشتہ دل آزردہ میرؔ اس خانہ ویراں کو

قد کھینچے ہی جس وقت تو ہے طرفہ بلا تو
کہتا ہی ترا سایہ پری سے کہ ہے کیا تو

رباعی

کیا جانے لبا ہے آج کس کے جاکر
آتی نہیں نیند مجھکو تنہا پاکر
ہے جی میں نہ اٹھئے تا بہ صبحِ محشر
اس رات کو سوئیے کچھ لیا کھاکر

دیگر

کیا میرؔ ہوئی تھی جان تجھکو بھاری
جو اُس بتِ سنگدل سی کی [۱]یاری
بیمار بھلا کوئی بھی ہووے اُس کا
پرہیز کرے جس سی خدائی ساری

دیگر

وہ عہد گئے کہ جور اُس کے سہیئے
وہ بات نہیں رہی جو چپکے رہیئے
جب جی ہی چلا تو میرؔ پھر صرفہ کیا
بے صرفہ جو کچھ کہ منہ پر آوے کہیئے

دیگر

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے
خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخرِ عمر میرؔ سے کی خاطر
سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

---

(۱) تھی ۔ ن خ

(۴) محبت

نواب محبت خاں محبت تخلص خلفِ حافظ رحمت خاں قوم بڑیچ[1] جوانے است بزیور فضل و کمال و حلم و حیا آراستہ و در علم آداب و طریقِ سلوک و تہذیبِ اخلاق بہ اعالی و ادانی ظاہر و باطنش بہ یکتائی پیراستہ از بسکہ از ابتدائے موزونی طبع خیالِ شعر در دلش جاگرفتہ بود فکرِ فارسی و ہندی ہر دو میکند۔ بندہ اورا در لکھنؤ دیدہ بسیار بخوبی پیش می آید۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ من کلامہ۔

نظر کے پڑتے ہی تجھ پر مرا گلا نہ رہا — کہ دیکھتے ہی تجھے دل میں مدعا نہ رہا

مجھ سے خفا ہے وہ بتِ خود کام اب تلک — جھڑکی وہی ہے اور وہی دشنام اب تلک

درد کس کا مرے پہلو میں خلش کرتا ہے — یا الٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں
عاشقی کا تو تری نام ہر اک لیتا ہے — پر محبت سا کوئی عشق میں بدنام نہیں

آرام ایک دن کسی پہلو نہیں مجھے — یارب یہ کس کے درد سے میں بیقرار ہوں

الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو نہ ہو — اُس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

ہم سے وحشت اسے کیا کہتے ہیں — اتنی دہشت اسے کیا کہتے ہیں
اس قدر یار سے گرمی کرنی — کیوں محبت اسے کیا کہتے ہیں

---

(۱) برنج (بجنسہ) (ن خ)

فتنہ گر تو نے جو ٹک ہم سے چھپائیں آنکھیں ایسے ہم روئے کہ آشوب کر آئیں آنکھیں
ہوگئی سب پہ مری اور تری چوری ظاہر تو نے محفل میں جو شب مجھ سے چرائیں آنکھیں

یہ نقشا تو کھینچیں بھلا آن کر دریغ آج بہزاد و مانی نہیں

شب میں دیکھا کہ لٹکتا ہے خمِ زلف میں دل یار و اس خوابِ پریشاں کی تو تعبیر کرو

دیر سے مجھ کو نہ کچھ کام نہ کعبہ سے غرض کیوں گلا کرتے ہو لے گبر و مسلماں میرا

الحذر گریہ سے اے شوخ محبت خاں کے وہ جو رو دیا تو یہی جا تو کہ طوفاں اُٹھا

گالی کا انتظار تو حد سے گذر چکا منہ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی

مجھکو کہتا ہے کہ کرتا ہے تو بدنام صریح لکھ کے بھیجے ہے جو یوں نامہ و پیغام صریح

دیکھ کر آنکھوں کو اس کی سرنگوں کیوں رہ گئے چشم کو کرتے نہیں اے نرگسِ شہلا بلند

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہیگا بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

تجھ کو چھوڑا اے بتِ مغرور نہیں جانے کا جاؤں تو پر مجھے مقدور نہیں جانے کا
زخمِ دل کو مرے یوں دیکھ کے بولا جراح ہائے افسوس یہ ناسور نہیں جانے کا

اُس کے کوچہ کی طرف باچشمِ ترجو جائے گا ‌ پہلے اپنی جان سے وہ ہاتھ کو دھو جائے گا
بے کسوں کی خاک پر جوشش سے آیا ابر ہر ‌ اے فلک آنے دے وہ بھی آن کر رو جائے گا

آخر تجھے قفس کی طرف لے چلے نصیب ‌ مرغِ چمن ٹک اور تو گلزار دیکھ جا

(۵) محنت

مرزا حسین علی محنت تخلص مولدش مغل پورہ بعمرِ پنج سالگی بطرفِ پورب رسیدہ جوانِ سلیم الطبع وکم گو است بمقتضائے موزونی طبع فکرِ شعر ورنجتہ بخوبی می کند دشعرِ خود را از نظرِ قلندر بخش جرأت می گذراندہ۔ ازوست

ہو رقیبوں سے ملاقات اُس بتِ گمراہ کی ‌ اور ترستے ہم رہیں قدرت ہے یہ اللہ کی

کان میں غیر کے جو تو نے کہا سمجھا ہیں ‌ لے نہ گھبرا تری محفل سے اُٹھا جاتے ہیں

کیا ہے یہ تیرا مجھ کو رلا کے ہنسنا ‌ پھر نسپہ اے ستمگر یوں کھل کھلا کے ہنسنا
در سے اٹھایا مجھ کو اور میں ہنسا تو بولا ‌ ہے سخت بے حیائی خفت اٹھا کے ہنسنا
کیا وصل میں مزے تھے اُس شوخ کے کہ مجھ کو ‌ کچھ آ کے چھیڑ جانا پھر بھاگ جا کے ہنسنا
بدحال دیکھ مجھ کو غیروں سے یوں کہے ہے ‌ ٹک واسطے خدا کے اس کو بلا کے ہنسنا

آمد نہ فصلِ گل کی نسیمِ سحر سنا ‌ مر جاؤں گا قفس میں مت ایسی خبر سنا

الفت ہوئی ہے اُس بتِ مغرور سے مجھے ‌ پھیرے ہے منہ جو دیکھتے ہی دور سے مجھے

ناصح یہ نصیحت نہ سُنا میں نہیں سنتا	بک بک کے مِرا مغز نہ کھا میں نہیں سُنتا
احوال مرا دھیان سے سنتا تھا ولیکن	کچھ بات جو سمجھا تو کہا میں نہیں سُنتا
اُس بت نے جو غیروں پہ کیا لطف تو یارو	مجھ سے نہ کہو بہرِ خدا میں نہیں سُنتا
کچھ ذکر میں ذکر اپنا میں لایا تو وہ بولا	بس بات کو اتنا نہ بڑھا میں نہیں سُنتا
شکوہ سے ہی کرتا ہے جو کوئی اس سے مراد گر	تو کہتا ہے ہر اک کا گلا میں نہیں سُنتا
محنتؔ کو ہے یہ ضعف کہ کچھ اپنی حقیقت	کہتا ہے وہ مجھ سے تو ذرا میں نہیں سنتا

رحم آئے نہ کچھ اس بتِ خونخوار کے دل میں	جب تک کہ اُٹھے درد نہ دوچار کے دل میں
وہ جنسِ زبوں ہوں میں کہ لیتے ہوئے جس کو	سو سوچ گزرتے ہیں خریدار کے دل میں

کل شبِ وصل کی کیا جلد کٹیں تھیں گھڑیاں	آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے

(۶) مائل

مرزا محمد یار بیگ مائل تخلص جوانِ خوش اخلاق شاگرد جرأت۔ از وست۔

یہ کہاں مقدور جو اس کو بلا کر دیکھئے	دل میں ہے قاتل کو اپنے آپ جا کر دیکھئے

مائلؔ تجھے اضطرار کیوں ہے	اتنا بھی تو بے قرار کیوں ہے
رونے کا خیال ہم کو دن رات	اے دیدۂ اشکبار کیوں ہے

آنکھوں کے سامنے نہ ہو وہ گلعذار حیف	اور اس بغیر میں رہوں جیتا ہزار حیف

(ن) بڑھا

کیوں مجھ سے خفا رہتے ہوئے جان کہو تو　　کیا میری ہے تقصیر میں قربان کہو تو

پیتا ہوں جامِ مے کے عوض کاسہ نگ کا　　مائل ہوا ہوں جب سے میں اک سبزہ رنگ کا

رو رو کے میں نے زانوئے حسرت پہ سر رکھا　　جب یہ سنا کسی نے کوئی اپنا کر رکھا
کیا آمدِ بہار سے خوش ہوں کہ ہم کو آہ　　گردوں نے فصلِ گل میں بھی پابال کر رکھا

اختر سے تھے گر موتی اُس کان کے بالے کے　　اک چاند بھی جھکے تھا جھرمٹ میں دوشالے کے
فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلہ کو　　جھمکے ہے بدن اُس کا جوں کرتے میں والے کے
جوں کان میں تیرے ہے یہ موتیوں کا بالا　　کب گرد ستارے ہیں یوں چاند کے ہالے کے
وہ زلف جو ڈس جاوے تو خاک جئے کوئی　　بچتے ہیں کہیں مائل کاٹے ہوئے کالے کے

کل جو نہیں اٹھا مجھ سے وہ باتوں میں بگڑ کر　　میں بیٹھ گیا وو ہیں کلیجہ کو پکڑ کر
کیا جانئے ہے راہ کدھر ملکِ عدم کی　　یارب نہ رہے قافلہ سے کوئی بچھڑ کر

(۷) مشتاق

عنایت اللہ مشتاق تخلص پیرزادہ سرہندی است۔ چنداں بہرہ از علم ندارد۔ اکثر در مشاعرہ ہائے شاہجہاں آباد بہ بندہ خانہ حاضر می شد۔ روزے بر سرِ راہِ دولت خانہ با من دو چار شدہ بود تازہ باین طرف رسیدہ اما باز ندیدمش کہ چہ شد و کجا رفت۔ یکی[1] ازو بہم رسیدہ این است۔

---

(۱) دو شعر ازو بہم رسیدہ و آں اینست۔ (ن خ)

اے باغباں نہ جائیو بلبل کے متصل
بیٹھی ہے کس خوشی سے وہ ٹک گل کے متصل

مشتاق وہ جو شانِ محمد ہے اور علی
ٹھیرے ہے کون اُس کے تحمل کے متصل

(۸) مجنون

درویش برہنہ، شاگردِ میر محمد تقی صاحب از اولادِ رائے بِہم ناتھ منشی نبیرۂ رائے بشن ناتھ کہ بہ حشمت و اقبالِ خاندانِ ایشاں شہرتِ تام دارد۔ مشتاقِ قدیم است۔ دیوانش[۱] آب زدہ از نظرِ فقیر گذشتہ۔ از دست۔

چڑھا کر ساغرِ لبریز جس دم تو نکلتا ہے
ترا انداز ہنسنے کا گلوں کے ہونٹھ ملتا ہے

سر کٹا دیں گے ہم اپنا تیری ہی شمشیر سے
لڑ گئی تدبیر اپنی گر کبھی تقدیر سے

بیٹھا تھا دیکھ مجھکو بہانے سے اُٹھ گیا
حسنِ سلوک آہ زمانہ سے اُٹھ گیا

تری بے وفائی سے لے زندگانی
چھپانا پڑا منہ ہمیں تو کفن میں

پیا نہیں قدحِ مے کو میں کبھو تجھ بن
رہا مدام مرے جام میں لہو تجھ بن

اسیرِ زلف ترا ہوں تجھی سے کہتا ہوں
سنے گا حال مرا کون موبمو تجھ بن

نہ پوچھ حال تو مجنوں کا اے بتِ کافر
خراب و خوار وہ پھرتا ہے کو بکو تجھ بن

جس سے دل چاہے ملو تم نہ کسی سے پوچھو
مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ہی جی سے پوچھو

(ن) بھیم۔ (۱) نسخہ رئیس دالیوانش سے قبل یہ الفاظ ہیں" بہ شرف اسلام مشرف شدہ"

سجدوں نے میرے قدرت اپنی دکھائی اتو — پوجے ہے تجھکو لے بت ساری خدائی اتو
کیا پوچھتا ہے مجنوں غیروں سے آشتی سے — رہتی ہے اُس سے مجھسے ہر دم لڑائی اتو

سر ٹپکنے سے بھی کچھ حاصل نہیں مجنوں بس اُٹھ — یار کب نکلے ہے باہر گھر سے گو بیٹھے ہیں ہم

(۹) مشتاق

عبداللہ خاں ولد ابوالحسن خاں ابن سیف اللہ خاں المتخلص بہ مشتاق، قوم افغان یوسف زئی۔ مولد بزرگانش کاشان بود و بقولش جد و پدرش ہر دو شاعر بودند۔ سیفی تخلص جد و حسن تخلص والدش میکرد۔ و از بسکہ بہ فضل و کمال در آں زمانہ موصوف بودہ اند، برخلافِ زعمِ خود اشتہار بہ شیخی[۲] نیز برداشتند۔ جد مرحومش استاد بہادر شاہ بود و پدرش بہ سبب کثرتِ زر و مال کہ در خانہ داشت ترکِ روزگار کردہ بخانہ نشینی گذرانیدہ۔ الحاصل خان مذکور از حضور معلیٰ حضرت ظل سبحانی مشتاق علی خاں خطاب یافتہ۔ بہ منصب پانصدی ذات و جاگیر ممتاز است و بہ استادیِ مرزا فرخندہ بخت بہادر مامور۔ در علمِ جفر و رمل و ہندسی رغبتی تمام دارد و نیز در نوشتنِ خطِ نستعلیق و ثلث و شفیعا یگانۂ روزگار و جوانِ خوش خلق و خوش اختلاط و عاشق پیشہ و در ابتدائے فکرِ سخن در الہ آباد شعرِ خود را بہ شاہ محمد علیم حیرت الہ آبادی نمودہ، در شاہجہاں آباد از میر محمد تقی میر استفادہ نمودہ۔ از وست۔

شہیدِ عشق تمھارے کی نعش اُٹھتی ہے — بنے تو تم بھی چلو ٹک نماز کرنے کو

رنگ کیوں سبز ہے مشتاق ترے چہرے کا — کس نے دیکھا ہے تجھے زہر بھری آنکھوں سے

---

(۱) سیفی۔ (۲) شیخی نیز داشتند۔ (ان خ)

کی اِک نگاہِ یاس جو مژگانِ یار پر — سو برچھیاں چلیں دلِ امیدوار پر
جی بند ہو نکل بھی گیا تو کھلی رہی — اے چشم آفریں ہے ترے انتظار پر
مشتاق تیرا کشتۂ تیغِ فراق ہے — تقریبِ فاتحہ سے چلیں اُس کے مزار پر

تو جیئے مجنوں مرجائے لیلیٰ — ہائے وائے ویلا صد وائے ویلا

خرد کو روؤں یا اس دل زمینِ نازپرور کو — کیا اک ترک نے غارت مرے لشکر کو
پسِ مردن یہ سنتے ہیں کہ تھے دستِ طلب باہر — کفن میں آہ کس خواہش نے گھیرا تھا سکندر کو
لکدرِ ناقۂ لیلیٰ چلا آتا ہے صحرا سے — صبا کس نے ستایا آج قیسِ خاک برسر کو
مسی آلودہ دندانِ تبسم میں تماشا کر — نہ دیکھا ہو چمکتے گر شبِ یلدا میں اختر کو

آہ لاحق عشق کی حب سے یہ بیماری ہوئی — بارہا نبضیں چھٹیں اکثر غشی طاری ہوئی
بیقراری بے کلی در پئے طپش رہنے لگی — آہ دل دیتے ہی عاید یہ گنہگاری ہوئی
دل سنبھل چل دزدیٔ بوسہ شبِ دیگر پہ رکھ — یار چونکا پاسبانوں میں خبرداری ہوئی
کیوں نہ بھٹکے تو پھرے اے خواہشِ دل میرے بعد — بے نیازوں سے تری کب نازبرداری ہوئی
کھینچ تیغہ دشمنِ جاں امتحاں کرتا ہے کیا — کر چکے ہم عاشقی جب زندگی پیاری ہوئی
کیا کہوں کیا ظلم غفلت سے ہوا مشتاق رات — جا چکا پہلو سے جب دل تب خبرداری ہوئی

ہر قدم پر اس کے کوچہ میں غش آیا مجھے — ناتوانی ہائے یہاں تک تو نے پٹوایا مجھے

مٹے ہے دمبدم یہاں وصل کی تدبیر کا نقشہ — دکھائی دے ہے کچھ بے ڈھب ہمیں تقدیر کا نقشہ

(۱۰) منشی

میر محمد حسین منشی تخلص، سید صحیح النسب از سادات رضویہ ابن میر ابوالحسن عرف میر کلن خوشنویس۔ بزرگانش اہل ولایت بودہ اند و از دو سہ پشت در شاہجہاں آباد توطن اختیار کردہ۔ مشار الیہ خط نستعلیق بسیار درست می نویسد و در فن انشا پردازی ہم مہارت تام دارد۔ اکثر کتب نظم و نثر فارسی از نظرش گذشتہ و قلیل و کثیر در عربی ہم میدہد چوں از رہبری بخت سعید خدمت منشی گری مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بہادر باو متعلق است۔ ہمیشہ بہ خطوط نویسی حضور دالا مصروف می باشد۔ از آنجا کہ بہ سبب درستی سلیقۂ نظم و نثر و آگاہی فصاحت زبان اردوئے معلیٰ صراف سخن ہم او را می تواں گفت لہٰذا ہر غزلے کہ از حضور ارشاد می شود مشاطگی تحریر و تقریر و ترتیبش بدست اختیار اوست۔ معہٰذا بموجب ارشاد حضور و جبلت موزونی طبع گاہ گاہے فکر شعر ہندی ہم میکند عمرش تخمیناً بست و ہفت سالہ خواہد بود۔ از وست۔

مالوف طبع اُس کی ہے جور و ستم کے ساتھ
پھر ہم کو ربط کیوں نہ ہو اندوہ و غم کے ساتھ

صبح شب وصال ذرا ٹھیر کر نکل
ورنہ یہ جی ہوا ہے مرا تیرے دم کے ساتھ

منشی رقم کروں ہوں جو اپنا میں سوز دل
نکلے ہے دود آہ صریر قلم کے ساتھ

کی جس سے محبت میں اُسے یار نہ پایا
اس جنس کا کوئی بھی خریدار نہ پایا

تقصیر بھلا کیا ہوئی بتلاؤ جو ہم نے
دروازہ تلک آپ کے کل بار نہ پایا

نہ پوچھو اُس پری کے حسن کا عالم کہ آفت ہے
بلا شوخی، غضب رفتار، قامت اک قیامت ہے

دیا آئینہ میرے ہاتھ جو آج اُس پری رو نے
تو کیا معنی کہ یعنی صاف اب رفع کدورت ہے

جو پوچھا اُس سے لوگوں نے کہ منشی کون ہے بولے — مجھے کچھ تو نہیں اُس سے دوئی کی صاحب سلامت ہے

نہ رکھیے دیر سے مطلب نہ اب طوفِ حرم کیجے — بتنگ آیا ہے جی ہستی سے ٹک سیرِ عدم کیجے
اگر خط بھیجیے اس کو تو پھر حضرت سلیماں کا — یہ مصرع کر کے تضمیں ایک شعر اب یوں رقم کیجے
سوا احوالِ دل اپنے کے منشی نے اگر تم کو — لکھا ہو حرف شکوہ کا تو ہاتھ اس کے قلم کیجے

گھر سے جو نکلے ہو جی آج تم اس تراش سے — آپ کو کچھ خبر بھی ہے دل کی مری خراش سے
کوچۂ یار کا پتا جب نہ ملا تو مر گئے — خوب ہوا کہ چھٹ گئے روز کی ہم تلاش سے
منشیِ خستہ دل کو اب عشق میں اُس پری کے ہے — فکر نہ کچھ معاد کا کچھ نہ خبر معاش سے

(۱۱) مقتول

مرزا ابراہیم بیگ مقتول ولد مرزا محمود علی(ن)۔ مولدِ بزرگانش صفاہان وایشان از قدیم مرزایانِ دفتر بودہ اند و خودش در شاہجہاں آباد نشوونما یافتہ۔ بسلیقۂ نوشتنِ انشاء نثر بسیار بہ درستی دارد۔ و در فہمیدِ بد و نیکِ شعر او را حرف بر دیگر صرافانِ معانی است۔ کم کم خود ہم بمقتضائے موزونیِ طبع خیالِ شعرِ ہندی می کند و انچہ گفتہ بہ فقیر نمودہ ماسوائے شاگردی دوستی بسیار بایں خاکسار دارد۔ عرض ازیں متجاوز خواہد بود از اشعارِ اوست۔

مطلب رہا نہ کچھ ہمیں دیر و حرم کے ساتھ — اٹکا ہے دل اک ایسے ہی کافر صنم کے ساتھ

کل گھر سے جو وے سادی پوشاک پہن نکلے — سو طرح کے اس میں بھی بے ساختہ پن نکلے

(ن) محمد علی (ر)

دیکھا ہو جس نے اُس بتِ کافر کے گات کو — آوے نہ فرشِ گل پہ اُسے خواب رات کو
رنگِ شفق کی خاک میں مل جائے سب بہار — جس دم وہ کھولے اپنے حنا بستہ ہات کو
یا تو ہم اُس سے آٹھ پہر ہم کلام تھے — یا اب غضب ہی یہ کہ ترستے ہیں بات کو
مقتولؔ مصحفیؔ سے ہوا ہے مجھے یہ فیض — حق دیر گاہ جگ میں رکھے اُس کی ذات کو

بتاں جب کہ زلفِ دوتا باندھتے ہیں — گرہ میں دلِ مبتلا باندھتے ہیں
نہیں بنتی بلبل سے اپنی چمن میں — ہم اب آشیانہ جدا باندھتے ہیں
میں یہاں خون روتا ہوں ہاتھوں سے اُس کے — جو پاؤں میں اُس کے حنا باندھتے ہیں
جفا کھینچیں گے پر نہ ہاریں گے جی کو — یہ ہم تم سے شرطِ وفا باندھتے ہیں
گرہ دیکے سر پر جو بالوں کا جوڑا — یہ نازک بدن خوش ادا باندھتے ہیں
ہر اک تار میں اُس کے دلہائے عشاق — بہم جمع کر کے بلا باندھتے ہیں
میاں حالِ مقتولؔ دیکھا نہیں کیا — کمر آپ کس پر بھلا باندھتے ہیں

(۱۲) مضطر(۱)

لالہ کنور سین مضطر تخلص پسر دیوان دیبی پرشاد قوم کایستھ سکسینہ، بزرگانش

---

(۱) مضطر کے حالات کے متعلق رامپور کے نسخے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسکی نقل ذیل میں دیجاتی ہے۔
مضطرؔ:۔ کرپا دیال عرف لالہ کنور سین مضطر تخلص خلفِ دیوان دیبی پرشاد قوم کایتھ سکسینہ و لالہ درگا پرشاد مضطر کہ ذکر ایشاں گزشت برادرِ عم زادۂ ایشاں اند۔ جوانِ خوش خلق و بسیار حلیم و سلیم و باحیا و متواضع و خادمِ درویشاں است۔ بہ سببِ موزونیٔ طبع از عالمِ مکتب نشینی چیزے در زبانِ ہندی و فارسی موزوں می کرد و از چندے بہ سبب دوستی کہ از میاں عیشیؔ تنہا می داشت بہ حلقۂ شاگردانِ مولف در آمدہ۔ در طبعش روانی کمال است و خیالش بسیار رساست، و امسال

که همه عمده معاش و باجاه و ثروت بوده اند، از شاہجہاں آباد اند خودش در لکھنؤ تولد و تربیت یافته و به سنِ تمیز رسیده به سبب موزونیٔ طبع که اکثر کودکان را می باشد. از عالمِ مکتب نشینی چیزے در زبانِ ہندی و فارسی موزوں می کرد و از حیا بکس نمی نمود بلکه از بزرگانِ خود خفیه می داشت۔ از چندے معرفت محمد عیسیٰ تنہا که ذکرِ ایشاں گزشت به حلقهٔ شاگردیٔ مؤلف در آمده۔ در طبیعتش روانی بسیار معلوم می شود اما از بے اطلاعیٔ طرزِ شعر و محاورهٔ زبان ناچار است. اگر چندے مشقِ سخن به سلیقهٔ شاعری خواهد کرد البته بجائے خواهد رسید۔ از وست۔

سیکھ کر باغ میں قد سے ترے رعنائی کو ۔۔۔ کام فرمانے لگا سرو بھی مرزائی کو
دشمن اپنا ہمیں تم سمجھو ہو اور غیر کو دوست ۔۔۔ ہم نے بس دیکھ لیا آپ کی دانائی کو
اُس کے خالِ تہہ ابرو پہ مجھے آوے ہے رشک ۔۔۔ لیکے بیٹھا ہے وہ کیا گوشۂ تنہائی کو
رشک ہے رنگِ حنا پر کہ یہ کس پردہ میں ۔۔۔ بوسہ دیتی ہے ترے ہاتھوں کی زیبائی کو
جب سے اس شوخ کا عاشق میں ہوا ہوں مضطرؔ ۔۔۔ ہر کوئی دیکھ ہنسے ہے مری رسوائی کو

جو سن کے خفا ہو نام میرا ۔۔۔ کس طرح وہ لے سلام میرا
ٹکڑا مہِ چار دہ سا دکھلا ۔۔۔ کام اُس نے کیا تمام میرا

(۱۴۳) مضطرب (۱)

لاله درگا پرشاد مضطرب تخلص پسرِ دیوان بھوانی پرشاد قوم کایستھ سکینه جوانِ صالح

همراهِ پدرِ خود بفوجداریٔ محالاتِ چاندپور وغیره علاقه چکله بریلی از حضور سرفراز شده عمرش بست ساله خواهد بود۔ از وست۔

(۱) رام پور کے نسخے میں کسی قدر اختلاف ہے۔ اس کی نقل لکھی جاتی ہے۔

وخوش روئی وخوش خوئی است بمقتضائے موزونی طبع گاہ گاہے چیزے موزوں میکند واز آشنایانِ محمد عیسیٰ است - ازوست -

بہت بے اختیاری کر چکے ہم | نہایت آہ وزاری کر چکے ہم
کہا میں کچھ تو کیجے میری خاطر | کہا خاطر تمہاری کر چکے ہم
ترے وعدوں پہ ہے اب دم شماری | بس اب اختر شماری کر چکے ہم
اگر یاری یہی ہوتی ہو صاحب | تو بس آگے کو یاری کر چکے ہم
نہ آیا مضطرب وہ رشکِ گلہائے | لہو آنکھوں سے جاری کر چکے ہم

(۱۴) مرہون

مرزا علی رضا مرہون تخلص کہ پیشتر مضمون[۱] تخلص میکرد جوانِ صلاحیت شعار است بزرگانش مشہدی بودہ اند وخودش در شاہجہاں آباد نشو ونما یافتہ - قبلِ فکرِ شعر بطور سادہ یاد داشت از روزے کہ بہ حلقۂ شاگردی پسر میر قمر الدین منت کہ نظام الدین نام دارد درآمدہ طرزِ متانت گوئی خاندانِ ایشاں اختیار کردہ بافقیر ہم بسیار بخوبی پیش می آید - ازوست -

---

(نوٹ صفحہ ۲۲۴) لالہ درگا پرشاد مضطرب خلفِ دیوان بھوانی پرشاد قوم کالیتھ سکینہ جوانِ صالح وخوش خلق است - بزرگانش از ہمیشہ ہمہ عمدہ معاش باجاہ وثروت بودہ اند چنانچہ در ۱۱۹۳ھ ہجری کہ راجہ بھگونداس صوبہ دارِ کٹہر بود والد وعموئے شان دیوانِ کل بودند ، باوصفِ قابلیت وشعور سلیقۂ شعر فہمی کہ بسیار درست دارد گاہ گاہے بسببِ موزونیٔ طبع فکرِ شعر می کند - اصلش از شاہجہان آباد خودش نشو ونما بہ لکھنؤ یافتہ - عمرش تخمیناً بست ودو سالہ خواہد بود از آشنایانِ محمد عیسیٰ تنہا است کہ ذکرِ ایشاں گزشت - (نسخہ رامپور)

(۱) مفتون (نخ - ر)

کیا سودا پنے بر میں اب دل کی جستجو کا　　یہاں آتش دروں سے وہ جل چکا کبھو کا
ہر آرزوئے دل کو حرماں نے خوں کیا ہے　　گردن پہ یاس کے ہے خون اپنی آرزو کا

جز یک نگاہِ خشم کبھی اُس کی خو نہیں　　قسمت تو دیکھ یہ بھی کبھو ہے کبھو نہیں

جہاں رکھتا ہو حکم نیشتر ہر خار صحرا کا　　وہاں کیا کیا مزے دے آبلہ میری تہ پا کا
عرق اس لطف سے ہے زیرِ زلف اُس روئے تاباں پر　　شب مہتاب میں ہو جلوہ جوں عقدِ ثریا کا
سراپا ہو گیا آئینہ ساں جوں محوِ حیرانی　　دلِ مرہونِ ہوا ہے محو کس کے رُوئے زیبا کا

پڑا ہے شور دل میں جب سے اُس کانِ ملاحت کا　　یہاں ہر زخم ہے یہاں نمکدانِ قیامت کا
برہنہ پائی لے چل مجھکو اُس دشتِ مغیلاں میں　　جہاں ہر خار کو دعویٰ ہے نشتر کی نیابت کا
نہیں ہے ملتفت مدت سے یہاں وہ دشنۂ مژگاں　　لبِ ہر زخمِ دل سے خون نکلے ہے شکایت کا
یہاں گو حوصلہ طاقت کا برگِ کاہ سے کم ہے　　ولے روکش سدا رہتا ہوں میں صد کوہِ محنت کا
شہیدِ لطفِ قاتل ہوں کہ بعد از قتل کل اُس نے　　کیا محرم لبِ افسوس و انگشتِ ندامت کا

(۱۵) ماہر

میاں فخرالدین ماہر تخلص خلفِ اشرف علی خاں کہ عمدۂ خاندانِ ایشاں شہرت تام دارد شخصِ مُسن و جہاندیدہ است مدتے بخدمتِ مرزا رفیع سودا اوقاتِ عزیزِ خود را بہ کتابتِ دیوانش صرف ساختہ۔ چوں فیضِ صحبتِ بزرگاں ضائع نمی رود خود ہم چیزے موزوں کردہ دآنرا از نظرِ مرزا گذرانده۔ ازیں جہت اکثر اوقاتِ خود را از مصاحبان و مشیرانِ مرزا می شمارد و فخریہ می گوید کہ مونسِ ہر وقتِ ایشاں بودہ ام وطرفہ تر ایں کہ

باوصفِ آگاہیٔ فن اگر کلامش بنگاہ کنی خالی از سخافت نیست، ورینجا این مثل بسیار بموقع بیاد آمدہ کہ دوران باخبر در حضور و نزدیکانِ بے بصر دور۔ از اشعار اوست۔

جو اس کے در پہ بیٹھے ہیں سمجھتے ہیں وہ در کس کا — ہوئے جو اس کے آوارہ وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا

ملی فرصت نہ اتنی بھی کہ اُٹھ کر مانگتے پانی — ہوا تیرِ نگہ یوں آہ دل میں کارگر کس کا

ہوا اوپر سکے جانے کا اُس کے گھر کس کا — فرشتہ پر نہ جہاں مارے وہاں گذر کس کا

(۱۶) موزوں

میر فرزند علی موزوں تخلص متوطنِ سامانہ شخصِ کثیر الکلام است۔ دعوائے شاعری خیلے در دماغش پیچیدہ، بگمانِ باطل خود را از ہمہ بہتر می داند و فکرِ شعر در زبانِ ہندی و فارسی ہر دو میکند اما میلِ طبعش در فارسی از کمالِ تشیع بگفتنِ مثنویاتِ مدحیۂ امیر علیہ السلام و نظم کردن معجزاتِ آنجناب مثلِ میر شمس الدین فقیر بیشتر است بلکہ خود را بہ شاگردیِ میر موصوف نیز متہم می سازد اما فرقِ شب و روز است۔ از وست۔

یار ہی حیت چڑھا ہوا بیٹھے ہیں ہم اُداس سے — ذکر کر اُس کا ہمنشیں اُٹھ نہ ہمارے پاس سے

نرگس کا پھول بھیجے نامہ میں یار کو — معلوم تا کرے وہ مرے انتظار کو

(۱۷) محزوں

عالم شاہ پیرزادہ محزوں تخلص، ساکنِ قصبۂ امروہہ درایامیکہ فقیر بکتب نشیں بود او در آں ضلع شہرت بہ شاعری داشت و در ماہِ محرم مرثیہ و سلام نیز می گفت و می خواند دو سہ شعر ازو بخاطر است۔

بے محابا چاک کرتا ہے گریباں کے تئیں — کس کے آنے سے چمن میں گل کو سودا ہو گیا

اسیر مرتے ہیں حسرت میں قتل کی سچ کہہ ۔۔۔ خدا کے واسطے کس دن عتاب ہووے گا

اہلِ دنیا تو نہیں دیتے ہیں محزوں غم کی داد ۔۔۔ کوہکن کو خواب شیریں سے جگاؤں تو سہی

(۱۸) محشر

محشر بداؤنی کہ ہیچ از احوالش خبر ندارم۔ یک غزلش بر بیاضِ کہنہ کہ از مدتے پیشِ فقیر است مسطور بود۔ چوں اندکے در سلیقۂ سخن درست می نماید حوالۂ کاغذ کردہ شد۔ از وست

تھنبے ہی نالہ سے گر یک نفس زباں میری ۔۔۔ بہے ہے پھوٹ کے یہ چشم خونفشاں میری
جدھر کو لے اُڑے دل کی تپش کروں پرواز ۔۔۔ نہیں ہے برقِ صفت ہاتھ میں عناں میری
ہر ایک وقت کا یہ روٹھنا ترا ناحق ۔۔۔ بلا ہی جان پہ اے شوخِ بدگماں میری
ملی تھی چندے محبت کے ہاتھ سے فرصت ۔۔۔ نظر یہ پھر چڑھا ہے اک جواں میری
کہوں ہوں بات میں ہر چند خیر خواہی کی ۔۔۔ غرورِ حسن میں سنتا ہے تو کہاں میری
ثنا میں زلف کی از بس کیا گیا محشر ۔۔۔ قلم کی طرح سیہ ہو گئی زباں میری

(۱۹) مست

جوانِ نوخواستہ بود شاگردِ میر امانی اسد۔ در مشاعرہ ہائے دہلی اکثر بر مکانِ فقیر ہمراہِ ایشاں می آمد، مولف دراں روز ہا غزلے کہ طرح کردہ بود مصرعش را در مقطعِ تضمین کردہ است۔[2]

مشاعرہ میں چلو مست مصحفی جو کہے ۔۔۔ کبھی ملا تو کرے بارے مہرباں ہم سے

---

(۱) ہتھا ہے جان پہ (بجنسہٖ)

(۲) کردہ آوردہ واں اینست۔ (ن خ) (ن) چل ملے۔

(۲۰) مقصود

سقا شاعر بازاریست با وصفِ بے علمی جزانیکہ طبیعتش موزوں و رواں است ہیچ صفتے نہ دارد و گاہی درمجلسِ شعرا قدم نے گذارد۔ اطفالِ اجلاف بہ حلقۂ شاگردیش درآمدہ کلامِ واہیش را در ہنگامہ ہا و میلہ ہا می خوانند خصوصاً در ایام ہولی۔ دو شعرش بر مثالے کہ جفتِ لعل از سنگریزہا برآید بہ نظرِ ایں مبصر رسیدہ و آں اینست۔

عشق کیا جانے کدھر تھا مجھے معلوم نہ تھا | عشق کا دل ہی میں گھر تھا مجھے معلوم نہ تھا

بوسہ لینے سے خفا ہوتے ہو کیوں مشفقِ من | بوسہ وہ چیز ہے دونوں کو مزا دیتا ہے

(۲۱) مائل

میاں محمدی مائل کہ متصل جامع فتحپوری قیام دارد و از شعرائے متوسطِ شاہجہاں آباد است اگرچہ فقیر را بایں بزرگ اتفاقِ ملاقات نیفتادہ اما یک دو شعرش زبانی عاقل شاہ روزے کہ برائے شنیدنِ اشعار[1] ایں ہیچمداں می آمد بہ سمع می رسید۔ سلیقۂ سخن سنجیش بسیار بردرستی معلوم می شود۔ ازوست

اتنا میں مر کے دل سے ترے دور ہو گیا | اک دن بھی آ کے تو نہ سرِ گور ہو گیا

بتوں سے مل کے گنوایا[2] ہے دین و دل مائل | یہ کافر آہ خدا کا بھی ڈر نہیں کرتا

(۲۲) مہلت

مرزا علی مہلت شاگردِ جرأت چند سال گذشتہ اند کہ اوراپیش ازیں[3] بہ علی نقی محشر مناظرہ

---

(۱) مزخرفات دن خ (۲) گنوا تا ہو ان خ (۳) ازیں تعلقہ نہ علی نقی محشر (بجنسہ) ان خ

درمیان آمده بود آخر ہردو بریں قرار دادند کہ از گومتی عبور کردہ آن روئے آب بہ تیغ جنگ کنند آخر ہمیں کردند کہ مشارٌ الیہ چوں زخمی شدہ بخانہ رسید وار ثانش ہر چند پرسیدند از ضاربِ خود نشان نہ داد و در عرصۂ قلیل از ہماں زخمِ جانستان زندگانی را جواب داد۔ از وست۔

گر یادِ گلرخاں کی تہہ خاک کیجئے — تو قبر میں بھی تن پہ کفن چاک کیجئے

مرنے کے بعد بھی نہ گئی دل کی وہ طپش — آرام زیرِ خاک بھی اب خاک کیجئے

(۲۴) منت

میر قمر الدین منت متوطنِ سونی پت کہ شاعرِ مسلم الثبوتِ فارسی است۔ در ابتدا چندے استفادہ ریختہ از محمد قایم نمودہ، چنانچہ مشارٌ الیہ او را در تذکرۂ خود ہمیں جہت بشاگردی یاد کردہ۔ ہرگاہ بعد پیدا کردنِ قوتِ علمی و تحصیلِ عربی و فارسی نام بفارسی گوئی بر آورد و در آں زمان خود را شاگردِ میر شمس الدین فقیر میگوید و چندے پیشِ فتوت حسین خان ہم آمد و شدے داشت۔ غرضکہ مفصل احوالش در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام زیادہ بریں نوشتن موجبِ دردِ سرِ سامع خواہد بود۔ تصانیفِ بسیار از و بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ گاہ گاہے برائے تعلیمِ شاگردانِ ہندی گو لب بزمزمۂ ریختہ می کشود و الا افتخار او بریں نبود۔ فقیر بعد تاریخ رحلتش کہ از دو سال جہان فانی را پدرود کردہ، دو سہ شعر تاریخش برائے یمن می نویسد۔

تاریخ لمولف

منت کہ ہیچگہ بہ فنونِ کمالِ شعر — از ہمسراں نہ کردہ کسے ہمسری او

دیوانِ زندگیش چو شیرازہ واگذاشت — در شہر فاش شد خبرِ ابتری او

چوگان و گو نماند و نگاہ ور زبان شکست — خالی بماند عرصۂ جولانگری او

ساقیِ روزگار دریں مجلسِ خراب — حنظل فشرد در قدحِ آخری او

واحسرتا کہ سالِ وفاتش نوشتہ شد — منت کجا و زمزمۂ شاعری او

۱۲۰۷ھ

من کلامہ

مدعی اُس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے | پھر تمنا کو یہاں مژدۂ مایوسی ہے
میری ہی طرح جگر خوں ہو ترا مدت سے | لے حنا کس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے
آہ اے کثرتِ داغِ غمِ خوباں کہ مدام | صفحۂ سینہ پُراز جلوۂ طاؤسی ہے
تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھکو منت | ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خوشی ہے

ہم سے وہ جوشش وہ الفت دور کی | آپ کو سوجھی نہایت دور کی

(۲۴) محب

شیخ ولی اللہ محب تخلص تبیع وہم صحبتِ مرزا رفیع اصلش از شاہجہان آباد است شعر را بہ متانت و پختگیٔ تمام می گفت۔ سوائے دیوانِ ریختہ یک مثنوی ہم بزبانِ فارسی بہ سلکِ نظم کشیدہ۔ از چند سال بصیغہ شاعری درحضورِ مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر امتیاز تمام داشت۔ دو سال است کہ بہ مرضِ مزمن ناسور پا وداعِ جہانِ فانی کردہ۔ مرقدش در پیر جلیل است۔ از وست۔

جس طرف تشنۂ دیدار ترے جا نکلے | اُدھر آنکھوں سے بہاتے ہوئے دریا نکلے
یار آیا نہ کہا ضعف سے میں اتنا بھی | خیریت صاحبِ من آج کدھر آ نکلے
قافلہ پہلی ہی منزل سے دیا ہم نے چھوڑ | سفرِ ملکِ عدم کو تنِ تنہا نکلے
جی جو بے چین ہو کوچہ ہی ترا دیکھ آئے | کیا کریں ایک گھڑی دل وہیں بہلا نکلے
ہم چمن میں گئے تھے سیر کو گل دیکھتے ہی | یاد آیا جو وہ گل باغ سے گل کھا نکلے

رکھتی ہے عین وصل سے باہم قرین مجھے | عینک تصور اُس کے کی ہے دوربیں مجھے

گلزارِ حسن پھولتی ہے اس میں چار فصل　　آئینہ کی خوش آئی سراسر زمیں مجھے
جائے تشہد اپنی یہ خواہش ہے اے محب　　بھولے نہ ذکرِ دوست دمِ واپسیں مجھے

خانۂ دل کہ نہ ہو عشق کا آئین جس میں　　ہے وہ قرآن کہ نہیں سورۂ یٰسین جس میں

باغ میں جب وہ گلِ تازہ بہار آتا ہے　　بوئے گل پھر تو ہوا پر ہی دھری رہتی ہے

غلط ہم کو کہتا ہی ہو بے مروت　　تو ہی ہے بے مروت ہی او بے مروت
نہ دیویں جگہ جی میں منہ پھیرتے ہی　　اک آئینہ ہی اور تو بے مروت
نہ دو بوسہ اور مفت لو دل ہمارا　　پھر اس میں ہمیں کو کہو بے مروت

چشمِ پرآب میں ہی جلوہ قدِ دل جو کا　　دید کرتا ہوں عجب سروِ کنارِ جو کا
شبِ فرقت میں جو اُٹھتی ہیں جگر سے آہیں　　اک جہان مجھکو نظر آئے ہے عالمِ ہو کا
ہاتھ تب عشق کے میں سنگِ گراں پر ڈالا　　زورِ فرہاد کے جب تول لیا بازو کا
باندھنوں پر یہ نیا باندھنوں باندھا ہی محب　　شوخ نے چیرہ جو سر پر ہے سجا سالو کا

اُس بت نے گلابی جو اُٹھا منہ سے لگائی　　شیشہ میں عجب آن سے جھکی تھی خدائی
عالم میں نشہ کے شبِ مہتاب میں تیرے　　خورشید سے مکھڑے نے طلسمات دکھائی
مارا ہے اُسے بھوڑ(۱) ترے تیرِ نگہ نے　　جس ساتھ میاں تو نے ذرا آنکھ لڑائی
گو غیر کے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے　　چھپتی نہیں وہ بات جو ہول سی بنائی

(۱) ٹھوڑ - (ن نور محمد)

واللہ ہمیں عشق کی بھولی ہوئی سب چال
کافر تری رفتار نے پھر(۱) یاد دلائی

ہر دم تو بھرا شیشہ چھکتا ہی نشہ میں
ڈرتا ہوں کہ تیری نہ موڑک جائے کلائی

آئینہ نمد پوش ہوا عشق میں تیرے
چارا بروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی

ہم جھوٹھ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا
ہے روزِ قیامت تری اک شب کی جدائی

عاشق کو محبؔ سلطنتِ ہر دو جہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی

باندھ جوڑا کیا چمک کر اس نے سج بدلی محبؔ
برقِ زیرابر ہے گویا کناری کا مباف(۲)

دل تو پہلے لے چکے اب کیا ہی مطلب آپ کا
بے تکلف وہ بھی کہدیجے کہ ہی سب آپ کا

روز مرہ عاشقوں سے ہی جوابِ صاف کا
مٹ گیا ان نو خطوں کے دل سے حرف انصاف کا

یہ رگِ جاں ہی کسی مقتول عاشق کا میاں
یا کہ جوڑے پر نمایاں رشتہ ہی موباف کا

کی چشم کی سیاہی سپید انتظار نے
تس پر بھی آہ خط نہ لکھا مجھکو یار نے

دھونی لگا رکھی ہے ترے در پہ آہ کی
لے شعلہ خو مرے دلِ امیدوار نے

جو خواہشِ دل تھی سو وہ ہیہات نہ نکلی
گالی کے سوا منہ سے ترے بات نہ نکلی

دلی کے ہیں کوچوں میں محبؔ سحر کے پھانسے
کس روز نئی ایک طلسمات نہ نکلی

اُسے ذبح کرنے دیجو تو منہ سے آہ کیجو
جو یہ رسمِ عاشقی ہے تو محبؔ نباہ کیجو

یہ امیدوار کب تک جیئے اتنی آرزو میں
کبھی مڑکے اس طرف بھی تو ذرا نگاہ کیجو

---

(۱) "سب" بجائے پھر (ن خ)، (۲) موباف (ن خ)

دنیا میں کیا کسی سے سروکار ہے ہمیں | تجھ بن تو اپنی زیست بھی دشوار ہے ہمیں
تو ہی نہیں تو جان تری جان کی قسم | یہ زیست کس کے واسطے درکار ہے ہمیں

(۲۵) منتظر

میاں نورالاسلام منتظر تخلص ولد شاہ فیض علی عرف پیر غلام برادر بزرگ شاہ بدر علی ابن شاہ محمد جلیل[1] کہ او برادر خورد شاہ عاقل سبز پوش خدایاد وخود فراموش بود جوانِ صلاحیت شعار دو استہ مزاج و شوریدہ سر است تحصیلِ عربی تا صرف و نحو دارد و اکثر کتبِ درسیٔ نظم و نثر فارسی ہم بخوبی خواندہ از دہ دوازدہ سالگی طبعِ موزوں داشت۔ چوں شور حسن تو امان است در ہماں ایامِ شباب جائے تعلقِ خاطر بہم رسانیدہ تا دوازدہ سال دیگر خود[2] را بہ تقاضائے دلفریبیٔ محبوب مصروفِ فکر شعر داشتہ اوقات شباں روزی را شغلِ مجنونانہ صرف می کرد۔ از ہشت سال برائے مشورۂ کلامِ خویش پیش فقیر آمد و شد دارد۔ ہرگز دریں عرصہ باوجود کم ملاقاتی و فصلِ سال و ماہ مثلِ دیگراں رجوع بہ طرفِ دیگر نہ کردہ۔ اگرچہ بعض اشخاص[3] ذہانت طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ او را بہ طریقے بہ حلقۂ بیعت خویش کشند ہرگز التفات[4] نہ کردہ تا آنکہ بہ برکتِ راسخ الاعتقادیٔ خویش بمقامِ والائے شاعری رسیدہ۔ حالا برائے کلہ شکنیِ آنہا برابرِ من موجود است و کلامش از غایتِ لطف و صفا ہیچ از کلامِ مولف در پایہ کمی نیست۔ غرضکہ از شاگردانِ رشید ایں خاکسار بمقدار است۔ عمرش تا امروز بست و پنج سالہ باشد[5]۔ از وست[6]۔

ہردم خیالِ یار جو پیشِ نظر رہا | ہجراں میں بھی وصال ہمیں بیشتر رہا
گر یونہی منتظر سے خفا رہو گے تم | سن لو گے ایک دن کہ وہ کچھ کھا کے مر رہا

(۱) ذکر خود (ن خ) (۲) اشخاص منوی (ن خ) (۳) التفات بگفتہ ایشاں نہ کرد (ن خ) (ن) محمد ظلیل (ن نجم) (۴) "خواہد بود" بجائے "باشد" (ن خ) (۵) انتخاب دیوان اوست (ن خ)

طرفِ چمن نہ جا نہ سوئے لالہ زار دیکھ　　تو آپ باغِ حسن ہے اپنی بہار دیکھ
ہے روزِ حشر دیکھنے کا شوق گر تجھے　　اے منتظر تو اپنی شبِ انتظار دیکھ

چاہت مرے دل کی آزما دیکھ　　ظالم کہیں تو بھی دل لگا دیکھ

آئے ہیں تیری گلی میں اک زمانہ چھوڑ کر　　جاویں اب پیارے کہاں ہم یہ ٹھکانا چھوڑ کر
کیا کریں ناچار پھر آئے تری محفل میں یار　　جی ہی سے ہم تو گئے تھے یہاں کا آنا چھوڑ کر
آرزو میں سجدہ کے سر دے دے مارا منتظر　　سر پہ کیا آفت یہ لی وہ آستانا چھوڑ کر

خلق دیکھے ہے مہِ عید تمام آج کی رات　　تو بھی اے ماہ جھلک جا لبِ بام آج کی رات
کل شبِ وصل کو پھر دیکھئے یارب کیا ہو　　ہو گئی باتوں ہی باتوں میں تمام آج کی رات
اک ذرا بے ادبی ہوتی ہے تقصیر معاف　　پائینتی گر رہے کہئے تو غلام آج کی رات
منتظر ہے یہ شبِ ہجر کہ اک روزِ سیاہ　　نہ تو شیشہ ہے نہ ساقی ہے نہ جام آج کی رات

چمن تو پھول گل و لالہ زار پر اپنے　　کروں ہیں ناز دلِ داغدار پر اپنے
دنوں کو روتے ہی روتے تمام عمر کٹی　　کریں نہ خندہ ہم اس روزگار پر اپنے
ہمارے جی میں تو تھا زہر کھا کے سو(۱) رہیے　　ولے یہ ڈر ہے نہ تہمت ہو یار پر اپنے

صدمہ جو شبِ ہجر کا یاد آئے ہے مجھکو　　اک دو ہی گھڑی ایسی کچھ آجائے ہے مجھکو
پیدا ہوئی اب سے نئی طرح کی وحشت　　نہ شہر نہ صحرا نہ چمن بھائے ہے مجھکو

---

(۱)، مر

تم پیار کرو گر نہ صنم اور کسی کو — سوگند لو پھر چاہیں جو ہم اور کسی کو
اغیار تو جھوٹے ہیں میں کب تم کو کہا کچھ — پوچھو تو بھلا دیکے قسم اور کسی کو
میں نے جو کہا گھر مرے چلئے کوئی دم آپ — تو ہنس کے کہا دیجئے یہ دم اور کسی کو

گئے چوری سے جو تم غیر کے گھر آخر شب — دلِ آگہ نے ہمیں دی یہ خبر آخرِ شب
کل شبِ وصل جو تھی کیسی مچائی تھی دھوم — بولتا آج نہیں مرغِ سحر آخرِ شب
ق
رات بھر تو رہی اُس ماہ کے آنے کی امید — پر ہوا خوب مرا حال تبر آخرِ شب
یاد کر تکیۂ زانو کو میں اُس کے ہر دم — دے دے مارا کیا بالیں سے سر آخرِ شب
منتظر کیوں نہ جگر سینہ میں فریاد کرے — لے گیا لوٹ کوئی دل کا نگر آخرِ شب

کہہ پردہ فاش نالہ نے کہہ آہ نے کیا — رسوائے خلق ہم کو تری چاہ نے کیا

چاہت کی بات مجھ سے نہ دم دے کے پوچھئے — اپنے ہی جی سے آپ قسم دے کے پوچھئے

لب پر مرے اُس لب کی تقریر ہے اور میں ہوں — آنکھوں کے تلے اُس کی تصویر ہے اور میں ہوں

کیا جو تم نے مجھے آج پیار تھوڑا سا — نکل گیا مرے جی کا بخار تھوڑا سا

سرو زمیں میں گڑ گئے غنچوں نے سر جھکا دیا — خندۂ گل کو دیکھ جو یار نے مسکرا دیا

یوں لے گئی دل زلفِ سیہ فام لگا کر — جوں صید کو کھینچے ہے کوئی دام لگا کر

کیوں گردشِ دوراں کا نہ کیجے گلہ ہر روز — پڑتا ہے نیا پاؤں میں اک آبلہ ہر روز
ہرگز نہ ہوا طے یہ بیابانِ محبت — درپیش رہا مجھکو نیا مرحلہ ہر روز
ہے جی میں کروں میں بھی سفر ملکِ عدم کو — یاروں کا اودھر جائے ہے اک قافلہ ہر روز
وحشت نے یہ گھیرا ہے کہ دیوانہ کے تیرے — پڑتا ہے نیا پاؤں میں اک سلسلہ ہر روز
اے منتظر اس رشک نے مارا کہ کرے ہے — اک یار نیا وہ صنمِ دہ دلہ ہر روز

جہاں سے ہم دلِ پُر اضطراب لیکے چلے — عدم کو ساتھ ہی اپنے عذاب لیکے چلے
کبھی نہ لے گئے ہم دل کو اُس تک اچھی طرح — جو لے چلے تو بحالِ خراب لے کے چلے
یہ سرنوشت میں تھا جاوے راہ میں مارا — وہاں سے خط کا جو قاصد جواب لیکے چلے
موا جو منتظر اُن کا وہ اُس کی تربت پر — گل اور شمع برائے ثواب لیکے چلے

کبھی گر بعدِ ماہ و سال شکل اے ماہ دکھلائی — تو پھر برسوں ہی مشتاقوں کو تونے راہ دکھلائی
بروزِ وصل شادی مرگ ہوجانا ہی بہتر تھا — فلک نے یہ شبِ ہجراں ہمیں کیوں آہ دکھلائی

یک سرِ مو نہ یہ حالِ دلِ ابتر سمجھے — زلف سے تیری خدا او بت کافر سمجھے
مجھ سے کہتا تھا وہ اک روز سمجھ لونگا میں — حالتِ نزع میں ہوں میں ابھی آکر سمجھے
دولتِ حسن ہے جس پاس یہ ہے اس سے سوال — کچھ نہ لے اور نہ دے پر ہمیں نوکر سمجھے

کیا ہجر میں بسر یونہیں اوقات ہووے گی — یارب کبھی تو اُس سے ملاقات ہووے گی
جب جانیں گے کہ آج ہمارے بھی دن پھرے — ہمدم نصیبِ وصل کی جب رات ہووے گی
کہتا تھا ایک بات یہ میں تجھ سے ہوں خفا — دھڑکے ہے دل مرا کہ وہ کیا بات ہووے گی

کچھ نہ پایا جب نثارِ عید قرباں کے لئے — لے چلے تب جاں بکف ہم نذرِ جاناں کے لئے
اے صبا یہ ہم صفیروں سے مرا کہیو پیام — کوئی تڑپے ہی قفس میں سیرِ بستاں کے لئے
ہم اسیروں کو رہائی کیا ہو جب ہر عید کو — قفل تو تیار ہوں در ہائے زنداں کے لئے

غصہ میں اُس جبیں پہ پڑے جب شکن کئی — دریائے قہر اُن سے ہوئے موجزن کئی
کیوں سیرِ لالہ زار کو اُس بن گیا میں ہائے — جو تازہ ہو گئے مرے داغِ کہن کئی
آنکھیں کبھو لڑائیں کبھو دیکھ کر تنا — میلے میں اس نے ہم سے کئے بانکپن کئی

امید ہے کہ مجھکو خدا آدمی کرے — پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے
اس طرح وہ فریب سے دل لے گئے مرا — جس طرح آدمی سے دغا آدمی کرے
بھائیں نہیں کچھ اُس کے نکلتی ہو اپنی جان — کیا ایسے بے وفا سے وفا آدمی کرے
مارا ہے کوہکن نے سر اپنے پہ تیشہ آہ — دل کو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے
گر کچھ کہا بگڑ کے میں بس اُس نے ہنس دیا — کیا ایسے آدمی کا گلا آدمی کرے
گذرا میں ایسی چاہ سے تا چند ہمنشیں — بیٹھا کسی کے سر کو لگا آدمی کرے
ہے عشق بد مرض کوئی جاتا ہے منتظر — کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

(۲۶) ممنون

میر نظام الدین ممنون تخلص خلف الرشید میر قمر الدین منت جوانِ سعادتمند وذی شعور است۔ در حینِ حیات پدرِ بزرگوار بعدِ تحصیلِ کتبِ رسمی بمقتضائے موزونیِ طبع خود را مصروفِ گفتنِ شعرِ ہندی و فارسی میداشت تا آنکہ در عرصۂ قلیل قوتِ شاعری چنانکہ شاعر را باید پیدا کردہ کلامِ خود برتبۂ کلامِ پدر رسانید اکثرے از موزونانِ شہر استفادہ

شیراز و میکند حق تعالیٰ سلامت دارد - از دوست -

بندہ ہوں حسنِ صورت و عشقِ مجاز کا
ہر آئینہ میں جلوہ ہے اُس جلوہ ساز کا
از خویش رفتگی ہی پہ ہم غش ہیں "یہاں نہیں
عــزمِ کلیسیا و ارادہ حجاز کا
اے آہ بے ادب نہ اُسے پھونکیو کہ ہے
دل جلوہ گاہ، پردہ نشینانِ راز کا
ہے آستانِ دیر پہ اپنی نشست و خاست
کب ہو حرم میں ہم کو ارادہ نماز کا
یہاں جان تک بھی دے چکے پڑا ہی ہاں نہیں
جھگڑا چکے گا کیونکہ یہ ناز و نیاز کا
ممنوں دلِ ستم زدہ ہے عشق کا حریف
یہاں ہر دو چار صعوۂ بے بال باز کا

کل جو خلوت میں وہ بت محوِ خود آرائی تھا
آئینہ پشت بہ دیوار تماشائی تھا
جب مقابل ہوا اُس برقِ بلاے ممنون
وقفِ آتش مرا سامانِ شکیبائی تھا

کھولا جو پیچ طـرۂ عنبر شمیم کا
مشکِ ختن سے بھر گیا دامن نسیم کا
جب کھولدوں ہیں سینۂ سوزاں کے چاک کو
تب بازِ روئے خلق پہ در ہو جحیم کا
دیکھا جو اُس کا قد و دہاں زلف ہٹ گیا
زاہد کے دل سے نقش الف لام میم کا

بس ہے یہ لطفِ صبا بہر گرفتارِ قفس
راہ بوئے گل کرے سوراخ دیوارِ قفس

منکر ہمارے قتل سے ہوتا ہی تو ہنوز
رنگیں ہے اپنے خون سی وہ خاک گو ہنوز
آنکھیں بسانِ آئینہ پتھرا گئیں مری
لے خود نما پر آیا نہ ادھر کو تو ہنوز
اپنا غبار بھٹکے ہے مانندِ گرد باد
گو ہو گئے ہیں خاک پہ ہی جستجو ہنوز

(۱) ہم غش یہاں نہیں۔ (ن خ)

رکھے ہی ڈھنگ کچھ ساقی شراب ناب آتش کا — مقطر کیا گیا ہے گر گلِ شاداب آتش کا
مرے یہ گرم آنسو پونچھ مت دستِ نگاریں سے — کہ ان چشموں سے رہتا ہی رواں سیلاب آتش کا
ڈراتا ہی عبث ممنوںؔ کو تو دوزخ سے اے واعظ — دکھاؤں داغِ دل تو ہووے زہرہ آب آتش کا

قدم (۱) رکھا ہے یہاں کس نے کہ گل تصویرِ قالی کا — رکھے ہی ڈھنگ (۲) اُس پائے حنابستہ کی لالی کا
دعائیں زیرِ لب آہستہ آہستہ اُسے دن موں — جو یاد آوے ہی لب تک آکے مُرک جانا وہ گالی کا
پڑا ہی پرتوِ مہ طلعتاں اس دیدۂ تر میں — یہاں دیکھ آکے عالم ماہتابِ برنگالی (۳) کا
نگاہِ شوخ یوں گستاخ مت جا اُس کے عارض تک — خطر ہی سبزۂ نوخیز خط کو پائمالی کا
لکھا جو شعر تعریفِ جمالِ یار میں ممنوںؔ — وہ حسنِ نظم میں ہمسر ہے اشعارِ جمالی کا

کب گل ہی ہوا خواہ صبا اپنے چمن کا — وابستگیٔ دم سے ہی رفو زخمِ کہن کا
بے تابیٔ دل تیرے شہیدوں کی کہاں جائے — کچھ کم رگِ بسمل سے نہیں تارِ کفن کا
اس (۴) واسطے دیتا ہوں اب آئینہ کو بوسہ — وہ شوخ جو دلدادہ (۵) ہی عینِ اپنے دہن کا
طفلی میں دیا ہے سبق استاد نے تجھکو — نازِ و نگہ و عربدہ و شوخی و فن کا
ہم زمزمہ ہم تم تھے کبھی ہی یہی پیغام — مرغانِ قفس کے لیے مرغانِ چمن کا

دھویا ہی کس نے منہ کہ یہ ہی رنگ آب کا — لبریز رنگِ گل سے ہے ساغر حباب کا

رہے ہی روکشِ نشتر پہ آبلہ دل کا — یہ حوصلہ ہی کوئی بل بے حوصلہ دل کا

---

(۱) قدم رکھا یہاں کس نے کہ الخ (ن نور محمد) (۲) رنگ (ن خ ۔ ن نور محمد) (۳) برشگالی (ن خ)
(۴) کس واسطے ۔ (ن خ) کس واسطے دیتا ہے اب الخ (ن نور محمد ۔ (۵) ہو لدادہ نہیں اپنے دہن کا (ن خ)

سمجھ کے رکھیو قدم رہروانِ وادیِ عشق — رواں ہے یہاں دمِ خنجر پہ قافلہ دل کا
عبث نہیں ہے یہ وابستہ پریشانی — کسو کی زلف کو پہنچے ہے سلسلہ دل کا

تھا روز کونسا کہ یہاں غم نہیں رہا — پڑھ پڑھ کے دل کا مرثیہ ماتم نہیں رہا
کیوں مسکی مسکی چوٹی ہے اور بکھرے بکھرے بال — گر اختلاط غیر سے باہم نہیں رہا

دورِ فلک میں کس کو نہیں میکشی سے ذوق — رکھتا ہے ماہ ہاتھ میں ساغر بلور کا
ممنونِ ہر رنگ حضرتِ سودا جو دیکھئے — ہر سنگ میں شرار ہے اُس کے ظہور کا

عین راحت ہے جو کچھ ہم پہ ستم کیجے گا — سر جھکا دیں گے اگر تیغِ علم کیجے گا
کس کو پروا کہ ہوا دارِ گل و لالہ رہے — باغِ دل اپنے ہی کو رشکِ ارم کیجے گا
دیکھ کر مجھ کو یہ کہتے ہیں بتانِ خوشخط — ایک دن سر کو ترے تن سے قلم کیجے گا

نہیں ہے جلوہ نما غنچہ شاخ پر گل کا — یہ ہو رہا ہے گرہ شعلہ آہِ بلبل کا

ہم سے کتنے بے دلوں کی کب ہے منزل تک پہنچ — یار گو دل میں ہے پر ہم کو کہاں دل تک پہنچ
کشتیِ طاقت شکستہ اور بحرِ غم کا جوش — مژدہ نومیدی نہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ
دشتِ تنہائی میں صحرا گرد ہی جوں گردباد — مشتِ خاکِ قیس کی مشکل ہے محمل تک پہنچ
صیدگاہِ شوق میں کیا بے ادب وہ صید ہے — جو کہ جاتا ہے تڑپ کر پائے قاتل تک پہنچ

ہے سایہ فگن زلفِ سیہ فام زمیں پر — یا صبحِ قیامت کی ہے یہ شام زمیں پر

(۲۷) محترم

خواجہ محترم خاں محترم تخلص کہ فقیر از احوالِ ایشاں مطلع نیست۔ از وست[1]۔

اے محترم اتنی اشکباری
کھل جاتا ہے ابر بھی برس کر
کیا رونا ہی یہ ترا کہ جس سے
بدنام ہوا میں اب تو بس کر

پیغام تو جنوں کے آنے لگے ہیں مجھ تک
شاید بہار کے دن نزدیک آن پہنچے

(۲۸) مصدر

میر ماشاء اللہ مصدر تخلص پدرِ میر انشاء اللہ خاں کہ کمالاتِ طبعی ایشاں از غایتِ اشتہار محتاجِ بیان نیستند۔ گاہ گاہے خیالِ شعر ہم می کنند و ہر کہ پیشِ ایشاں کلامِ خود بخواند در جواب آں بدیہہ گوئی را زیادہ[2] می شوند۔ فقیر اگرچہ ایں بزرگ را ندیدہ اما اوصافِ کمالاتش بیشتر شنیدہ، دو شعر از و بسمع رسیدہ۔

خدا کرے کہ مرا مجھ سے مہرباں نہ پھرے
پھرے جہاں تو پھرے پر وہ جانِ جاں نہ پھرے

کافر ہو سوا تیرے کرے چاہ کسی کی
صورت نہ دکھاوے مجھے اللہ کسی کی

(۲۹) مضمون

میاں شرف الدین مضمون از قدما است، دو شعر ایشاں بطریقِ یمن نوشتہ۔

ہمارا اشک قاصد کی طرح یک دم نہیں تھمتا
کسی بے تاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے

---

(۱) چند اشعارش از نظر گذشتند انچہ انتخاب افتاد نیست (ن خ)، (۲) آمادہ (ن نور محمد)

نہ یہی فتنہ قد و قامت ہے ہنس کے پھر دیکھنا قیامت ہے

(۳۰) مزل

شاہ مزل تخلص از قدما است گویند درویشے بود شعرے از طفولیت یاد دارم۔

دل ہرن میرا مزل رم گیا دشمنوں کے من کے چیتے ہو گئے

(۳۱) معین

بہ شاگردی[1] مرزا محمد رفیع شہرت دارد۔ شاعر کہنہ مشق است فقیر او را ندیدہ یک غزلش مشہور است برائے یادگاری نوشتہ و دو رباعی اینست۔

اے باد صبا باغ میں مت جائیو تڑکے
شاید کہ وہ سوتا ہووے اور بات نہ کھڑکے

جوں شیم کی تختی اگر اُس راحت جاں کو
چھاتی سے لگا رکھئے تو دل کاہے کو دھڑکے

آتے ہی نہیں گر کے سوئے چشم یہ آنسو
اس گھر سے مگر روٹھ کے نکلے ہیں یہ لڑکے

اے ابر بہاری شب ہجراں ہی خبردار
دامن ترا مجھ آہ کے شعلہ سے نہ بھڑکے

سر رشتہ رہ عشق کا ہرگز نہ کروں گم
سو ٹکڑے اگر بچہ نمط ہوں مرے دھڑ کے

قمری ہی فدا باغ میں شمشاد کی دھج پر
ہم صدقہ ہیں اے سرو رواں تیری اکڑ کے

قصہ ہی کرو مختصر اب جانے دو یار و
کیا لینا ہے تم کو مرے قاتل سے جھگڑ کے

ہوں ہیں وہ دوانا کہ بہار آنے سے آگے
زنجیر میں رکھتا ہوں معیں تجھکو جکڑ کے

رباعی

جب سے تجھ ساتھ دل لگایا ہم نے
کیا کیا اندوہ و غم اُٹھایا ہم نے
تقصیر نہیں ہے اس میں تیری باللہ
جیسا کہ کیا تھا ویسا ہی پایا ہم نے

(۱) میاں معین معین تخلص (۲) جی ۰ (ن خ) ۰

دیگر

دل[1] کے ہاتھوں ہمارا جینا معلوم　　خون پیتے ہیں اب تو مے کا پینا معلوم
گر جیب پھٹا ہو تو رفو ہو ناصح　　یہ چاک جگر ہے اس کا سینا معلوم

(۳۲) محشر

مرزا علی نقی محشر، بزرگانش اہل خطہ بودہ اند و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ بمقتضائے موزونئ طبع شعر بہ زبانِ ہندی و فارسی ہر دو میگفت و دعوائے شاعری چناں در دماغش جا گرفتہ بود کہ کسی را بہ خاطر نمی آورد و طرفہ تر اینکہ خود اکثر قدم در راہِ خطا می گذاشت۔ درایامیکہ از بیم دعوائے خون مرزا علی نہلت از شہر برآمدہ وارد شاہجہاں آباد گردید روزے بہ مجلسِ مشاعرۂ مؤلف حاضر[2] شدہ و روزی بہ صحبت کیمیا خاصیت خواجہ میر درد نیز رسیدہ و بہمیں جہت خود را بہ شاگردئ ایشاں متہم میداشت۔ آخر بعد یک دو سال بہ طرف اکبرآباد وغیرہ سیر کردہ ہر گاہ دید کہ فتنہ فرو نشست باز بہ شہر آمد و بہ ہوشیاری تمام زندگانی میکرد۔ وارثانِ مقتول عجالتاً با و آویختن مصلحتِ وقت نمی دانستند چوں ایں ماجرا از خاطرش[3] گردید و چند سال بریں بگذشت در سنہ یکہزار و دو صد و ہشت در عشرۂ ماہ محرم قابوئے وقت یافتہ او را بہ بیکسی کشتند و قصاصِ خونِ نہلت بہ نہلت گرفتند عمرش تخمیناً قریب سی رسیدہ باشد۔ از وست۔

جان منتظر ہے آنکھوں میں وقت رحیل ہے　　جلدی پہنچ کہ تیرے ہی آنے کی ڈھیل ہے

دور میں اُس چشم کے گردوں کو آسایش نہیں　　کس گھڑی کس دم نئے فتنہ کی زایش نہیں
گفتگوار دو زباں کی کوئی ہم سے سیکھ جائے　　کیا ہوا دلی میں محشر اپنی پیدایش نہیں

---

(۱) دوسرا مصرع پہلے ہے اور پہلا بعد میں (ان خ) (۲) شدہ بود (ان خ) (۳) از خاطرش نسیاً منسیاً گردید (ان خ)

(۳۳) معروف

الٰہی بخش معروف تخلص پسرِ عارف خاں جوان خوش اختلاط و وجیہ است در ایامیکہ فقیر تذکرہ با تمام رسانیدہ از شاہجہان آباد بہ لکھنو گذر افگندہ بہ شاگردیٔ میاں نصیر نازش دارد و فکر شعر نیز برویۂ ایشاں کہ تلاش است میکند و ریک دو مشاعرۂ حالِ صاحب عالم شریکِ غزلِ طرحی نیز بود بعد یک دو ماہ باز بہ شہر عود کرد مطلع از و بیاد ماندہ۔

کیا چھٹی اس کی تمامی کی وہ انگیا ہاتھ سے ہاتھ ملتا ہوں گئی سونے کی چڑیا ہاتھ سے

(۳۴) مروت

صغیر علی مروت تخلص کہ بہ پسرِ مصری شہرت دارد ولد کبیر علی عرف حکیم کبیر سنبھلی شیخ انصاری کہ ذکرش گزشت جوانِ قابل و دانا است تحصیلِ کتبِ طب وغیرہ از والدِ خود در رامپور کردہ بمقتضاے موزونیِ طبع چوں شوقِ شعر دامنِ دلش را بسوئے خود کشید او را بہ صحبتِ نجو خاں پسرِ مستقیم خاں کہ جوانِ شاعر دست گزشتہ سپرد و دادینِ اساتذۂ سلف وحال خاطر خواہ میسر آمد ہذا گاہ گاہے کہ فکرِ شعر می کند در آں تلاشِ معنی ہائے تازہ منظور می دارد اکثر غزلش قصیدہ طور است ویک دو قصیدہ کہ گفتہ خیال بندی را در وبطورِ سلیم وسعت دادہ۔

دریں کار رویۂ مرزا رفیع پیش نہادِ خاطرِ اوست۔ در ہماں ایام کہ بہ رامپور بود یک دو داستان برویۂ مثنوی میر حسن در سلکِ نظم کشیدہ با خود داشت ومیخواست کہ آنہارا بہ نظرِ موسی الیہ بگذراند چوں در ہماں ایام میرِ موصوف را سفرِ ناگزیر در پیش آمدہ بسیار تاسف خورد و در رفتہ رفتہ ہماں چند قطرہ اش دریا گردیدند۔ یعنی در عرصۂ پنج شش (۱) سال کہ از سفرِ بنارس در شہر باز آمد جوابِ (۲) مثنوی بہ معنی ہائے تازہ مہیا گردانیدہ بعد اتمام قصہ بہ عرصہ

---

(۱) سال روزہائے کہ از سفر۔ (ن خ) (۲) مثنوی میر صاحب (ن خ)

قلیل بہ ہمسائگی فقیر اور انو یسانیدہ وصاف نمودہ در معرضِ شہرت افگندہ اکثر دوستان نقل گرفتند نازشِ شاعری او بر ہمیں مثنوی است[1]۔ در آغازِ شباب اول چندے بہ ترغیبِ میر حسن فکرِ شعر کردہ و از نظرِ ایشاں گزرانیدہ و بعد ازاں در روز ہائے کہ در رستم نگر اقامت داشت بہ سبب قرب و جوار بہ میاں قلندر بخش جرأت رجوع آوردہ۔ اقرارِ شاگردیش بہ یک کس نیست لہٰذا می گوید کہ ؎ زہر خرمنے خوشۂ یافتم ۔ تمتع زہر گوشۂ یافتم۔ بہ سبب[2] ہمسائگی اتفاقِ ملاقات می شود۔ از وست۔

کیوں تو نے وا کیا تھا بندِ قبا چمن میں
اُڑتی پھرے ہے گُل سے بلبل خفا چمن میں

ہر سمت اب صبا جو پھرتی ہے خاک اُڑاتی
بلبل کے پر پڑے ہیں کیا جا بجا چمن میں

نرگس کی آنکھ تجھ پر پڑتی ہے بے طرح سی
مت وقتِ شام جانا بہرِ خدا چمن میں

جوں لالہ داغِ دل یہاں پھر جل اٹھا ہے شاید
جاتا ہے سیر کرنے وہ بے وفا چمن میں

جیب اپنا گُل نے پھاڑا بلبل موی، مروت
کیوں اپنے غم کا قصہ تو نے کہا چمن میں

چھٹتا نہیں ہے دستِ مصور سے وہ ورق
کھینچی ہے اُس نے جس پہ مرے یار کی شبیہ

ناخن زنی ہیں دل کے ورق پر رہی ہے آہ
کس کس طرح اُس ابروئے خمدار کی شبیہ

کیا صدف ہوں میں رکھوں جو ہر گھڑی گوہر بدست
جوہرِ شمشیر ہوں رہتا ہوں نت خنجر بدست

اپنی صیادی پہ وہ صیاد کیا نازاں ہے واہ
آ گیا ہے ایک جو مجھ سا طائر بے پر بدست

خارِ صحرا نے قدم چومے جو ہیں مجنوں چلا
لی بہارِ ناقۂ لیلےٰ اچشمِ تر بدست

عشق کا قصہ مروت سے سنو اے بلبلو
مثلِ گُل اس بات کا رکھتا ہے وہ دفتر بدست

---

(۱) مثنوی است ماسوائے آں بر غزل و قصیدہ وغیرہ چنداں مفاخرت ندارد و در آغاز۔ (ن خ)
(۲) چوں خانہ اش قرب و جوار مکان فقیر است اکثر ملاقات می افتد۔ (ن خ)

غیروں پہ دیکھ دیکھ کرم اُس نگار کا — چیں بر جبیں ہے نقش ہمارے مزار کا
گوشہ گرد و باد ہے گردش نصیب میں — پر ہے دماغ عرش پہ مجھ خاکسار کا
مجنوں کی خاک بن کے بگولا چلی ہے ساتھ — محتاج کیوں ہو ناقۂ لیلےٰ مہار کا
بن گرد و باد یار کے صدقے ہو اس لئے — ہے رابطہ ہوا سے ہمارے غبار کا

ہے حسن کی اک موج شب ماہ میں دُرریز — قطرے وہ عرق کے نہیں اس جبینِ جبیں پر

نہ چمن ہے نہ گل ہے نہ بو ہے — جلوہ گر یہاں تو ہر طرف تو ہے
دیکھنا ہنس کے اُس کا آنکھ ملا — کیا کہوں سحر ہے کہ جادو ہے

حسنِ چشم آہ یہ کس گل کا مجھے بھاتا ہے — خواب میں تختۂ نرگس ہی نظر آتا ہے
تحفۂ لختِ جگر اشک مرا اے ہمدم — دمبدم گوشۂ دامن کو لئے جاتا ہے
مہر رو پر ترے گیسوئے سیہ کے نیچے — ق — خالِ مشکیں مجھے اس شکل نظر آتا ہے
جس طرح وقتِ سحر موسمِ سرما میں غزال — شاخِ سنبل کے تلے دھوپ کھڑا کھاتا ہے

(۳۵) مصحفی

مخفی نہ ماند کہ مؤلفِ تذکرہ غلام ہمدانی نام دارد و مصحفی تخلص مے گذارد و بزرگانش نوکری[۱] خانۂ بادشاہ کردہ اند از ایامیکہ تفرقۂ شدیدی در سلطنت راہ یافتہ سلطنت خانۂ ایں روسیاہ ہم خاک برابر شد[۲] ہمہ از تمتعِ دنیا بہرۂ وافی داشتند - ایں فقیر چوں بخت و طالع آنہا نداشت ناچار از آغازِ شباب بمقتضائے موزونیِ طبع مصروفِ تحصیلِ علم بود چنانچہ

(۱) بزرگانش اباعن جد نوکری۔ (ن خ) (۲) بہ خاک سیاہ برابر شدہ۔ (ن خ)

بہ فیضِ صحبتِ بزرگان اول از تکمیلِ نظم و نثرِ زبانِ فارسی و تحقیقِ محاورہ و اصطلاحِ آں فراغت حاصل کردہ بہ مقتضائے رواجِ زمانہ آخرکار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے اینکہ رواجِ شعرِ فارسی در ہندوستان بہ نسبتِ ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا بپایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ(۱) دوازدہ سال در شاہجہان آباد بہ دورِ نواب نجف خاں مرحوم بگوشۂ عزلت گزیدہ۔ زبان ریختہ اردوئے معلیٰ کماہی دریافت نمودہ و ہرگز برائے تلاشِ معاش در آں حشرِ اجبادِ امورات برِ در کس نہ رفتہ اگرچہ بہ نسبت فارسی گوئی در یارانِ مسلم الثبوت فارسی گو ہم شمردہ می شد اما نام برآوردہ بہ ریختہ است و آنچہ دریں مدت تصنیف و تالیف کردہ انیست کہ دو دیوانِ فارسیؔ یکے در جواب مولانا نظیری نیشاپوری و یکے بطورِ خود و سہ دیوان ہندی و دو تذکرۂ فارسی و ہندی و یک دو جزو شاہنامہ تا نسب نامۂ حضرت شاہ عالم بہادر و یک دیوان ہندی کہ در شاہجہاں آباد گفتہ معہ مسودۂ دیوانِ فارسیؔ اول کہ زبانِ آں بطورِ جلال اسیر و ناصر علی بود بہ دزدی رفتہ میخواست کہ کلام خود را آخرِ ہمہ صاحبان نویسد اما حرف میم بر آں آورد کہ بہ ردیف میم داخل باشد لہٰذا(۲) المؤلفہ۔

اشعار از دیوان اول

لگائے ہاتھ کوئی اُس بدن کو کیا گستاخ
نہ جس بدن کو لگی ہو کبھی ہوا گستاخ

میں چھیڑتا ہوں جو اُس کو کہے ہے کٹ کے رقیب
قدیم سے ہے تمھارا یہ آشنا گستاخ

سنا ہے مصحفیؔ ہیں جب سے شعر عرفی کا
ہمیشہ ہاتھ گریباں سے ہے مرا گستاخ

بہ ساعتے کہ کشائی قبا بیاد آور
کہ می کشاد کسے بند ایں قبا گستاخ

کرینگے خواب راحت یا یہی جنجال ہوویگا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہوویگا

---

(۱) رسیدہ بلکہ از و بہتر گردیدہ، چنداں مصروف فارسی نماندہ است۔ (ن خ)۔ (۲) نسخۂ ریمں بعد فارسی "زبان فصیح" کے الفاظ زائد ہیں (ن خ)، لہٰذا مزخرافات خود را نیز داخل ایں جریدہ کردہ شد تا بر صفحۂ روزگار یادگار ماند (ن خ)

یہ خیال اک دن اسی صورت فزوں ہو جائیگا — رفتہ رفتہ مجھکو سوجھے ہے جنوں ہو جائیگا
ان حنائی ہاتھوں کو پردے میں رکھ بہر خدا — مفت میں ظالم کسی کا ورنہ خوں ہو جائیگا
تابش خورشید میں تو گھر سے باہر مت نکل — پھول سا رخسارہ تیرا لالہ گوں ہو جائیگا
گو کہ اب پاتے نہیں ہم اُس کا کوچہ مصحفی — شوق اگر یہ ہے تو اک دن رہنموں ہو جائیگا

صورت کو تیری دیکھ کے مانی نے رو دیا — یہاں تک کہ خوں میں اپنا مرقع ڈبو دیا
ہرگز رہے نہ ہم تو کسی کام کے دریغ — سب کام سے ہمیں تری الفت نے کھو دیا

کل میں جو راہ میں اُسے پہچان رہ گیا — کچھ وہ بھی مجھکو دیکھ کے حیران رہ گیا
سمجھے وہ صیدِ خستہ مرے اضطراب کو — سینہ میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا
شوخی تو دیکھ تیر کو سینہ سے کھینچ کر — کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا
مارے خوشی کے کود پڑا میں تو مصحفی — شب پاس میرے اُس کا دوالیان رہ گیا

نظر آتے ہیں پردے تیری آنکھوں کے گلابی سے — کہیں سے پی ہے تو نے یا اُٹھا ہے نیم خوابی سے
ہوا میں ہے وہ کیفیت کہ نخل اس باغ کے سارے — گلے میں باہیں ڈالے ہیں کھڑے باہم شرابی سے
نزاکت کو نظر کیجو کہ کل اُس نے شب مہ میں — چھپایا چاند سے مکھڑے کو اپنی آفتابی سے
جو میرا دل نہیں جلتا تو پیارے میرے پہلو سے — اُٹھا لیتا ہے تو کیوں ہاتھ کو رکھ کر شتابی سے
مکانِ مصحفی اس کو نہ سمجھو آپ کا گھر ہے — تکلف کچھ نہیں کھل بیٹھے یہاں بے حجابی سے

قدغن ہے کہ در تک کوئی یہاں آنے نہ پاوے — اور بے خبر آوے بھی تو پھر جانے نہ پاوے
دہاں روزن دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں — تا سینہ کے روزن کوئی دکھلانے نہ پاوے

یوں صاحبِ بستاں کا ہو اب حکم کہ صیاد
اس باغ میں بلبل کا قفس لانے نہ پاوے

کیا خاک کرے سحر ترے نقشِ قدم کے
جو خاک بھی اُس کوچہ سے لیجانے نہ پاوے

تو آگے ہی جا بیٹھ ولا بزم میں اُس کی
تا آکے کوئی پھر اُسے سکھلانے نہ پاوے

تو شوق سے لچکا قد جوں شاخِ گل اپنا
پر موئے کمر دیکھیو بل کھانے نہ پاوے

کعبہ میں تو ہم کو نہ ملا مصحفی یارو
بھیجو کوئی قاصد اُسے بتخانے نہ پاوے

شب کہ دل درد و الم سے سر بسر لبریز تھا
شورِ محشر کی طرح ہر نالہ شور انگیز تھا

اِن اداؤں کا کوئی مارا جئے کس طرح ہائے
یا ہی اب یہ گرم جوشی یا کہ وہ پرہیز تھا

نو بہاراں میں تو کرتے ہم بھی دعوئے جنوں
مثلِ گل چاکِ گریباں ہم سے دست آویز تھا

کی ٹک اک آبِ دمِ شمشیر قاتل نے کمی
ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

دیوان دوم

ترا خدنگِ نگہ جس کے دل کے پار ہوا
نشانِ تیرِ تغافل وہ دل فگار ہوا

قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہم کو اے صیاد
چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ بہار ہوا

صبا جو پوچھے خبر مصحفی کی تجھ سے وہ شوخ
تو کہیو ہنس کے میں صدقے ترے نثار ہوا

مرضِ عشق سے گر اب کے سنبھل جاؤں گا
تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا

مجھکو قاصد کے تغافل نے تو مارا ہی ہو
روز ظالم یہی کہتا ہے کہ کل جاؤں گا

صانع نے جو خم ابروئے دلدار میں رکھا
سالح نے بھلا کون سی تلوار میں رکھا

قاصد نے دیا نامہ مرا اس کو تو اُس نے
کر چاک وہیں رخنۂ دیوار میں رکھا

اُس نے جس وقت کہ خال اپنے زنحداں پہ رکھا
داغ اک اور مرے سینۂ سوزاں پہ رکھا
آگیا یار کا دامن جو مرے ہاتھ کبھو
میں نے رومال سمجھ دیدۂ گریاں پہ رکھا

شب ترے کوچہ میں کوئی کہتے ہیں مرکر رہ گیا
تو نہ آیا اور وہ مسکین آہ بھر کر رہ گیا

پردا اٹھا کے اُس نے جو سینہ دکھا دیا
میں چاک کر کے اپنا گریبان اڑا دیا

قصد کرتا ہوں جو اُس در سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے تو جا میں تو نہیں جانے کا

ٹھکانا اک جگہ ہوتا نہیں اُس غم کے مارے کا
یہ گردش طالعوں کی پھیری ہے گویا ستارے کا
خدا جانے پڑی ہے آنکھ وہاں کس بے محابا کی
کئی دن سے جو روزن بند ہے اُسکے نظارے کا

داغ دیکھے تھا کھڑے لالۂ صحرائی کا
زور عالم نظر آیا تری سودائی کا
بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

کبھی اُس تازہ گل بن ہم جو رخت اپنا بدلتے ہیں
ملیں ہیں عطر کو لیکن کفِ افسوس ملتے ہیں
کوئی ان کافروں کے ہاتھ سے کیدھر نکل جاوے
نئی ترکیب ہے روز اور نئے نقشے نکلتے ہیں
جو خط بھیجوں تو خط کو آگ پر رکھدے ہے وہ ظالم
جو قاصد جائے تو قاصد کو اُن تیغ نکلتے ہیں
کچھ ان روزوں تو ہیں یہ تنگ دیکھا اُس کے کوچہ میں
کبوتر تکے ہوتے جاتے ہیں مکتوب جلتے ہیں
باتوں میں اب ہنس ہنس نت زہر گھولتے ہیں
ہم سے ہی بے حیا ہیں جو تم سے بولتے ہیں

کیا غم ہے گر سحر وہ گئی چشمِ تر لئے
شبنم نے گل کے ساتھ تو شب عیش کر لئے

گو کہ مخلِ ہمدمی چرخِ جفا طراز ہے
ہم کو تو اب تلک وہی بندگی و نیاز ہے
سمجھے تھے ہم کہ جائے گی جیسا گیا ہے روزِ وصل
کب یہیں اس کی تھی خبر ہجر کی شب دراز ہے
دامن اٹھا کے چلتے ہو مرے مزار سے عبث
خاک میں میں تو مل گیا کس سے اب احتراز ہے

ہم کو ترساتے ہو تم کیوں یہ ادا دکھلا کر
منہ چھپایا نہ کرو بہرِ خدا دکھلا کر
شرطِ یاری یہی ہوتی ہے کہ بس پھر گئے اب
چار دن مہر و محبت کا مزا دکھلا کر
حسن کہتا ہے اسے پردہ اٹھا دے پر شرم
یہ سکھاتی ہے کہ لے منہ کو چھپا دکھلا کر
دل کو ہاتھ اُس کے جو بیچوں ہوں تو کہتے ہیں رقیب
لیجیو تم اسے بازار ذرا دکھلا کر
پھر قیامت ہے جو وہ شوخ چھپالے منہ کو
اپنا دیدار یہیں روزِ جزا دکھلا کر
اُن کے ہاتھوں سے بھلا کیونکے کوئی بچ نکلے
لیویں جو دل کو بھلا رنگِ حنا دکھلا کر
لالہ سر کھینچے ہے خاکِ شہداء سے اب تک
تم چلے آئے تھے اک دن کفِ پا دکھلا کر
تیرے بیمار کو دے کر کے پشیمان ہوئے
لائے تھے وہ جو مسیحا سے دوا دکھلا کر
خواہ دیوانہ کہے خواہ وہ وحشی مجھ کو
مصحفی میں اُسے حال اپنا چلا دکھلا کر

از دیوان سویم

کیا دید میں عالم کی کروں جلوہ گری کا
یہاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا
مُردوں کو جلاتی ہے ترے پاؤں کی ٹھوکر
اس چال پہ مرتا ہے بجا کبکِ دری کا
جو دیکھے ہے نقشہ کو ترے وہ یہ کہے ہے
سارا بدن انسان کا چہرہ ہے پری کا

کھڑا نہ سن کے صدا میری ایک بار رہا
میں رہروانِ عدم کو بہت پکار رہا

قفس سے چھوڑے ہے اب مجھکو کیا تو اے صبا　　چمن کے بیچ کہاں موسمِ بہار رہا
خیالِ یار جو شب میرا ہمکنار رہا　　تمام شب میں اُسی کے گلے کا ہار رہا
ہیں تیرے ڈر سے نہ دیکھا اُدھر بہت شبِ وصل　　ستارۂ سحری مجھ کو آنکھ مار رہا

چھپ چھپ کے وہ گھر غیر کے مہمان گیا تھا　　چوری کی نظر میں وہیں پہچان گیا تھا
جانے کا نہ لے نام شبِ عید ہی پیارے　　سن بات مری میں ترے قربان گیا تھا

کب میں یاروں کے تئیں دیکھ پکارا نہ کیا　　پر کسو نے مری تربت پہ گذارا نہ کیا
بیٹھنا پاس تمھیں غیر کے کیا لازم تھا　　تم نے اتنا بھی میاں پاس ہمارا نہ کیا
میں ہوں وہ کشتۂ ناچیز گلی میں اُس کی　　جس کا خورشید نے روزن سے نظارا نہ کیا

بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا　　پانی میں نگارینِ کفِ پا اور بھی چمکا
جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینہ کی یہ بوندیں　　جوں لالہ تر حسن ترا اور بھی چمکا
دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے تیری　　کمبخت پہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

سو گیا تھا شام وہ رکھ کر جبیں پر پشتِ دست　　دیکھ اُسے خورشید نے ماری زمیں پر پشتِ دست
سانپ سی لہری کے زہ جو رات لہرانے لگے　　کیا جھجک کر اُس نے ماری آستیں پر پشتِ دست

بیٹھے ہی جو کوئی اُس بتِ پُرفن کے برابر　　اُس دوست کو ہم سمجھے ہیں دشمن کے برابر
انداز توسل کا سمجھا اسنے وہ کیسا　　رہ جائے ہے آ کر ترے دامن کے برابر
کیا جانیے اُس تیغ کو کیا سوجھی ہے اس دم　　پھر جائے ہے آ کے جو گردن کے برابر

جب اُس نے ہاتھ دھوئے خونِ عاشق سے ذرا مل کر — کیا اُس رنگِ اصلی کو غلط رنگِ حنا مل کر
کفک کا کس کی نقشا یاد آیا اس کو گلشن سے — چلی پاؤں تلے پھولوں کو کیوں بادِ صبا مل کر
کچھ ایسی ہو گئی حالت مری شب جس کو غش آیا — بدن سے آئے تھے یوں تو وہ[1] ٹپنہ بارہا مل کر

ہندی ہے کہ قہر ہے خدا کا — ہوتا ہے یہ رنگ کب حنا کا
ل آئے ہو ہاتھوں سے تم اپنے — یا خون کسی تازہ آشنا کا
خط لے کے مرا یہ کب گیا[2] ہیں — دل دیکھوں ہوں قاصدِ صبا کا
تلوار کو کھینچ ہنس پڑے واہ — ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

کاغذ کا ورق یہ پائے صورت — نقاش ایسی بنائے صورت
چہرہ پہ نظر نہیں ٹھہرتی — اللہ رے تری صفائے صورت

حرف النون

---

(۱) نثار

میر عبدالرسول نثار تخلص مردیست جہاندیدہ و فہمیدہ اصلش از اکبرآباد است فقیر اورا در ابتدائے شاعری در قصبۂ امروہہ دیدہ بود اکثر بعد ہفتہ و عشرہ ملاقات می شدد در تذکرۂ شعر بیان می آمد - از معاصرانِ میر و مرزا شاعر سحر کار و با فصاحت و بلاغت دیدمش ۔ عمرش تخمیناً قریبِ شصت خواہد بود حالا معلوم نیست کہ زندہ است یا مردہ ایں چند شعر از[3] دوست ۔

---

(۱) وہ (ن خ) (۲) گیا (ن خ) (۳) بیاد ماندہ از دوست (ن خ)

ماہ رو کی جو مہربانی ہے — یہ مدد ہم پہ آسمانی ہے
اُس کا رخسار دیکھ جیتا ہوں — عارضی میری زندگانی ہے

ایں شعر دوم در تذکرۂ میر حسن صاحب بنام محمد شاکر ناجی مسطور است و من از زبان او شنیدہ بودم، واللہ اعلم بالصواب۔

اُس کے تئیں ہماری نہ کچھ یاد ہی رہی — اور اپنے تئیں نہ طاقتِ فریاد ہی رہی
اُس بلبلِ اسیر کو کیا گل سے راہ و رسم — جو زیرِ دامِ منتِ صیاد ہی رہی
جوں گرد و باد ساکنِ یک جا نہ ہو سکی — اپنی یہ ہرزہ زندگی برباد ہی رہی
دنیا کو جائے عیش سن آئے تھے لے نثار — سو اپنے جیتے تک تو غم آباد ہی رہی

ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاوینگے ہم — یہ گریباں دامنِ صحرا کو دکھلاویں گے ہم

مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے — بھول تو گئے ہو ہمیں پر یہ تمھیں یاد رہے

(۲) نثار

محمد امان نثار تخلص قوم شیخ بزرگانش معمار بودہ اند بلکہ کسے کہ طرح جامعۂ دہلی انداختہ یکے از اجداد اوست۔ علم ریاضی را بہ خاندانِ ایشاں نسبتِ تمام است۔ مشارٌ الیہ پیش ازیں در دہلی بہ سرکارِ نواب محمد[۱] الدولہ بہ سرانجامِ عمارت عزو امتیاز داشت۔ بعد دستگیر شدنِ نواب موصوف بہ سرکارِ نواب ضابطہ خاں دخیل شدہ اکنوں کہ از چند سال بہ پورب رسیدہ بہ سرکارِ راجہ ٹکیت رائے بہ پیشہ خود عزتِ تمام دارد۔ چوں اصلش معمار است لہذا بنائے ریختہ ہم بخوبی نہادہ اداے زبانِ اردو چنانچہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود از

(۱) مجد الدولہ۔ (ن خ۔ ن نور محمد)

ابتدا در شعر شاگرد شاہ حاتم است۔ دیوانِ ضخیمے ترتیب دادہ قدرتِ پرگوئی بسیار دارد و اکثر در مشاعرہ ہائے دہلی ہم طرح یاران بود(۱)۔ ازوست۔

خنجر نہ کمر میں نہ وہ تلوار رکھے ہے / نظروں ہی میں چاہے ہے جسے مار رکھے ہے
دستارِ گلابی یہ نہیں طرۂ زرتار / خورشید شفق میں وہ نمودار رکھے ہے

خوبی میں ترے حسن کی کچھ حرف تو کب ہے / لیکن یہ ذرا خط ہے کہ اصلاح طلب ہے

اس رشک سے ہم کیونکہ نہ سر سنگ سے ماریں / آئینہ ترے حسن کی لوٹے ہے بہاریں

کیا جامۂ پھلکاری اس گل کی پھبن کا تھا / جو تختۂ دامن تھا تختہ وہ چمن کا تھا
ہم آگو ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھارو گے / جوں صبح گجر باجا تھا وہیں ٹھنکا تھا
مینا میں نہو جلوہ وہ بادۂ گلگوں کا / جامہ میں جو کچھ یارو رنگ اُسکے بدن کا تھا
نرگس کو کیا ایسا بیمار اُن آنکھوں نے / ڈھلکا ہی نظر آیا گردن کا جو منکا تھا

شیخی تو آفتاب کی ذرہ گھٹائیے / برقع اٹھا کے یار کا مکھڑا دکھائیے
دیکھا نہیں شگفتہ کبھی غنچہ دہن / پیارے خدا کے واسطے ٹک مسکرائیے

ہم سے ہو زر و سیم کی تدبیر سو کیا خاک / دنیا میں بڑی چیز ہے اکسیر سو کیا خاک
ہوجائے دل اک آن میں مٹی شنوا کا / ہم خاک نشینوں کی ہے تقریر سو کیا خاک

---

(۱) با فقیر از قدیم الایام آشنا است۔ ازوست ن خ)

(۱) منعم نہ کر اُس عمارت کی بزرگی — اک خاک سے تعمیری تعمیر سو کیا خاک
نامہ کو مرے پڑھ کے پٹک دے ہے زمیں پر — دیکھی رقمِ شوق کی تاثیر سو کیا خاک
گردا ہو تری شکل کا بیٹھے ہیں مرے گرد — اب اور میں کھینچوں تری تصویر سو کیا خاک
مجھ سوختہ کے تن میں نہیں بوند لہو کی — جا ٹے گا مری جان ترا تیر سو کیا خاک
جاتی ہے اُڑی گرد نثار اُس کی گلی کو — کی عشق نے اس شوخ کی تسخیر سو کیا خاک

تم تو اک دم ٹھیر کر مجلس میں گھر آتے رہے — گھر ہزاروں بیٹھ گئے لاکھوں کے جی جاتے رہے
میری اُس کی گرم صحبت ایک دم ہونے نہ دی — روز میرے شعلہ خو کو غیر بھڑکاتے رہے
خواہش دل تھی جو کچھ وہ بات بن آئی نہ یار — آہ کیا کیا منسوبے ہم دل میں ٹھیراتے رہے
آئینہ نے دی جو تم کو خط کے آنے سے خبر — اپنی زلفوں کی طرح کیا دل میں بل کھاتے رہے
بے تکلف ہو نہ بیٹھے سامنے آنکھیں نہ کیں — وصل کے دن بھی نثار اپنے سے شرماتے رہے

خط کے آنے سے نہ کچھ چل سکی تدبیر اپنی — بوسہ بازی کی لگی خال لبے جاگیر اپنی
کر دیا دل کو خدا نے جو بتاں کے بس میں — کیا دکھا دے گی ہمیں دیکھئے تقدیر اپنی
اپنے گھر میں نہیں یہ رخنۂ دیوار نثار — اپنی غفلت پر ہنسا کرتی ہے تعمیر اپنی

شب کو وہ کوٹھے ہی کو ٹھے گھر ہمارے آ رہا — غیر دروازہ پہ بیٹھا راہ ہی تکتا رہا

گردش کا اس نگاہ کی اب طور اور ہے — اے ساکنانِ میکدہ یہ دور اور ہے
صورت موافقت کی کوئی سوجھتی نہیں — صاحب کی وضع اور مرا طور اور ہے

---

(۱) ن خ میں شعر ناقص ہے اور مصرعۂ اول میں شاید لفظ "اپنی" چھوٹ گیا ہے مصرعۂ دوم میں "تعمیر ہے" ہوگا

بندہ ہوں جاں نثار ہوں میں اُس کا اے نثار　　آخر جو میں ہوں اور نہیں اور اور ہے

(۳) ناجی

کہ محمد شاکر(۱) دارد اصلش شاہجہاں آباد و مرد سپاہی پیشہ از شعرائے ایہام گوئے عہد محمد شاہی است معاصر میاں آبرو۔ دیوانِ او ہنوز در دہلی بر صفحۂ روزگار یادگار است و اشعارِ دلپذیر بطورِ خود بسیار آبدار - از وست۔

کفن ہی سبز ترے گیسوؤں کے ماروں کا　　مکان غم ہے ترے در کے بیقراروں کا

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بھلا　　چلی جاتی ہے فرمایش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

دیکھ کر رنگِ حنا تیرے کفِ خونریز پر　　آگ لگ لالہ کا دل غیرت سی بریاں ہو گیا

منکر نہ ہو کہ رات رہا نہیں رقیب پاس　　رہنے کی ہی دلیل یہ جامہ ہوا

موزوں قد اس کا چشم کے میزاں میں جب تلا　　طوبیٰ تب اُس سے یک قدِ آدم گھٹا ہوا

مجھکو باتوں میں لگا معلوم نہیں کیا کہہ گیا　　لے چلا جب دل کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

ڈوب گئے کئی ملک جب کھولی لب دریا پہ زلف　　حیف ناجی کو نہ پوچھا کس لہر میں رہ گیا

(۴) نظام

نواب عماد الملک نظام تخلص کہ پیشتر تخلص ایشاں آصف بود از ابتدائے عمر شائع

---

(۱) ناجی کہ محمد شاکر نام دارد۔ (ن خ)

پرستی و موزونیِ طبع اشتہار دارند۔ کمالاتِ بسیار در ذاتِ بابرکاتش جمع آمدہ ہمتش ہمیشہ متوجۂ مقاصدِ عمدہ می باشد چنداں مصروف و مالوف بہ ریختہ گوئی نیست مگر چیزے کہ در زمانِ سابق گفتہ شہرت یافتہ۔ احوالش در تذکرۂ فارسی نیز نوشتم۔ از وست۔

نا رونقِ گلشن ہیں نہ زینت کسو سر کے ۔۔۔ مثلِ گلِ بازی نہ ادھر کے نہ اودھر کے

دل تڑپے ہے اور دیدہ تکے راہ کسو کی ۔۔۔ یارب نہ کسو دل کو لگے چاہ کسو کی

آیا نہ کبھو خواب میں بھی وصل میسر ۔۔۔ کیا جانئے کس وقت مری آنکھ لگی تھی

پونچھیں نہ کبھو اشک یہ مغرور کسو کے ۔۔۔ پڑجاویں اگر چشم میں ناسور کسو کے
پھڑکاتی ہی کیا دخترِ رز شیشہ میں آنکھیں ۔۔۔ تجبہ نہ ہوئی پردہ میں مستور کسو کے

(۵) نعیم

کہ نعیم اللہ خاں نام داشت جوانے بود از شاگردانِ قدیم شاہ حاتم۔ دیوانِ ضخیم ترتیب دادہ پر گوئیش مشہور و کلامش از رطب و یابس معمور۔ فقیر او را در آنولہ دیدہ بود کہ بعد چندے در سرکارِ نواب محمد یار خاں نوکر شد چوں ملازمتِ نواب مؤلف ہم در آں نزدیکی کرد و قصیدۂ مدح بہ گوشِ حضارِ مجلس رسانیدہ داخلِ صحبت کیمیا خاصیت شد لہٰذا اکثر اتفاقِ ملاقات می افتاد۔ ہرگاہ بعد شکستِ ضابطہ خاں بر سکرتال از مرہٹہ ہا و حضرتِ ظلِ سبحانی سلسلۂ صحبتِ یاران گسیخت و تفرقۂ شدیدی در آبادی کیتھر[1] رو آورد ہم در آں ایام چوں اکثر بیمار می ماند بمرضِ استسقا در موضعِ عطر چھنڈی[2] رفتہ بود کہ در گذشت۔ از وست۔

---

(۱) کیتھر۔ (ن خ) (۲) عطر چھنڈی رجبنہ (ن خ)

آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر جو سنگِ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر

گر تجھے منظور تھا غیروں سے ہونا آشنا پھر عبث تو کیوں ہوا ظالم ہمارا آشنا
تیری خاطر کے لئے سنتا ہوں ملے بیگانہ وضع سب مرے دشمن ہیں کیا بیگانہ وکیا آشنا

کوچۂ یار سے دل ہم سے اُٹھایا نہ گیا مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا

شتابی عبث تو نے کی جانِ مضطر ابھی تو ہمیں آرزو تھی کسو کی

(۶) ندیم

مرزا علی قلی ندیم اصلش شاہجہان آباد است در مرثیہ وسلام توغل بسیار کردہ چنانچہ کلامش ازیں قسم شہرت[۱] دارد۔ آخر آخر سخافتِ کلامِ دیگر مرثیہ گویان دیدہ وطرز ایشاں را مطلقاً نہ پسندیدہ عنانِ رخشِ ہمتِ خود را بہ طرفِ ریختہ گوئی معطوف ساختہ کو کہ فغان کہ ذکرش گزشت اقرار بہ شاگردی او دارد۔ ازیں جہت است کہ بعض مرثیۂ مشارٌ الیہ ہم بسیار دلچسپ بہ سمع رسیدہ۔ بالفعل یک شورش کہ در برجستگی[۲] مضمون نظیر ندارد بہم رسیدہ اینست[۳]۔

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے[۴] ہیں بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

(۷) نالاں

میاں عسکری نالاں تخلص، قوم مغل اول کسے کہ در شاہجہاں آباد بہ حلقۂ شاگردی نفیر در آمد اینست۔ میر حسن صاحب او را در تذکرۂ خود شاگرد شاہ حاتم نوشتہ اند محض غلط اکثر

---

(۱) شہرت تمام دارد۔ (ن خ) (۲) برشتگی۔ (ن خ) (۳) ازوست (ن خ) (۴) جلتے ہیں (ن خ)

شریک مشاعرہائے دہلی بودہ بافقیر اعتقاد و نیازمندی کلی داشت. از مدتِ بسیار مفقود الاحوال است - ازوست -

کانوں پہ جب رکھتا ہے گل اک اس طرف اک اُس طرف　　شمس و قمر رہتے ہیں تل اک اس طرف اک اس طرف

(۸) نصیر

میاں نصیر نصیر تخلص پیرزادہ از اولادِ میر حیدر جہان صاحب جوانِ خوشگو است فقیر دریافت کہ در شاہجہاں آباد بود اکثر در مشاعرہ می آمد- در ہماں عالم نومشقی در طبعش رسائی و تیزی دریافت میشود حالا گویند کہ قوتِ شاعری بسیار پیدا کردہ شعرے ازو بسمع رسیدہ این ست[۱] -

چرائی چادرِ مہتاب شب مَیکش نے جیبوں پر　　کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

خوف زلفِ یار چھٹ ماناہے کس کا رات نے　(۲)　کہکشاں سے لے لیا دانتوں میں تنکا رات نے

تیرے آنے کی خبر جو گلِ شاداب اُڑی　(۳)　بیضۂ غنچہ سے اک بلبلِ بیتاب اُڑی

شبد بزِناز پر چڑھا وہ کتا ربند　(۴)　تارِ نظر سے ہم نے لگائی شکار بند

رباعی

کوئی نہیں کہتا یہ نئے قلبیاں کو　(۵)　فریاد و فغاں میں دیکھ سرگرم نہ ہو
دم عشق کا کیا بھرے ہے اے سوختہ جاں　(۶)　آتی ہے ابھی منہ سے ترے دود کی بو

---

(۱) نسخہ ر میں "دو شعرے ازو بہم رسیدہ" لکھا ہے اور ایک شعر جو اوپر درج ہے اسکے علاوہ یہ شعر زائد ہے۔
پشتِ لب پہ ترے یہ خطِ ریحاں ایسا　　منہ تو دیکھو لکھے یاقوت رقم خاں ایسا
(۲) ن خ میں یہ ۲ تا ۶ اشعار نصیر کے اور ہیں۔

(۹) نجف

کہ از(۱) نام ونشانش خبر نہ دارم دو سہ غزلش بربیاضے نوشتہ دیدم چوں رہ بدرستی داشت نقل گرفتہ شدہ انیست۔

کس طرح ربط نہ ہو زلف سے دیوانوں کو
اُنس ہوتا ہی پریشاں سے پریشانوں کو

مجھکو بتلاوے صبا باغ میں تو نے آکر
کس لئے ٹکڑے کیا گل کے گریبانوں کو

پھاڑ کر اپنا گریباں یہ نجف ہی جی میں
چلئے اب یہاں سے نکل دیکھئے ویرانوں کو

بے وفائی پہ یار ہے سو ہے
یہ دل بے قرار ہے سو ہے

ابر موسم ہی پر برستا ہی
دیدۂ اشکبار ہے سو ہے

سوزشِ عشق کیا بتاؤں نجفؔ
سینۂ داغدار ہے سو ہے

دل کو کہتا ہوں شاید اب سمجھے
پر یہ خانہ خراب کب سمجھے

اُس کے کوچہ میں و مبدم جانا
روز سمجھے ہے دل نہ شب سمجھے

دردِ دل اور میری بے تابی
جب وہ چاہی کسی کو تب سمجھے

آہ کس ڈھب سے اُس سی کیجے بات
بات سیدھی بھی جو کہ ڈھب سمجھے

ہجر کے غم سے مرگئے لاکھوں
ہم بھی تھی تجھکو جاں بلب سمجھے

شکر صد شکر بچ گیا تو نجفؔ
تیرا جینا ہی ہم عجب سمجھے

(۱۰) نوا

شیخ ظہور نوا تخلص ساکنِ بداؤں پسرِ مولوی دلیل اللہ جوانِ خوش فکر و سنجیدہ وضع

(۱) کہ ہیچ از نام (ن خ)

شاگردِ میاں بقا ء اللہ می گوید کہ از حضورِ مرزا جہاندار شاہ جوان بخت مرحوم بخطاب خوش فکر فائی عز و امتیاز یافتہ[1]۔ فکر شعر در زبان ہندی و فارسی ہر دو میکند اما قصیدہ را بسیار بہ متانت و پختگی بہ سر انجام می رساند معہٰذا طرز نظم قصیدہ اش بہ سبب اندراج لغات عربی و فارسی از ابنائے زبان جدا است و بسیار فراست[2] دارد و الحق کہ دریں کار ہر کہ باو درافتادہ شکست فاحشہ خوردہ۔ بہ سبب دوستی کہ میانِ من و میاں بقاء اللہ[3] بہ پایہ برادریست فقیر را عمومی گوید از دست۔

اب اشک تو کہاں ہے جو چاہوں ٹپک پڑے ۔۔۔ آنکھوں سے وقتِ گریہ مگر خوں ٹپک پڑے
یہاں تک ہے جوشِ اشک کہ آنکھوں سے تجھ بغیر ۔۔۔ یک قطرہ آب چاہوں تو جیحوں ٹپک پڑے

ہمارا نامہ لے کر وے ہے وہ دشنام قاصد کو ۔۔۔ چھٹا اس کے کچھ نہیں ملتا وہاں انعام قاصد کو
خط آنا یک طرف اب چاہئے پیغام زبانی ۔۔۔ کہ جا کر دے مری جانب سے وہ پیغام قاصد کو
اسے تو خط کو یہاں آیا تھا یا صورت پرستی کو ۔۔۔ چل اپنے کام لگ اس کام سے کیا کام قاصد کو
نوا قاصد کو اپنے پر وہ مفتوں آپ کرتے ہیں ۔۔۔ وہ آپ ہی خوب ہیں کیا دیجئے الزام قاصد کو

(۱۱) نادر

لالہ گنگا سنگھ نادر شاگردِ میر حسن، جوانِ خوش خلق است ہمیں مطلعش شہرت یافتہ۔

قاصد تو اس فریب سے تو اس پاس جائیو ۔۔۔ کس کا یہ خط ہے اس کو مجھے پڑھ سنائیو

---

(۱) یافتہ ام اگرچہ در خوش فکریش شک نیست، اما فقیر ازیں مقدمہ کما ینبغی اگاہی ندارد (ن خ۔ ن مجمع)
(۲) فرق دارد۔ (ن خ) (۳) از قدیم الایام بہ پایہ (ن خ)

حرف الواو

(۱) واقف

شاہ(۱) واقف واقف تخلص درویشے بود شعر خوب می گفت۔ از دست۔

ان رقیبوں سے گئی گزرے ہیں کیا اے یار ہم — وہ شریکِ بزم ہوویں اور نپاویں بار ہم
در تلک نکلا نہ ہوگا واسطے واقف کے تو — پھر گئے ہوں گے ترے کوچہ میں سو سو بار ہم

خیالِ وعدہ سے ازبسکہ تو نظر میں رہا — تمام رات مراجی صدائے در میں رہا

روزِ خزاں چمن میں جو دیکھا ہزار کے — اک مشت پر پڑے تھے تلے شاخسار کے
یارانِ ہمنشیں و رفیقانِ دوست دار — سب آشنا ہیں زندگی مستعار کے
جب مند گئی یہ آنکھ تو لے دوست بعدِ مرگ — پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے
جو نقشِ پا رہے سو رہے پھر نہ اُٹھ سکے — واقف کی طرح ہائے(۲) گرے کوئے یار کے

صبح پر وصلِ یار کی ٹھیری — آہ پھر انتظار کی ٹھیری
کیا طرح اس گلی میں کہہ تو صبا — میرے مشتِ غبار کی ٹھیری

جب کر پردیس یار نکلے ہے — آہ بے اختیار نکلے ہے

---

(۱) شاہ واقف تخلص گویند درویشے بود در فیض آباد بگفتن منقبت ہا شہرت دارد و گاہ گاہے خیال شعر ہم میکرد چند غزلش از نظر فقیر گذشتہ۔ شعر خوب ہم می برآید دیگر از احوالش خوب واقف نیستم۔ از دست (ن نور محمد مطابق ن خ) (۲) ہار گری (ن خ) غالباً ہار گرے

یہ خدا جانے کیا تھا کل لے دل — وہ کوئی بار بار نکلے ہے

عشق میں کیا فضل و ہنر چاہئے — آہ میں تھوڑا سا اثر چاہئے
آٹھ پہر جس پہ ستم کی ہو مشق — ٹک تو کرم کی بھی نظر چاہئے

لی دائے ہمرہوں نے رہ اپنی جہاں کی — ہم رہ گئے بھٹکتے جوں گرد کارواں کی

گیا ہو واقف تفتیدہ دل مگر تہِ خاک — کہ لالہ خاک سے اب داغ داغ اُگتا ہو

واقف شراب معلوم اس دورِ آخری میں — ناچار کیا کریں ہم افیون گھولتے ہیں

وحشت (۲)

شاگردِ جعفر علی حسرت ۔ نقیر اورا ندیدہ ۔ از وست ۔

آہ آگے تو نکلتی تھی جگر سے باہر — اب جگر نکلے ہے خود دیدۂ تر سے باہر
کیوں کے تم گھر سے نہ نکلو گے میاں دیکھینگے — ہم نکالیں گے تمھیں لاکھ ہنر سے باہر
آہ کس طرح سے دیدار میسر ہووے — پاؤں رکھتا ہی نہیں وہ کبھی در سے باہر

نکل گھر سے ذرا اے یار مجھ بیمار کی خاطر — کھڑا ہوں منتظر کب سی ترے دیدار کی خاطر

جو کچھ ہم پر ستم کیجے بجا ہے — کہ ہم نے تم کو اپنا دل دیا ہو

---

(۳) وِلا

مظہر علی خاں وِلا تخلص عرف مرزا لطف[۱] علی خلف سلیمان علیخاں ورداد جوانِ حلیم و سلیم بمقتضائے موزونیٔ طبع گاہ گاہے خیالِ شعرِ ہندی میکند و بنام پدر بزرگوارِ خود ہر جا فروختہ می شود۔ استفادۂ شعرش چندے بمرزا جان طپش و چندے بمولف بود حالا بہ میر نظام الدین ممنون کلامِ خود را می نماید۔ از کلام اوست۔

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سُنے
ہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پر

نہ حاجت کے لئے دستِ دعا کو منہ پہ لاتا ہوں
میں اپنی زندگی سے سچ تو یہ ہاتھ اٹھاتا ہوں

ایک جیحوں ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے
کیا بلا تھی یہ مرے دیدۂ گریان کے بیچ

یونہیں گر کرتے رہے ہم اشک سے تر آستیں
آپ بھی رو دینگے اک دن منہ پہ دھر کر آستیں

قتل سے میرے نہ منکر ہو کہ ظالم اب تلک
بھر رہی ہے خون سے تیری سراسر آستیں

عشق کے آثار سب تجھ میں ہویدا ہیں وِلاؔ
رنگِ زرد و آہِ سرد و اشک سے تر آستیں

ہرگز نہ گریں اس سے اشکِ اثر آلودہ
ہووے نہ کبھی خون سے جو چشم تر آلودہ

از بسکہ کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے کرتے ہیں
آنکھوں سے میرے آنسو لختِ جگر آلودہ

دہاں رشکِ چمن اس نے گھر اپنا کیا ہے یہاں
اشکِ جگری سے ہے دیوار و در آلودہ

اک پل ہیں گزر جاوے یہ چرخ بریں سے بھی
ہوتی ہے بڑی ظالم آہِ اثر آلودہ

---

(۱) ن خ، لطیف علی۔ دن نور محمد، لطف علی۔

بخش اپنے ولا کو بھی از راہِ کرم یارب　　ہر چند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

دل کیونکے نہ ہو اُس بتِ طرار کے صدقے　　ہوتے ہیں سبھی وضعِ طرحدار کے صدقے
گہ چشم و گہ ابرو کے گہے جبینِ جبیں کے　　گہ خال کے ہوں گاہ میں رخسار کے صدقے
اک بوسہ تو لینے دے مجھے اپنے لبوں سے　　انکار نہ کر میں ترے انکار کے صدقے
اس اشک کے قطرے کو اثر دے مرے یارب　　تا ہووے ولا چشمِ گہربار کے صدقے

(۴) وہم

میر محمد علی وہم تخلص نبیرۂ میر محمد تقی خیال جوانِ موزون الطبع بتقربِ نواب وزیر آصف[1] الدولہ بہادر اعتبارِ تمام دارد۔

گو فکر تیری دل کے تئیں سو لگی رہے　　پر وہم شرط یہ ہے کہ وہ لو لگی رہے
ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہے　　پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

حرف الہاء

(۱) ہادی

میر محمد جواد ہادی تخلص سید صحیح النسب در ابتدا بہ رفاقتِ نواب عماد الملک عزو امتیاز داشت۔ وبہ سببِ موزونیٔ طبع یکدگر صحبتِ طرفین از مدت دراز ترکِ روزگار کردہ بتوکل می گذرانید۔ تا بندہ در شاہجہان آباد بود اکثر بر مکانِ فقیر تشریف می آورد۔ از دوست۔

---

(۱) ن خ میں آصف الدولہ بہادر نہیں ہے۔

رہ رہ کے سخن کہنا ہر بار بہت تحفہ — ہیں لب تو میاں لب ہی گفتار بہت تحفہ
ہر پانو کی ٹھوکر میں سو دل پڑے تڑپے ہیں — کھان دنوں سیکھے ہو رفتار بہت تحفہ
خورشید کا یوں چہرہ زر تار تو ہے لیکن — ہے سر پہ ترے سادی دستار بہت تحفہ
مژگاں سے بچے گر دل ابرو کریں سو ٹکڑے — تو غرض ہے(۱) یہ تلوار بہت تحفہ
اک بوسہ پہ دل ٹھیرا اس پر وہ نہیں لیتا — اک سہل سی قیمت پر تکرار بہت تحفہ
ہم مر چکے پر اُس نے دل کی نہ خبر پوچھی — ہم کو بھی ملا ہے یہاں دلدار بہت تحفہ
دیکھے کوئی اے ہادی اس شیخ کے جبہ کو — یہ خر تو عجب ہے پر خر بار بہت تحفہ

میں کہا غیر کے مت جا تو کہا تجھکو کیا — کر نہ تو آپ کو رسوا تو کہا تجھ کو کیا
رو برو میرے دئے غیر کو اُس نے بوسے — میں جو پوچھا کہ یہ کیا تو کہا تجھ کو کیا
سر کو ملتا ہی ترے پاؤں پہ رکھ رکھ ہادی — میں کہا کچھ اسے فرما تو کہا تجھ کو کیا

طور(۲) دیں اُس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہو گیا — جس مسلماں نے اُسے دیکھا سو کافر ہو گیا
اے دل اب دیتا نہیں وہ داد یہ کیا ہو گیا — آج کچھ سنتا نہیں فریاد یہ کیا ہو گیا
لگ گیا دل اس کا جب تصویر تیری کھینچ کر — رکھ قلم کہنے لگا بہزاد یہ کیا ہو گیا
جان نکلی جائے خون ہادی کی جب نکلا نہ فصد — دیکھ کر کہنے لگا فصاد یہ کیا ہو گیا

سیکھ لے ہم سے کوئی سر سے گذر جانے کی طرح — آگ میں ہم آپ کو جھونکیں ہیں پروانے کی طرح

نہ جانے یار نت کرتے ہیں گلگشت چمن کیونکر — سلامت یہاں سے لیجاتے ہیں اپنا پیرہن کیونکر

(۱) ہے ہی ن خ۔ (۲) یہ شعر بادنیٰ تغیر اس نسخے میں یقین کے نام بھی درج ہے۔ ن خ میں ہادی کے نام ہے لیکن یقین کے نام نہیں۔

رات اس مرتبہ اڈی تھی تری یاد کہ بس
ایسے ہنگاموں سے کرتے رہی فریاد کہ بس

مت پوچھ فریبندہ تری زلف ہی یا خط
اک آفتِ نو زلف ہی اک تازہ بلا خط

تجھ بن آنکھوں میں خواب معلوم
اس دل کو جو چاہو تاب معلوم
قاصد آتا ہے وہاں سے گریاں
نامہ کا ہوا جواب معلوم
جز اس کے کہ خوار ہو کے مر جائے
کوئی تجھ سے ہو کامیاب معلوم

نہ وفا چھوڑی ہیں نا تونے کی شفقت ظالم
آفریں باد مجھے اور تجھے رحمت ظالم
سخت آیا ہوں بجان دیکھیں مرجاؤں گا
رحم کر مجھ کو نہ دے اتنی اذیت ظالم
اور معشوقوں کی بے مہری کو تو دو دکھے ہے
بارے کچھ تجھ میں بھی ہی مہر و محبت ظالم
مرتے میں مر گیا پر رحم نہ آیا تجھ کو
رہ گئی دل میں مرے آہ یہ حسرت ظالم
وقت مرنے کے یہ ہادیؔ نے کہا اُس سے کہ ہائے
گو میں دنیا سے گیا رہ تو سلامت ظالم

غافل ہیں اس سے یار جتا دے انھوں کے تئیں
ہادی تو راہ عشق بتا دے انھوں کے تئیں
یہ بختِ خفتہ جنبشِ پا چاہتے ہیں یار
بہتر تو ہے تو آ کے جگا دے انھوں کے تئیں

ماہ کہاں کہاں وہ رو غنچہ کہاں وہاں کہاں
مشک کہاں کہاں وہ زلف سنبل گلستاں کہاں
دشت میں اور کوہ میں صومعہ او رکنشت میں
تجھکو میں ڈھونڈھتا پھرا جان مری کہاں کہاں

تو اُن لوگوں سے ملتا ہی کہ جن سی مجھکو عار آوے
مری اور تیری پیارے کس طرح صحبت برار آوے

جنوں کے ہاتھ سے بے طرح تو وحشت میں ہے ہاتھی
خدا جانے جئے گا یا نہیں جبتک بہار آوے

ہاتھ میرا جھٹک گئے سو گئے
یک بیک تم شٹک گئے سو گئے

نہ دیا اُس کو یا دیا قاصد
خط مرا تو نے کیا کیا قاصد

(۲) ہاشمی

میر ہاشمی ہاشمی تخلص شاگرد مرزا رفیع۔ عمرش از شصت متجاوز خواہد بود فقیر او را در لکھنؤ دیدہ۔ از وست۔

مرا سو بار اُس تک نامہ پر آزردہ پہنچا
پہ اودھر سے جواب صاف پہنچا جب کبھو پہنچا

کیا افشا تمھیں نے راز عشق اے دیدۂ گریاں
بگوش خلق ورنہ کس طرح یہ گفتگو پہنچا

دماغ آشفتہ ہوتا ہے صبا نکہت[1] سے سنبل کی
مشام آرزو میں تو کسی کا کل کی بو پہنچا

ابھی چھوٹا ہے موج رشک کی زنجیر سے قمری
نہ پھر گوش دل دیوانہ تک آوازہ ہو پہنچا

یہ دعوے سب کے باطل محکمہ میں ہاشمی ہونگے
اگر حاکم تلک وہ شوخ باروئے نکو پہنچا

آہ و نالہ کے دو مصرع جو کئے ہیں موزوں
صاحب درد اُسے شعر فغانی سمجھا

وہ برہمن بچہ افسوس کہ اے ہمنفساں
قصۂ درد مرا رام کہانی سمجھا

(۳) ہاتف

مرزا محمد ہاتف ہاتف تخلص درایامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد بود اکثر در مشاعرہ بسیر

(۱) سنبل کی نکہت سے۔ (ن خ)

راجہ رام ناتھ کہ محرکِ بنائے آں میاں ثناء اللہ خاں فراق بودند می آمد اکنوں شنیدہ شد کہ ہمانجا باجلِ طبعی درگذشت۔ شعرے از و بخاطر است۔

خط آئے پہ یہ حسن نہ یہ مان رہیگا ۔۔۔ ایسے میں اگر ملئے تو احسان رہیگا

(۴) ہدایت

ہدایت خاں ہدایت تخلص مشاقِ قدیم و معاصرِ[1] میر و مرزا شاگرد بلکہ مریدِ خواجہ میر درد نور اللہ مضجعہٗ شخصے است بسیار حلیم و سلیم۔ شعر را بسیار بفصاحت می گوید۔ عمرش از شصت متجاوز خواہد بود۔ صاحبِ دیوان است۔ انتخاب کلام اوست۔

تجھ بن تو چاہتا نہیں جی سیرِ باغ کو ۔۔۔ لگتی ہے ٹھیس نکہتِ گل سے دماغ کو

معشوق بے وفا و ستم گار ہے بھلا ۔۔۔ جی جس کو چاہے وہ تو دل آزار ہی بھلا

دیکھا نہ دور سے بھی ہیں روئے چمن کبھو ۔۔۔ آنکھوں سے میری رخنۂ دیوار ہی بھلا

آتش سے داغِ دل کے سراپا تو جل گیا ۔۔۔ گلزار پھولی کیا کہ بدن سارا چھل گیا

تکلیفِ سیرِ باغ کرے گی کسے نسیم ۔۔۔ آمد ہی میں بہار کی یہاں جی نکل گیا

نے جم رہا جہان میں نے جام رہ گیا ۔۔۔ مردوں کا ایک جگ میں مگر نام رہ گیا

کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک ۔۔۔ پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

جب کچھ بھی بس چلا نہ تو صیاد مرغِ دل ۔۔۔ آخر تڑپ تڑپ کے تہ دام رہ گیا

آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بو نسیم ۔۔۔ رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا

---

(۱) مشاقِ قدیم و معاصر و ہم طرح محمد قایم شریک دہ رو درہ میر و مرزا۔ (ن خ مطابق ن نور محمد)

برنگِ گل زمانہ جس کے ہو باعث ہنسانے کا   کرے پھر فکر پہلے خاک میں اُس کے ملانے کا
ہدایت کیسے کیسے گل رخاں یہاں خاک میں مل گئے   نہ دیکھا جان میری رنگ تو نے کچھ زمانے کا

ٹھیر چکی تھی جی پہ یہ جاؤں نہ کوئے یار میں   آہ پر اس کو کیا کروں دل نہیں اختیار میں
گرچہ ہدایت ایک جا ٹھیرے ہے کوئی بے نوا   کیجے پر اب تو بسترا کوئی دن اس دیار میں

نامہ کا میرے لے کر اس سے جواب پھریو   پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھریو
اب اور تو میں تجھکو اے عشق کیا کہوں پر   میری طرح سے تو بھی خانہ خراب پھریو

کیا کہوں میں کہ ترے ہجر میں کیونکر گذری   وہ ہی جانے ہے مری جان کہ جس پر گذری
کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر   یاد میں زلف و رخِ یار کی کیونکر گذری
دن جو گذرا تو مجھے روزِ قیامت سے دراز   رات گذری تو شبِ ہجر سے بدتر گذری

بے آب و دانہ مرتے ہیں ان کا ثواب لے   ظالم خبر اسیروں کی اپنے شتاب لے

مرتا ہے اُس کی چشمِ سیہ فام کے لئے   دل ہے مرا دو نیم دو بادام کے لئے

اک دم بھی آپ سے تو نہ تجھ کو جدا کروں   قسمت ہی گر بُری ہو تو میں اس کو کیا کروں

کیا ہی دکھلاتی ہیں گلشن میں گلوں کی ڈالیاں   گہری گہری سبزیاں اور جھمجھاتی(۱) لالیاں

(۱) چہچہاتی دن خ،

صبح محشر ہو چکی پر بے خودی ہر اب تلک ‏ ‏ کس کی دیکھی ہیں ہیں یا رب انکھڑیاں متوالیاں

پہنچے ہے فصلِ گل کوئی حسنِ نگار کو ‏ ‏ مکھڑے پہ اُس کے صدقہ کیا نو بہار کو
کس دل جلے کی خاک لے گذری چمن میں آج ‏ ‏ دیکھا عرق فشاں ہیں نسیمِ بہار کو
لازم ہے دستگیریٔ افتادگاں نسیم ‏ ‏ (۱)لے پہنچ اُس گلی کے تئیں میری غبار کو
نالے نے میرے اور تو اب چاہتا ہے کیا ‏ ‏ پانی تو کر دیا ہے دلِ کوہسار کو
اللہ رے کارخانۂ تقدیرِ ذوالجلال ‏ ‏ یہ اعتبار ہستیِ بے اعتبار کو

بھیو بے ہودہ مت اشکِ گریۂ شب کو ‏ ‏ کہ عاقبت ہے اثر کچھ نہ کچھ کواکب کو

کہتے ہیں قیامت بھی ہوئی ہم تو ہدایت ‏ ‏ افسوس کہ محروم ہیں دیدار سے اب تک

بیان کروں لبِ شیریں کی کیا حلاوت کا ‏ ‏ کہ وقتِ بوسہ ہر اک دم ہی گھونٹ شربت کا

انجامِ کارِ دل کا ہدایت میں کیا کہوں ‏ ‏ آنسو کی بوند ساتھ لہو کے ٹپک گئی(۲)

ہدایت اپنا وطن کس کو خوش نہیں آتا ‏ ‏ پر آہ کیا کرے اب کوئی مرضیِ رب کو
ہزار حیف کہ دلی سا شہر ویران کر ‏ ‏ کیا ہے یاروں نے آباد ملک پورب کو

غیر پر جور و جفا کیجیے گا ‏ ‏ یا دنت میری وفا کیجیے گا

---

(۱) "لے پہنچ اس گلی تئیں میرے" ن خ (۲) پڑی - (ن نور محمد)

چلتے ہیں ہم بھی ترے ساتھ نسیم — رہ کے اس باغ میں کیا کیجئے گا

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا — نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا
کیا تیغ قاتل نے جب کام اپنا — میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا
عبث ہے غرض ان بتاں سے بھی ملنا — نہیں آج دنیا میں کوئی کسی کا
کیا حسن سے اس نے آگاہ اس کو — الٰہی ہو خانہ خراب آرسی کا
ہدایت کہا ریختہ جب کہ ہم نے — رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

مر جائے جو کوئی کھائے افسوس — احوال مرا ہے جائے افسوس
ہم مر گئے پر ہدایت اس نے — اتنا نہ کہا کہ ہائے افسوس

گاہ جیتے ہیں گاہ مرتے ہیں — ہم بھی دنیا میں زیست کرتے ہیں

(۵) ہوش

تخلص جوانِ شیریں زبان است بہ شاگردیِ میر سوز نازشی دارد۔ ازوست۔

یار ہنستا ہے چشمِ تر کو دیکھ — گریہ ٹک اپنے تو اثر کو دیکھ
دست دپا گم کرے ہیں مو کر آہ — نازنین تیری اس کمر کو دیکھ
تیرے خط کا جواب آیا ہے — ہوش کھول آنکھ نامہ بر کو دیکھ

حرف الیاء

(۱) یقین

میاں انعام اللہ خاں یقین پسرِ اظہر الدین خاں بودہ نبیرۂ حمید الدین خاں نیمچہ جوانے بود مرزا مزاج و شیریں زبان از حسن وجاہت بہرۂ وافی داشت گویند مرزا جان جاں او را بسیار دوست داشتے و اکثر بخانہ اش شب را روز و روز را شب کردے۔ دیوانش از نظرِ مرزا بخوبی گزشتہ(۱) بلکہ بقولِ بعضے ہمہ کلامش گفتۂ مرزا است(۲) در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ، ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ چنانچہ خود می گوید

حق کو یقیں کے یا رو برباد مت دو آخر	طرزِ سخن کے اُس کی تم نے اڑائیاں ہیں

عمرش زیادہ بر بست و پنج نخواہد بود کہ پدرش او را کشتہ در دیگ مدفون ساختہ۔

ایں سر را کسیکہ می داند میداند، خدائش بیامرزاد۔ از دیوانِ اوست۔

ٹک اک انصاف کرتا تھی کرتا ہے جفا کوئی	کرے گا بعد میرے کس توقع پر وفا کوئی

عجب سچ سے کیا ہے قتل مجھ کو اس کو مت ٹوکو	طلب کرتا ہے ایسے قاتلوں سے خونبہا کوئی

گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا اس کی	محبت میں یقیں لیتا ہے نام مدعا کوئی

بت کرے سجدہ ترے حسنِ خداداد کو دیکھ	سرو بندہ ہو ترے قامتِ آزاد کو دیکھ

اُن گنہگاروں میں ہوں میں کہ مرے کے مارے	جی سکتا ہے مراد ورسے جلاد کو دیکھ

عشق کے جور و جفا میں تجھے گر شک ہے یقیں	عیشِ پرویز کو اور محنتِ فرہاد کو دیکھ

---

(۱) گذشت۔ (ن خ) (۲) شاید کہ چنیں باشد خالی از نفاست نیست (ن نور محمد مطابق ن خ)

خارِ مژگاں کے کہ جی ڈرتا ہی میرا بے طرح — رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کفِ پا بے طرح
فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھیے کیا ہو یقیںؔ — اب کے چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح

نہیں معلوم اب کے سال میخانہ پہ کیا گذرا — ہمارے توبہ کے کرنے سے پیمانہ پہ کیا گذرا
برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے — خدا جانے تری صورت سی بتخانہ پہ کیا گذرا
یقیںؔ کب یار تیرے سوزِ دل کی داد کو پہنچے — کہاں ہی شمع کو پروا کہ پروانہ پہ کیا گذرا

سرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا — ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں — کہ گل ہاتھوں میں اور پاؤں میں سر خار بہتر تھا
مجھے پھر دکھ دیا تو نے منڈا کر سبزۂ خط کو — جراحت کو مرے یہ مرہمِ زنگار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا — یقیںؔ پرہیز اگر کرتا تو وہ بیمار بہتر تھا

کارِ دیں اُس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہو گیا — جس مسلماں نے اُسے دیکھا سو کافر ہو گیا
کیا بدن ہو گا کہ جس کا کھولتے جامہ کا بند — بوئے گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا
آنکھ سے نکلے پہ آنسو کا خدا حافظ یقیںؔ — گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

باغباں بے رحم اور در بند دیواریں بلند — بلبلِ بے بال و پر گلشن میں جاوے کس طرح
اختیاری ہی مگر یہ کام ناصح تو ہی کہہ — عشق سے کوئی یقیںؔ کو باز لاوے کس طرح

عمر آخر ہے جنوں کر لو بہاراں پھر کہاں — ہاتھ مت پکڑو مرا یارو گریباں پھر کہاں
ہی بہشتوں میں یقیںؔ سب کچھ ولیکن درد نہیں — بھر کے دل رو دیجیے یہ چشمِ گریاں پھر کہاں

اُس سیمتن پوش سے آغوش رنگیں کیجئے — جی میں ہے اس مصرعۂ موزوں کو تضمیں کیجئے
عشق میں راحت نہیں ملتی مگر جوں کوہکن — جانِ شیریں دیجئے تب خوابِ شیریں کیجئے

چھٹے اس زندگی کی قید سے اب داد کو پہنچے — وصیت ہے ہمارا خونبہا جلاد کو پہنچے
نہ نکلا صبر سے کچھ کام اب فریاد کرتا ہوں — مری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہنچے

وفا کا کیا قیامت ہے جو کوئی بدلا جفا دیوے — ترحم ان بتاں کو اپنے بندوں پر خدا دیوے
محبت کا جو بانا(۱) ہے عجب آداب ہیں اُس کے — کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں عاشق دعا دیوے
نہ تھی پرواز قسمت میں مرے صیاد پر اتنا — صبا سے کہیو میری خاک گلشن میں اُڑا دیوے
خفا ہو زندگی سے مر گیا ہوں بسکہ ڈرتا ہوں — مبادا حشر مجھکو خوابِ راحت سے جگا دیوے
یقیںؔ زنجیر میں ہے تب تو عالم میں نہیں چہلیں — جو ٹک چھوٹے دِوانا تو ابھی دھومیں مچا دیوے

دُکھ تو دیتا ہے کروں تجھکو بھی حیران تو سہی — باغباں اب کے اجاڑے ہوں گلستاں تو سہی
اب تو ناصح کے تئیں سینے دو مرا چاک جیب — تار تار اس ضد سے ڈالوں گریباں تو سہی
لوگ نظروں میں نہیں لاتے ہیں وُ پڑنے کے تئیں — اشکِ خوں سے باغ کر ڈالوں بیاباں تو سہی
اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیںؔ — ان بتاں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اس کا جی چاہے — تو کرنے دو اسے فریاد جتنا اس کا جی چاہے
نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جائیں چھوڑ بت خانہ — کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اس کا جی چاہے
یقیںؔ مجھ بن نہیں ہے قدرداں کوئی مصیبت کا (۲) — فلک مجھ پر کرے بیداد جتنا اس کا جی چاہے

---

(۱) پایہ (ن خ) ۔ (۲) ن خ میں یہ شعر نہیں ۔

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
برا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے
اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں
یہ دل کچھ آب رسیدہ ہی کچھ جلا بھی ہے
یہ آرزو ہے کہ اُس بیوفا سے یہ پوچھو ں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے
یہ کون ڈھب ہی سجن خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھی پاؤں تلے ملا بھی ہے
یقیں کا شورِ جنوں سن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خونِ انصاف سے اتنا بھی زبان تر نہ کرو
لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو
سایہ بے شخص نہیں رہتا ہے کہتا ہی یقیں
آپ سے مجھکو جدا حضرتِ مظہر نہ کرو

اسیرانِ قفس کی ناامیدی پر نظر کیجو
بہار آوے تو اے صیاد ہم کو مت خبر کیجو
کہا جاتا نہیں کچھ مجھ سے تو جو کہہ سکے کہیو
مری اس بے زبانی پر نظر اے نامہ بر کیجو
یقیں سے جلتے بلتے کا سر اتنا بھی نہ ٹھکراؤ
اس آتش سے ارے اوامن و رازو ٹک حذر کیجو

(۲) یکرنگ

مصطفیٰ خاں یکرنگ تخلص بقولے شاگردِ خانِ آرزو و بقولے میاں آبرو از فحوائے کلامش چنیں می تراود کہ شاگرد مرزا مظہر خواہد بود۔ برائے تیمن دو شعر ش قلمی می شود۔ از وست۔

ہرگز تم اب کسی کے سجن آشنا نہیں
سب خوبیاں ہیں تم میں ولے اک وفا نہیں
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ستو
مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

(۳) یکرو

میاں یکرو تخلص دو شعر از ایشاں نیز یاد دارم و آں اینست۔

ایک تھا عاشق کے غمخواروں میں دل — لے گئے بے رحم بیکس کر گئے
جا پڑا ہے شوخ خونخواروں میں دل — اب تو یکرو جیتا رہنے کا نہیں

پوشیدہ مباد کہ اگرچہ تذکرہ تمام شد اما خاتمہ اش مشتمل بر اشعارِ چند زنان است و داخلِ تذکرہ برائے آں نہ شدند کہ از تخلص بعضے از آں آگاہی نہ داشتم"۔

(۱) دولہن بیگم

مثالِ لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں — جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں

تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا — بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا

(۲) جینا بیگم

کہ تا فلک مرے شعلہ نے سر اٹھایا ہے — یہ کس کی آتشِ پنہاں نے جی جلایا ہے

(۳) گنا بیگم

زوجۂ عماد الملک گویند طبعِ موزوں داشت احوالش از کثرتِ اشتہار محتاج بہ بیان نیست۔ میر قمر الدینِ منت کہ پیش ازیں چندے بہ رفاقتِ عماد الملک بہ نسبتِ شعر و شاعری امتیاز داشتند در آں ایام بیگم مذکور کلامِ شکستہ و بستۂ خود ا حکمِ نواب بہ نظرِ ایشاں می گزرانید ازیں جہت ایں غزلِ میر صاحب بنام او شہرت یافتہ بلکہ تخلصِ ایشاں نیز بیش نا آگاہان تخلصِ او گردیدہ مطلعِ غزل ایں است ؎

---

(۱) اول اشعار اینہا نوشتہ می شود بعد ازاں خاتمہ خواہم نوشت (ن نخ)

مدعی اُس سی سخن ساز بہ سالوسی ہے　　پھر تمنا کو یہاں فرو ٔہ مایوسی ہے

از دست

شمع کی طرح کون رو جانے　　جس کے جی کو لگی ہو سو جانے

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی　　اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو[1] کی

حنا خون ہوکے اُن پاؤں کی جب کچھ بات چلتی تھی　　رگڑتی تھی سرِ پا سنگ پر اور ہاتھ ملتی تھی
ترے منہ کی تجلی دیکھ کر کے رات حیرت سے　　زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع جلتی تھی

اُس کا پیغام مجھے کیونکہ زبانی آوے　　نام سنتے ہی مرا جس کو گرانی آوے
دین و دنیا سے سروکار رہے کس کافر کو　　رات دن فکر یہی ہے کہیں جانی آوے

ارے قاصد تو میرا اور کچھ مذکور مت کیجو　　یہی کہیو کہ اپنے دل سے مجھکو دور مت کیجو

سن لیجیو خط سونپ کے پیغام کو قاصد　　لے اوٹھیو نہ پہلے ہی مرے نام کو قاصد

حسن کا جی ہر ادا تجھ میں میاں سو تو نہیں　　گل تصویر میں گو رنگ ہوا بو تو نہیں

(۴) زینت

نازک تخلص زینت نام در فیض آباد از میر مستحسن خلیق معلوم شدہ مشارٌ الیہ می گوید کہ ہرگاہ من ہمراہ لشکر رفتم بسببِ الفتے کہ با من داشت این غزل نوشتہ فرستادہ بود[2]

(۱) ہمکسی. دن خ، (۲) در منع راست برگردن را دی دن خ،

کوچہ میں کوئی رہ سکے کوئی در پہ مرسکے ہے — انصاف بھی کچھ ہے تو یہ کیا ظلم کرے ہے
موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے — وہ وہم و گمان سے بھی حقیقت میں پرے ہے
ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک — پردہ بتِ مغرور کوئی کان دھرے ہے
یاد آتی ہے اُن آنکھوں میں آمدہ نشہ کی — ساقی مئے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے
غش ہیں ابھی مجھے کل دیکھ کے وہ ڈر کے یہ بولا — بس ہوش میں آ کیوں مجھے بدنام کرے ہے
پیغامِ اجل چاہ ہے اُس بت کی و لیکن — کب عاشقِ جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے
جاتے تمھیں ٹک دیکھا تو آنکھیں نہ نکالو — منظور ہیں تو نظر سے خوش گذرے ہے
محفل میں مجھے دیکھ کے کہنے لگا اپنی — جا ہوئے یہ بلا گھر سے مرے کوئی ارے ہے
اُٹھا میں تو بولا کہ میں ہوں غیر کو کہتا — جل جل کے تو کچھ اپنی ہی غیرت میں مرے ہے
نازک سفرِ دور کو گویا وہ سدھارا — گرمِ طلبِ شوق کے نزدیک ورے ہے

(۵) موتی

موتی نامی از اہل طائفِ ارباب نشاط در فنِ خود صاحب مذاق و ذی اعتبار۔ اصلش شاہجہاں آباد است۔ دوازدہ سال گزشتہ کہ مرزا ابراہیم بیگ مقتول را کہ ذکرِ ایشاں در ردیفِ میم گزشت شیفتگی براو شدہ بود تا امروز پایشاں بر جادۂ وفاداری قائم است چند سال گزشتہ کہ از دہلی بہ لکھنؤ رسیدہ گاہ گاہے نفقیر ہم برائے ملاقات مرزائے مذکور کہ بہ خانہ اش میر دم بسیار بہ خوبی پیش می آید۔ از وست۔

گلابی روبرو ہے اور ہم ہیں — بس اب جام و سبو ہے اور ہم ہیں
سیا گر تو نے چاکِ جیب ناصح — تو پھر تارِ رفو ہے اور ہم ہیں
بلا سے گو نہ ہووے دل کو واشد — ہجومِ یاس تو ہے اور ہم ہیں
شبِ مہتاب میں تا صبح ساقی — خیالِ ماہ رو ہے اور ہم ہیں

یہ کیا جی میں لہر آئی کہ موتی　　　کنارِ آب جو ہے اور ہم ہیں

خاتمہ

بر ضمیرِ آئینہ نظیرِ مبصرانِ گوہر معانی مخفی و محتجب نماند کہ مولفِ ایں تذکرہ غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابنِ درویش محمد کہ بہ مصحفی شہرت دارد از سبب[1] حواس و پریشانی خاطر و ناساعدیِ زمانہ کجا فرصتِ آں داشت کہ بہ تصحیحِ احوال و اشعارِ شعرائے سابق و حال پرداختہ نقشہٗ ایں جریدہ را بروئے کار آرد اما اکنوں کہ بہ رہبریِ بختِ سعید در حضورِ پرنور مرشد زادہٗ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر ادام اللہ اقبالہٗ باریافتہ ہمیشہ موردِ گوناگوں مہربانی آں مہر سپہر خلافت و جہانداری می باشد فرصت را غنیمت شمردہ مسودہٗ محسوس تذکرہ را کہ از چند سال بہ طاقِ نسیان افتادہ بود صاف نمودہ و درست ساختہ احوالِ اکثرے درو بہ شرح و بسط مسطور است و احوالِ بعضے از متقدمین کہ کما ینبغی آگاہی بر اوقات آنہا حاصل نشود بطور بیاض سمتِ تحریر یافتہ۔

قطعہ

غرض نقشے است کز ما یاد ماند　　　کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحب دلے روزے بہ رحمت　　　کند در کارِ ایں مسکیں دعائے

امید کہ بہ نظرِ قبول آں والا جناب درآمدہ مقبولِ دلہا گردد۔"

تاریخ

چونکہ از فضلِ خدا ساختہ شد　　　جلد ایں تذکرہ مانندِ بہشت
سالِ او چوں ز خرد پرسیدم　　　یکہزار و دو صد و نہ بنوشت

---

(۱) ن خ ۱۲۰۹ قطعہ تاریخ۔

تاریخ دیگر(۱)

چوں ز انعامِ خدائے کارساز شد مرتب ایں کتاب دلپذیر
بسکہ در معنی نظیر خود نہ داشت گفتہ شد تاریخ جلد بے نظیر
۱۲۰۵ھ

کاتب بندہ مرزا فدا حسین ولد آقا مرزا صاحب ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۱۹ھ ملک لکھنؤ مکان احمد گنج در بن سی ام۔

ایں تصنیف استاد زمانہ بعہد خود خاقانی شیخ غلام ہمدانی مرحوم و مصحفی تخلص دارد کتبہ محمد علی بیگ خاک پائے جلالی بار دویم شہر صفر ۱۲۳۳ھ تمام شد۔

تمت الکتاب بعون الملک الوہاب

---

(۱) تاریخ لمولفہ

جامع برقی پریس جامع مسجد دہلی میں چھپی ۱۹۳۲ء

اُردُو

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کیجاتی ہے۔ اس کے تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اُن پر تبصرے اس رسالہ کی ایک خصوصیت ہے:

یہ رسالہ سہ ماہی ہے اور ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے، رسالہ کا حجم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر اس سے زیادہ۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکہ انگریزی۔ آٹھ روپے سکہ عثمانیہ۔

Anjuman

Tad

A Biog

Ur

Gh

Edited by

MOULVI ABDUL HAQ, B. A. (ALIG.)

1933